الفتح

دورِ حاضرہ کی تاریخی داستان

نسیم حجازی

بار اول

قیمت :- دس روپے

ناشر :- سید اطہر حسین تاجر کتب

۲۰۶۰ ، کوچہ ناہر خاں ، دریا گنج - دہلی [illegible]

مطبوعہ : ہندستان لیتھو پریس - دہلی

مسلمانانِ عالم

کے نام

جن پر قبلۂ اوّل کی بازیابی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے

"عالم عرب کا مستقبل الفتح کے ہاتھ ہے"

ٹیلے کی دوسری سمت ہی نخلستان تھا۔ لیکن احمد کا گھوڑا شدت سے پیاس محسوس کر رہا تھا۔ اس کے بہکے بہکے قدم پیاس اور پریشانی ظاہر کر رہے تھے وہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا، اسے تھپکی دی اور چمکارا، گھوڑے نے اپنا منہ احمد کے کندھے پہ ایسے رکھ دیا جیسے وہ آرام کرنا چاہتا ہو۔ احمد اپنے وفادار ساتھی کی اس حرکت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنے پینے کا پانی خرجین سے اپنی ہتھیلی پہ الٹا اور گھوڑے کے چہرے پہ مل دیا۔ گھوڑا ہنہنایا، احمد اس کی زبان جانتا تھا اس نے گھوڑے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"لو — یہ میرے حصے کا پانی ہے، تم پی لو — تمہیں مجھ سے زیادہ محنت کرنی پڑ رہی ہے — اس نے چمڑے کا بنا ہوا گہرا سا ٹرے اٹھایا اور سارا پانی اس میں انڈیل دیا — گھوڑا تشکر آمیز نگاہوں سے کبھی احمد کی طرف دیکھتا اور کبھی پانی کو دیکھ کر پینے لگتا — جب وہ پانی پی رہا تھا تو احمد نے سورج کی طرف دیکھا۔ اب نصف النہار سے ڈھلنے ہی والا تھا۔ لیکن گرمی

بڑی شدت کی تھی۔ سورج کی طرف دیکھنے سے اس کی آنکھیں چندھیا سی گئیں۔ گھوڑا پھر ہنہنایا۔

احمد نے اسے تھپکی دی اور پھر اس پر سوار ہو لیا۔ وہ ٹیلے کی سمت بڑھنے لگا۔ جوں جوں وہ ٹیلے کی طرف بڑھتا توں توں ٹیلہ دور ہوتا جاتا تھا۔ صحراؤں اور پہاڑوں کا یہ انداز بھی بڑا انوکھا ہے۔ جب ان سے انسان دور ہوتا ہے تو وہ ان کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہے، ان کے قدوقامت کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن جب ان کے قریب پہنچتا ہے تو ان کے ایک مخصوص حصہ کے سوا باقی سب کچھ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ یہ صحرائی ٹیلے تو ویسے بھی جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ احمد نے سوچا۔ "یہ ٹیلہ اتنا دور تو نہ تھا کہیں میں غلط راستہ پہ تو نہیں ہو لیا۔" یہ خیال آتے ہی اس نے گھوڑے کی باگ کھینچ لی جیب سے قطب نما نکالا، تھیلے سے نقشہ نکالا۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی منزل کا جائزہ لیا۔ وہ ٹھیک آ رہا تھا۔ اس نے باگ ڈھیلی چھوڑ دی اور گھٹنوں تک دھنستا ہوا گھوڑا آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

احمد نے اپنے سر کا رومال درست کیا۔ اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس کو دائیں بائیں نظر دوڑا کر دیکھا۔ پھر وہ از خود مسکرا دیا۔ اب سورج ٹیلے کی اوٹ چلا گیا تھا۔ اور ٹیلے کے سایہ میں احمد کافی آرام محسوس کر رہا تھا۔ احمد ایک بار پھر گھوڑے کی پشت سے اتر پڑا۔ باگ تھام کر اس کے آگے آگے چلنے لگا۔ اس نے پلٹ کر اپنے نقش پا کو دیکھا۔ دور تک ہموار بچھی ریت پہ گھوڑے کے سموں کے نشان بڑے دلفریب لگ رہے تھے۔ جو وقت گزر جائے جس مقام سے

آگے نکل جائیں وہ ہمیشہ بھلا ہی لگتا ہے ۔ وہ نئے ارادہ اور نئی ہمت کے ساتھ ٹیلہ کو عبور کرنے کے لئے آگے بڑھنے لگا۔ پندرہ بیس منٹ کی محنت کے بعد ٹیلے کی چوٹی پر چڑھ گیا۔ گھوڑا ایک بار پھر احساس فتحمندی کے تحت زور سے ہنہنایا۔ پھیلے ہوئے صحرا میں اب تک گھوڑا کئی بار ہنہنا چکا تھا۔ لیکن اس کی آواز ہر دفعہ سناٹوں میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ لیکن اب کی بار اس کی آواز کا جواب آیا۔ دور گہرائیوں میں کوئی گھوڑا ہنہنایا تھا۔ اپنے ہم جنس کی آواز سنکر گھوڑے کی آنکھوں میں تو چمک پیدا ہوئی تھی۔ جو ایک قدرتی بات تھی۔ لیکن احمد نے بھی اس آواز سے سرتا پا مسرت محسوس کی ۔ وہ اپنی منزل کو قریب تر محسوس کر رہا تھا۔

گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دے کر وہ ٹیلے کی دوسری سمت چلنے لگا۔ اس ٹیلہ سے آگے بھی دو تین چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے اور ان کے اوپر سے سامنے ہرا بھرا نخلستان نظر آ رہا تھا۔ ایک گھنٹہ کی مسافت کے بعد احمد نخلستان کے قریب پہنچ گیا۔ سورج ڈھل چکا تھا اور اب لحظہ بہ لحظہ اس کی کرنوں کی حدت کم ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور اس میں صحرائی تپش کی بجائے نخلستان کی ٹھنڈک ملی ہوئی تھی۔ احمد نے گہرا سانس لیا اور گھوڑے کی لگام چھوڑ دی۔ گھوڑا از خود پانی تک پہنچ گیا۔ احمد نے اپنے منہ پر پانی کے چند چھینٹے مارے اور پانی کے لمبے چوڑے ذخیرے کے ساتھ ساتھ اس طرف چلنے لگا۔ جدھر کچھ آبادی نظر آ رہی تھی، گھوڑا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ گھاس پھوس کے بنے ہوئے مکانات اور پھٹے پرانے خیمے اسے خالی نظر آ رہے تھے، اسے پانی کی موجودگی کے باوجود کوئی ذی روح نظر

نہ آیا وہ بڑا حیران تھا۔ ابھی ایک گھنٹہ پیشتر اس نے گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی تھی ـــ یقیناً وہ آواز اسی نخلستان سے ہی آسکتی تھی۔ مگر اب تو اسے کہیں بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

اس نے آنکھیں اٹھا کر فضا میں دیکھا اسے کچھ نظر آیا ـــ صحرا کے سفر میں تو قافلے بھی پانی کے کنارے کئی کئی دن پڑے رہتے ہیں لیکن پانی کے اس ذخیرہ کی یوں بے آبادی سوائے یہودیوں کی کارستانی کے اور کیا ہو سکتی تھی ـــ وہ فضا میں کسی پرواز کے بچے کھچے نشانات تلاش کر رہا تھا ـــ لمحہ بعد ہی اس نے پھر گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز سنی۔ اس کا اپنا گھوڑا تو اس کے قریب کھڑا تھا ـــ اس نے کھجوروں کے گھنے جھنڈ کی طرف دیکھا۔ درختوں میں اسے کسی کے موجود ہونے کا شبہ گذرا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا گھنے جھنڈ کی سمت ہو لیا۔ واقعی ذرا آگے ایک سفید گھوڑا ریت پر منہ مار مار کر کچھ کھا رہا تھا ـــ ابھی تک وہ، حیرت زدہ کھڑا تھا کہ دور سے فضا میں ہیلی کوپٹر کی آواز سنائی دی۔ جوں ہی اس نے اوپر دیکھا مشرق کی سمت سے آتے ہوئے دو ہیلی کوپٹر گھاس پھونس کی بنی ہوئی جھونپڑیوں پر تڑا تڑ گولیاں برسانے لگے۔ کوئی خطرہ نہ پاکر وہ نیچی پرواز کرنے لگے اور دستی بموں کے ذریعہ انہوں نے جھونپڑیوں اور خیموں میں آگ لگا دی، احمد جس جھنڈ میں چھپا کھڑا تھا ادھر ہیلی کوپٹروں نے آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، تاہم احمد کا گھوڑا جو بری طرح بدک گیا تھا گولیوں کا نشانہ بن گیا ـــ احمد اسے گرتے دیکھ کر دوڑ کر اس کے پاس جانے کی سوچ رہا تھا کہ درختوں کے سایوں میں سے نکل کر ایک لڑکی نے اس کا بازو تھام لیا اور کہا۔

"نہیں نہیں"

احمد نے ایک لحظہ کے لئے لڑکی کو دیکھا اور اپنے ارادہ سے باز آ گیا۔ لڑکی نے دیسی ساخت کی و مختصر طرز کی بنی ہوئی ایک رائفل احمد کے ہاتھ میں دے دی، اور خود پیچھے ہٹ گئی۔

احمد نے رائفل کو ہاتھ میں تولا اور پھر مڑ کر لڑکی کو دیکھا ___ وہ ایک اور رائفل تھامے درخت کی اوٹ میں کھڑی تھی ___ احمد کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے کہا۔

"ویل کمانڈو ___ جہاز ادھر بھی آ سکتے ہیں ___ اور اگر یہ مغزاق کی طرف اڑے تو یقیناً بچ کر نہیں آئیں گے ___ مگر بہتر ہے کہ ہم ان کو مغزاق کی طرف پرواز ہی نہ کرنے دیں۔"

احمد نے کوئی جواب نہیں دیا ___ اس کی نگاہ اس ہیلی کوپٹر پر لگی ہوئی تھی جو پانی کے ذخیرہ کے عین وسط میں آ کر معلق ہو گیا تھا۔ جس میں پائیلٹ کے علاوہ دو فوجی بھی سوار تھے وہ فوجی ایک بڑے سے ٹین کو اٹھائے ہوئے غالباً پانی میں پھینکنا چاہتے تھے۔ احمد نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ بھی جہاز کو دیکھ رہی ہے یا نہیں۔ لیکن وہ دم بخود رہ گیا جب اس نے دیکھا کہ وہ لڑکی پوری طرح نشانہ باندھ چکی ہے اور اب صرف فائر کرنے والی ہے فوراً ہی گولی چلنے کی آواز آئی اور پائلٹ کی ٹوپی کے ساتھ اس کی کھوپڑی بھی اڑ گئی۔ جہاز ڈوبنے لگا۔ ٹین کو چھوڑ کر ایک فوجی نے جہاز کو سنبھالنے کی کوشش کی، لیکن اب وہ اس طرح چکر کھا رہا تھا کہ ٹین اور دوسرا فوجی جہاز سے پہلے پانی

میں گر گئے، اور پھر جہاز ایک دھماکے کے ساتھ پانی میں گرا اور ڈوب گیا۔

دوسرا جہاز اندھادھند فائرنگ کرتا ہوا اس جھنڈ کی طرف جھپٹا جہاں سے گولی چلائی گئی تھی۔ پتے اور ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرتی رہیں، لیکن خوش قسمتی سے احمد اور لڑکی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔۔۔ پھر جہاز اڑتا ہوا مفرق کی طرف گھوما تو ایک زوردار دھماکہ سے فضا میں ہی پھٹ کر رہ گیا۔۔۔ جہاز کے گرتے ہی یزد نامی ٹیلے کی طرف شور بلند ہوا اور کئی عرب فوجی اور باشندے نخلستان کی طرف دوڑے۔

اس معرکہ میں شام ہو چلی تھی۔ سورج اپنی تمازت کھو چکا تھا اور اب اس کی سرخی مائل کرنوں نے فضا میں حسن سا بکھیر دیا تھا۔ احمد نے اس لڑکی کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"تم سارہ تو نہیں ہو؟"

"میں سارہ ہی ہوں۔۔۔ لیکن یہ میرا خفیہ نام ہے۔۔۔ میرا اصل نام ذکیہ ہے۔۔۔ مگر تم جس سارہ کو تلاش کر رہے ہو اس کا نام تنظیم نے فوزی رکھا ہوا ہے۔ وہ دیکھو، ٹیلے سے ڈھلنے والی جو لڑکی سب سے آگے آ رہی ہے وہ سارہ ہے کہ نہیں۔"

احمد نے دیکھا اور کہا۔

"میں ابھی دوری کی وجہ سے اسے پہچان تو نہیں سکا۔ لیکن قد و قامت اور چال ڈھال بتا رہی ہے کہ وہ سارہ ہی ہے۔"

"آؤ ان کا استقبال کریں۔" لڑکی نے کہا۔ اور احمد اس کے پیچھے پیچھے

چلنے لگا۔ وہ اپنے گھوڑے کی لاش کے قریب پہنچا۔ اس نے بڑی اداس نظروں سے ذکیہ کی طرف دیکھا وہ اس کے ساتھ ہی گھوڑے کے پاس بیٹھ گئی اور گھوڑے کی لگام اور زین اتاری ، اپنی خرجین وغیرہ کو احمد نے ایک درخت کی جڑوں کے قریب رکھ دیا۔ ذکیہ نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

شور قریب آگیا ـــ اور سارہ کی دلفریب صورت نے احمد کو اپنے آپ پر جذب کر لیا ـــ وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ ذکیہ اس کے قریب کھڑی کہہ رہی تھی۔

"تم کیسے مرد ہو ـــ گھوڑے کی جدائی برداشت نہیں کر سکے ـــ جس راہ پہ تم نے قدم رکھے ہوئے ہیں یہ تو اسی قسم کے حادثات اور اس سے زیادہ خوفناک انجاموں سے بھرپور ہے ـــ"

"میں جانتا تھا ـــ لیکن ایک وفادار دوست کے لئے آنکھوں میں چند آنسو آجانے سے مردانگی ختم تو نہیں ہو جاتی ـــ یہ تو انسانی تقاضا ہے ـــ بشر جو ٹھہرے ـــ"

ذکیہ نے فوراً موضوع بدلا۔

'سارہ جان ہتھیلی پہ رکھ کر تم سے ملنے آئی ہے "

"یہ ایک اور راہ ہے ـــ یہ بھی خطرات سے پر ہے ـــ چاہت کوئی بھی ہو محبوب کی ـــ وطن کی ـــ یا آزادی کی ـــ اس کا راستہ دل سے ہو کر گذرتا ہے۔ پتھر کا جگر ہو تبھی اس راستہ پہ پاؤں رکھا جاتا ہے۔

سارہ اب بالکل قریب آچکی تھی۔ اس کی بے حجابانہ چال میں اب فرق آگیا تھا۔ اس نے احمد کو دیکھ لیا تھا اور سرخی کی ایک لہر اس کے رخساروں پہ پھیل

گئی تھی ــــ وہ آہستہ آہستہ احمد کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب پہنچ گئی تو اسے غور سے دیکھنے لگی ــــ احمد نے بھی اپنی آنکھیں، اس کی آنکھوں میں ڈال دیں ــــ پھر اس نے اپنا ہاتھ احمد کے ہاتھ میں دے دیا جسے احمد نے گرمجوشی سے دبایا۔ ذکیہ نے سارہ کا دوسرا ہاتھ تھام کر کہا۔

"آداب کہیں بیٹھو بھی نا"

وہ قریب ہی ریت پر بیٹھ گئے۔ مقامی باشندے اپنے جلے ہوئے مکانات دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پہ کسی غم کے آثار نہیں تھے۔ ان کے اونٹ، گھوڑے اور بکریاں وغیرہ سب محفوظ نزدیکی چراگاہ میں موجود تھے۔ نزدیکی چراگاہ میں بہتے ہوئے دریائے زرقا کا پانی بھی بڑا حیات بخش تھا۔ عرب فوجی انہیں اس متوقع حملے کے متعلق بتا رہے تھے وہ اس بات پر بڑے خوش تھے کہ انہوں نے سب کو بچا لیا ہے، جہازوں کو تباہ کر دیا ہے۔ یہودی اپنی چال میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

اچانک پانی میں زور کا دھماکہ ہوا ــــ اتنے زور کا کہ زمین ہل گئی ــــ پانی اچھل کر درختوں کی چوٹیوں تک پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈوبے ہوئے جہاز کے کئی ٹکڑے باہر کناروں پہ آ رہے۔

ذکیہ اٹھ کر گھنے جھنڈ کے اندر چلی گئی۔ جہاں سے اس نے رائفل کے ساتھ اسرائیلی ہیلی کوپٹر مار گرایا تھا۔

احمد سارہ کا ہاتھ سہلانے لگا۔

"انجن کا دھماکہ ہو سکتا ہے" احمد نے کہا۔

"نہیں ٹائم بم کا ہے"
"ٹائم بم ___ وہ کس لئے ___ یہاں صحرا میں اس کے پھینکنے کی کیا تک ہے؟"
"ہے ___ یہودی ہمارے پانی کے ذخیروں کو زہریلا کر رہے ہیں ___ وہ زہریلی ادویات یا زہریلے جراثیم کے ٹین اٹھائے ہیلی کوپٹروں سے آتے ہیں۔ مقامی آبادی کو گولیوں کا نشانہ بناتے ہیں اور پانی کے ذخیروں میں ٹین کے ساتھ ٹائم بم باندھ کر پھینک جاتے ہیں۔ اب یہ سارا ذخیرہ زہریلا ہو گیا ہے۔ یہ پانی اب کسی کام کا نہیں رہا"
"تو پھر ہمیں ان لوگوں کو بتا دینا چاہیئے"
"ان کو بتا دیا گیا ہے ___ بلکہ سمجھا دیا گیا ہے ___ ہمیں اسرائیلیوں کے اس حملہ کی خبر چودہ گھنٹے قبل ہو گئی تھی۔ ہمیں فوجیوں کی تعداد، جہازوں کی تعداد اور ان کے پروگرام کی تفصیل معلوم تھی ___ تبھی تو ہم مویشیوں اور مقامی باشندوں کی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے ہیں، ان کے بچے اور عورتیں یہاں سے تین کلو میٹر کے فاصلے پر ہیں اور وہاں طیارہ شکن توپیں نصب کر رکھی ہیں، دوسرا ہیلی کوپٹر انہیں سے گرایا گیا ہے"
"تمہاری دوست بڑی تیز ہے"
"کیسے معلوم ہوا"
"آناً فاناً اس نے ہیلی کوپٹر گرا دیا"
"یہ معمولی بات ہے ___ یہ تو بڑی غیر معمولی بات ہے ___ کمال ہے تم نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی"

جو لڑکی ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں تباہ کر دے۔ پوری یہودی پلٹن کا صفایا کر دے۔ اور امریکی کمانڈر کو جل دے کر دشمن کی قید سے بھاگ آئے۔ نہ صرف بھاگ آئے بلکہ ان کے گولہ بارود کو آگ بھی لگا آئے۔ اس کے لئے ہیلی کوپٹر گرانا کوئی بڑی بات نہیں۔ وہ دیکھو آ رہا ہے۔ کیا تم اندازہ کر سکتے ہو کہ وہ کہاں سے آ رہی ہے۔؟

"تم ہی بتاؤ۔"

یہ ہائی کمانڈر کو رپورٹ دے کر اور نئی ہدایات وصول کر کے آ رہی ہے۔ اس نے اس جھنڈ میں زیر زمین وائرلیس اسٹیشن بنا رکھا ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ خفیہ پیغامات کو سمجھنے میں بھی اس کی مہارت مانی ہوئی ہے۔"

احمد حیران ہونے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا۔ تاہم اس نے ذکیہ کو تحسین کی نظروں سے دیکھا۔ اور دیکھتا ہی رہ گیا۔

"مزید حملے کی توقع ہے۔" ذکیہ نے سارہ کو بتایا۔ "لوگوں کو صحرا میں پھیل کر رہنے کی ہدایات دی گئی ہیں۔"

"ہمارے لئے کیا حکم ہے۔؟"

"ہمیں ابھی یہیں قیام کرنا ہو گا۔ احمد۔ کے پہنچنے کی اطلاع دے دی گئی ہے اور تا حکم ثانی وہ بھی یہیں رہیں گے۔"

"پانی کا کیا ہو گا۔؟"

"وادی سے لانا پڑے گا۔ زرقہ کا پانی۔"

"کون لائے گا۔؟"

"میں لاؤں گا۔ بشرطیکہ مجھے وہ سفید گھوڑا مل جائے جو یہاں موجود تھا۔"

"ہاں وہ گھوڑا ابھی ذکیہ کا ہے۔ ابھی سیٹی بجائے گی تو جہاں کہیں بھی ہوگا دوڑا آئے گا۔"

ذکیہ مسکرائی اور اس نے سیٹی بجائی۔ گھوڑا کہیں دور سے ہنہنایا جیسے کہہ رہا ہو کہ میں آ رہا ہوں۔ چند منٹ بعد ہی گھوڑا پہنچ گیا۔ ذکیہ نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔ احمد نے زین کسی اور خرجین لے کر پانی لینے روانہ ہو گیا۔

یہ اگست ۱۹۶۷ء کا ایک دن تھا۔

یہ دن اور سرزمین فلسطین میں ہر مقام پر ایسے بے شمار دن کیوں آئے۔ اس کیوں کے جواب میں صرف احمد، سارہ اور ذکیہ کے نام ہی نہیں آتے بلکہ صدیوں کی تاریخ بھی دہرائی جاتی ہے۔

۱۹۲۰ء میں فلسطین برطانیہ کے زیر تسلط آگیا۔ سیاسی اور انتظامی صورت حال جو پہلے ہی مخدوش تھی اور بگڑ گئی۔ فلسطین کے یہودی روپے پیسے کے زور سے بے شمار زمینیں خرید چکے تھے۔ اور گہری سازشوں کے زور سے ان کا اقتدار اس قدر بڑھ گیا کہ وہ کسی عرب کو ملازم یا مزارعہ نہیں رکھتے تھے۔ فلسطین میں یہودیوں کی آمد اور قیام ایک سوچی سمجھی سکیم تھی۔ اور عرب برابر پھیلتے ہوئے خدشہ کو محسوس کر رہے تھے۔ برطانیہ تو یہودیوں کو ہر قسم کی مراعات دلانے کا پہلے ہی تہیہ کئے بیٹھا تھا۔ لہٰذا احتجاج کے طور پر عربوں نے انتظامیہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ یہود نوازی اور حالات سے حکومت کی چشم پوشی عربوں کے لئے ایک ایسی آگ بن گئی جو اندر ہی اندر سلگتی رہی' اور پھر ۱۹۲۹ء میں اس آگ نے شعلہ جوالا کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجتاً فلسطین میں عموماً اور یروشلم میں خصوصاً خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اس خانہ جنگی کے دوران تقریباً دو صد افراد ہلاک ہوئے۔

اس خانہ جنگی کو دبا دیا گیا۔ زیادہ نقصان عربوں کا ہوا، چاہیئے تو یہ تھا کہ جارحیت کرنے والوں کو تادیب کی جاتی لیکن الٹا عربوں کو دبا دیا گیا۔ کہ وہ کیوں ایسے مطالبات کرتے ہیں جن سے یہودی آبادی کی جبینوں پہ شکنیں ابھر آتی ہیں۔ تعجب کی بات تھی کہ انگریز عیسائی ہونے کے باوجود فلسطینی عیسائیوں کے لئے اتنے پریشان نہ تھے جتنے یہودیوں کے لئے تھے۔ تین برس آرام سے گذرے۔

ار اکتوبر ۱۹۳۲ء میں یہ دبی ہوئی آگ پھر بھڑک اٹھی۔ ۱۳ار اکتوبر کو القدس اور ۲۷ر اکتوبر کو یافا میں عربوں نے یہودیوں اور برطانوی حکمرانوں کے خلاف زبردست مظاہرے کیئے، مظاہروں کو انگریزی فوج اور پولیس نے بے رحمی سے کچل دیا۔ روس اور پولینڈ سے یہودی فلسطین آنے لگے، انہوں نے اپنی شر پسندانہ سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ ۱۹۳۶ء میں اس صورت حال کے خلاف عربوں نے منظم ہڑتال کی۔ جو چھ ماہ تک جاری رہی۔ ملک کے طول وعرض میں تصادم شروع ہو گئے۔ مالٹا اور مصر سے برطانوی افواج پہنچ گئیں۔ حیفہ میں برطانوی بیڑا لنگر انداز ہو گیا۔ لُد، یافا اور دوسرے مقامات پر بڑے معرکے ہوئے۔

یروشلم کے محلہ ہیرو گیٹ کے وسط میں ایک کشادہ گلی کے اندر حسن آفندی کا مکان تھا۔ حسن آفندی قالینوں کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ اور اکثر وہ اپنے ساتھ اپنی دوکان پر ننھے احمد کو بھی لے جایا کرتا تھا اس کی دوکان شہر کے دوسرے حصہ میں دیوار گریہ کے قریب تھی۔ باپ کی غیر حاضری

میں احمد گاہکوں سے میٹھی میٹھی باتیں کرتا رہتا۔ خوبصورت سے بچے کو دیکھ کر دوکان پہ آنے والے خواہ مخواہ اسے چمکارتے رہتے۔ جمعہ کے روز اگرچہ دوکان بند ہوتی لیکن احمد بن حسن نماز جمعہ کے لئے بھی اپنے باپ کے ساتھ جانے پر اصرار کرتا۔ اس کی ماں اسے محبت اور پیار سے جمعہ کے لئے نہلاتی۔ اس کی بہنیں اس کی پوشاک تیار کرتیں اور وہ حسن کی انگلی تھامے توتلی زبان میں باتیں کرتا مسجد اقصیٰ کی طرف چل دیتا۔

اگست کا تیسرا جمعہ تھا۔ احمد اور حسن نماز سے فارغ ہو کر بیت المقدس میں گھومتے رہے۔ جب وہ واپس اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئے تو مسلم محلہ کے ایک تاجر نے حسن کو راستہ میں روک کر کہا۔

"حسن ۔۔۔ گھر کی طرف مت جاؤ ۔۔۔ محلوں کو لوٹ لیا گیا ہے اور بچوں، عورتوں اور بوڑھوں تک کو یہودیوں نے تہ تیغ کر دیا ہے ۔۔۔ چھوٹے چھوٹے دستی بموں سے مکانوں کو اڑا دیا ہے ۔۔۔۔" تاجر کافی گھبرایا ہوا تھا۔

"کس نے حملہ کیا ہے؟"

"روسی یہودی ولاڈی نے۔"

حسن اچھی طرح جانتا تھا کہ روسی یہودی ولاڈی میر بوتنسکی نے "یہودی لشکر" کے نام سے ایک خفیہ تنظیم بنا رکھی ہے، جو دہشت پسندانہ نوعیت کی ہے اور عربوں کے لئے ایک مصیبت بنی ہوئی ہے۔ اور پوری سوچی سمجھی سکیم کے تحت وہ اپنا کام کرتی ہے ۔۔۔ حسن نے کہا۔

"مجھ — میری بیوی اور دو جوان بچیاں گھر میں ہیں، مجھے ان کی خیریت ضرور دریافت کرنی چاہیئے — تم احمد کو اپنے پاس رکھو — میں ان کا پتہ کرتا ہوں —"

ننھے احمد کو تاجر کریم نے اپنی گود میں اٹھانا چاہا تو احمد نے کہا — "میں انگلی پکڑ کر چلوں گا —"

چلتے چلتے کریم نے حسن کو کہا — "میں بہج داؤد والے مکان میں ملوں گا۔"

شام تک حسن لوٹ کر نہ آیا۔ شہر میں پولیس اور فوج گشت کر رہی تھی احمد اپنے باپ سے ملنے کو مچل رہا تھا۔ کریم سے اس کی بے چینی دیکھی نہیں جاتی تھی، اس نے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا — "دیکھو ننھے — میں تمہارے ابا، امی اور بہنوں کو لے کر آتا ہوں، اتنی دیر تم اپنی چچی کے پاس رہو —"

احمد بہل گیا۔ کریم کی بیوی اسے چمکارتی رہی، پیار کرتی رہی، اور خود بچی بن کر اسے توتلی زبان میں لوریاں سناتی رہی۔ ان لوریوں کے میٹھے ہلکوروں سے احمد سو گیا۔

جب اندھیرا چھا گیا تو کریم گھر آیا۔ اس کے ساتھ ایک برقعہ پوش نوجوان لڑکی تھی۔ کریم کی بیوی نے لالٹین کی روشنی قریب لے جاتے ہوئے اس کا چہرہ دیکھا۔ مصری خدوخال کے حسین چہرہ پہ رنج و غم کی تاریکی چھائی ہوئی تھی — آنکھیں سرخ تھیں، اور آنسو اب بھی اس کے رخساروں سے کھیل رہے تھے کریم کی بیوی کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ حسن کی بیوی اور ایک لڑکی کو یہودیوں نے انتہائی بے حیائی اور بے دردی سے شہید کر دیا ہے۔ اور حسن کو گھر تک

پہنچنے سے پہلے ہی کرفیو کی خلاف ورزی کے جرم میں انگریزی فوج نے گولی مار دی ہے۔ کریم خود فوجی کنیٹن کے ٹھیکیدار کی مدد سے جیپ پر ہیروگیٹ پہنچا۔ اور طلحہ کو یہاں لے آیا۔

کریم کے گھر میں طلحہ اور احمد کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ حسن کا کاروبار کریم نے خود سنبھال لیا۔ ایک ایک پائی کا حساب وہ طلحہ کو دیتا۔ وہ اکثر کہتی ـــ

"چچا جان ـ آپ مجھے یوں حساب کیوں بتاتے ہیں ـــ مجھے ضرورت کی ہر شے مل رہی ہے ـــ آپ کے پیار نے میرے سارے دکھ بھلا دیئے ہیں"

کریم اس کے سر پر تھپکی دیتا اور کہتا ـــ

"نہیں بیٹی ـــ اس سے روح کو تسکین ہوتی ہے ـــ ضمیر پہ بوجھ نہیں ہوتا ـ اور پھر تمہیں اپنی تعلیم بھی تو مکمل کرنی ہے ـــ تم کب تک قاہرہ جانا چاہتی ہو ـــ"

"قاہرہ تو مجھے اب سے تین ماہ قبل ہونا چاہیئے تھا لیکن اب جنوری کے شروع میں ہی جانا مناسب ہوگا۔ تب تک میں احمد کے متعلق کچھ سوچ سکوں گی"

"احمد کے متعلق تم خواہ مخواہ پریشان رہتی ہو ـــ وہ اب کافی سمجھدار ہو گیا ہے ـــ وہ یہیں رہے گا، میرے پاس ـــ"

"آپ کی مہربانی ہے چچا جان ـــ لیکن میں خود اس کے بغیر نہیں رہ سکتی ـ یہ میرے پاس ماں باپ کی امانت ہے ـــ میں اسے ایک عظیم عرب بنانا چاہتی ہوں۔

جو یہودیت کا دشمن ہو ـــ جو صیہونیت کے لئے زہرِ قاتل ہو ـــ میں اپنی ساری زندگی اس انتقام کے لئے وقف کر دوں گی جو یہودیوں سے واجب الطلب ہے ـــ"

"تمہاری سوچ بڑی اونچی ہے بیٹی ـــ میں تمہارے ارادوں میں رکاوٹ نہیں ڈالوں گا ـــ تمہیں روپے پیسے کی بھی کمی نہیں ہوگی ـــ لیکن ایک بات یاد رکھو ـــ ہم اسی بات کو بھول رہے ہیں اور ہمیں اسی بھول کی سزا مل رہی ہے ـــ میری بوڑھی آنکھیں مستقبل میں جھانک رہی ہیں اور میں اس روزِ بد کی آمد سے متفکر ہوں جو ہماری بھول کے طفیل آ کر ہی رہے گا ـــ"

"وہ کیا ہے چچا جان ـــ آپ کی با[illegible]ے لئے بڑی حوصلہ افزا رہی ہیں۔ بلکہ میں تو آپ کے پاس رہ کر کئی فیصلے کرنے میں کامیاب ہوئی ہوں ـــ"

"سنو بیٹی ـــ وہ تمام بیمار اور کمزور اقدار جو کسی معاشرہ میں پرورش پاتی ہیں ان کی غذا جاگیرداری نظام، سرمایہ داری اور استعماریت مہیا کرتی ہے ـــ وہ قدریں جنہوں نے عرب عوام کو ایک سست و کاہل، پست ہمت، معطل اور تقدیر کے سامنے سر جھکا دینے والا بنا دیا ہے ـــ ان کی جڑیں بھی انہی عوارض میں گڑی ہیں۔

ہمارے انتہا پسند اور پرجوش نوجوان "بسم اللہ" کی بجائے عرب قومیت اور عربی عزت و وقار کے نام سے "باسم القومیت العربیہ" اور "باسم الکرامۃ العربیہ" شروع کرنے لگے ہیں۔ ایسے بھی ہیں جن کو اسلام دشمنی، اسلام سے بغاوت اور اسلام سے استغناء و بے نیازی سے کوئی باک نہیں ـــ ہمارے

ادیب، شاعر اور مفکر ایرانی شعراء کی طرح نئے "عرب انسان" کو ایک ایسے سرکش وجود کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جو تمام آسمانی مذاہب، بنیادی عقائد اور تمام اخلاقی و روحانی قدروں کا منکر ہے۔ یہ نیا عرب انسان اشتراکیت کی پیداوار ہے۔ نئی قدریں جو نیا انسان پیدا کریں گی وہ خود اس ستم رسیدہ اور باغی انسان کے اندر ابھری ہیں، ایک بھوکے، ایک نئے انقلابی اور اشتراکی انسان کے وجود سے پیدا ہوتی ہیں، نیا انسان، صرف انسان پر عقیدہ رکھتا ہے ___ اور اس انسان کے عقیدہ کی رو سے اللہ، مذاہب، معاشرہ کی ساری اقدار جو قدیم تہذیب و تمدن پر حکمرانی کرتی تھیں اب صرف ممی کی ہوئی لاشیں ہیں۔

اس قومیت کا نشہ تمام عربوں میں اپنے تناسب اور فرق مراتب کے ساتھ عام ہے ___ ہم مسلمان پہلے ہیں اور عرب بعد میں ___ خارجی عوامل پر بھروسہ کرنے سے پہلے ہمیں اپنے ایمان و ایقان کا جائزہ لینا چاہیئے۔ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنا چاہیئے۔ اسلام کی نعمتوں سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور ایمان کی دولت سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں، یہ قرآن کا فیصلہ ہے ___ اللہ کا فیصلہ ہے اور ہمارے رسولؐ نے ان فیصلوں کو بار بار دہرایا ہے ___ ہمیں اللہ کا نام لے کر، رسول کی اعانت طلب کر کے اور اسلام کا دامن تھام کر شیطانیت کے مقابلے کے لئے نکلنا چاہیئے۔"

طلحہ سر نیچے کئے کریم کی باتیں سنتی رہی ___ جب کریم اپنی بات ختم کر چکا تو طلحہ گہری سوچ میں پڑ گئی ___ وہ خود عرب نیشنلزم کی بڑی قائل تھی، کالج میں

اس موضوع پر وہ اکثر تقریریں کر چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ عرب لڑکیوں میں بڑی مقبول تھی، یہودی لڑکیاں بھی کبھی کبھی اس سے بحث میں الجھ پڑتی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ ساری دنیا ہمارا وطن ہے ـــــ اس پر طلحہ مسلمان بن جاتی اور کہتی ہمارا بھی ایمان یہی ہے ـــ یہودی لڑکیاں کہتیں اگر تم مسلمان ہو تو پھر عرب نیشنلزم کا نعرہ کیوں لگاتی ہو، عرب عربوں کے لئے کیوں کہتی ہو ـــ اور اگر عرب عربوں کے لئے کہتی ہو تو جب ہم اپنے وطن کے قیام کے لئے جد و جہد کرتے ہیں تو پھر تم دہشت پسندانہ تنظیموں سے ہمارے سکون کو لوٹنا شروع کر دیتے ہو ـــ

یہ ایک اختلافی مسئلہ تھا ـــ کون دہشت پسندانہ تنظیمیں بناتا تھا اور ان سے کن مقاصد کا حصول مدعا تھا ـــ برطانوی حکومت کس طریق سے اپنا اقتدار قائم رکھنا چاہتی تھی اور اس کا آلہ کار کون تھا؟ عرب یا یہودی ـــ فلسطین میں ہی یہودی اپنا وطن مانگتے تھے۔ حالانکہ ان کی تعداد دوسرے ممالک میں فلسطینی یہودیوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ ایک محتاط اندازہ کے مطابق سارے فلسطین میں یہودی کل آبادی کا آٹھ فی صد تھے۔ باقی مسلمان اور عیسائی تھے۔

طلحہ نے اپنے قریب احمد کی آواز سنی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اکیلی سوچوں میں گم بیٹھی تھی۔ کریم جا چکا تھا۔ طلحہ نے احمد کو اپنے قریب بلایا ـــ اور پوچھا ـــ

"احمد کیا تم میرے ساتھ قاہرہ چلو گے؟"

"قاہرہ کہاں ہے؟"

"مصر میں ہے ـــ بہت دور"

"وہاں ہم کیا کریں گے باجی ؟"

"ہم پڑھیں گے "

"ہم یہاں نہیں پڑھ سکتے ۔ یہاں بھی تو سکول ہیں "

"تمہارے لئے تو ہیں ۔ لیکن میرے لئے اب یہاں کوئی سکول نہیں "

"وہ کیوں ؟"

"دیکھو ۔ میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں ۔ اب میں اسکول میں نہیں ، اور نہ ہی کالج میں ، بلکہ یونیورسٹی میں پڑھوں گی "

"وہاں کھیلنے کا باغ ہو گا "

"ہاں ۔ ہاں ۔ وہاں سب کچھ ہو گا "

"تو کب چلیں گے ؟"

"تھوڑے دنوں بعد "

اسی شام طلحہ نے احمد کو اپنے پاس بٹھایا اور قاعدہ کھول کر اس کے سامنے رکھا اور "بسم اللہ" سے پڑھانا شروع کیا ۔ اس نے اچھی طرح یاد رکھا کہ اس نے اللہ کے نام سے بھائی کی تدریس کا آغاز کیا ہے ۔ عرب قومیت کے نام سے نہیں ۔ یقیناً اللہ ہی بڑا رحیم اور مہربان ہے ۔ اسی نے اسے یہودی حملہ میں محفوظ رکھا ۔ اسی نے احمد کو صبر و قرار بخشا ۔ اور اسی نے ان کی روزی کا مناسب انتظام کر دیا ۔

جب تک جنوری آئے احمد کا قاعدہ ختم ہو چکا تھا ۔ گنتی وغیرہ سیکھ چکا تھا اکثر اوقات وہ اپنی بہن سے قاہرہ کے متعلق پوچھتا رہتا اور اس کی بہن اب تک

کئی بار اسے ابوالہول، اہرام مصر، اور فراعنہ مصر کی ممیوں کی تصاویر دکھا چکی تھی۔ وہ اب جامع ازہر اور دریائے نیل کے ناموں سے واقف ہو چکا تھا اس کے اندر ان سنی سنائی چیزوں اور دیکھی ہوئی تصاویر کو حقیقی روپ میں دیکھنے کی خواہش شدید ہو چکی تھی۔

جس دن طلحہ نے سفر کی تیاری شروع کی اس دن احمد بے حد خوش تھا نئی سرزمین کا دھندلا سا تصور لئے وہ بس میں اپنی بہن کے ساتھ بیٹھ گیا۔

بس کا یہ ننھا مسافر ایک نئے ملک میں نہیں بلکہ ایک نئے مستقبل کی طرف سفر کر رہا تھا۔ اس کے [illegible] چہرہ پر بڑی رونق تھی اور وہی پراسرار مسکراہٹ تھی جو اکتیس برس بعد اب بھی اتنی ہی پیاری تھی۔

طلحہ اپنے وطن کو چھوڑتے ہوئے اپنے آپ سے یہ سوال کر رہی جو اس کی اپنی ذات سے متعلق نہیں تھے بلکہ جن کا تعلق اس سرزمین سے تھا جس میں وہ جوان ہوئی تھی، ان لوگوں کے متعلق تھا جن کو بیم و رجا کی کیفیت میں چھوڑ کر وہ جا رہی تھی۔

وہ سوچ رہی تھی۔

"ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے؟ ہم ان بے پناہ مشکلات و مصائب سے کیوں کر نجات پا سکتے ہیں؟ ہم نے اپنے اتحادیوں یعنی برطانیہ سے کیا سلوک روا رکھا ہے جس کی یہ سزا ہے؟ وہ ہم پر روز افزوں ظلم و جبر کر رہے ہیں، وہ ہماری مشکلات بڑھاتے جا رہے ہیں، وہ ہمارے ملک میں فسادات کی آگ بھڑکا رہے ہیں، وہ ایسی حکمت عملی پر کیوں کاربند ہیں جو ہماری آئندہ

نسلوں اور خود ہمارے لئے ایک خوفناک خطرے کا باعث ہے ــــ حکومت نے بزورِ شمشیر ہم پر ایسی پالیسیاں نافذ کی ہیں جس کا لازمی نتیجہ اہل برطانیہ اور عربوں اور یہودیوں ــ سبھی کے لئے ایک مصیبت کا باعث ہوگا، جانے یہ ابتلا کا دور کب تک قائم رہتا ہے ؟"

طلحہ کی یہ سوچ عرب قوم کی سوچ تھی۔

اس نے جس ابتلا کے دور کے متعلق سوچا وہ ابھی تک قائم تھا ــــ اس کے وطن کے ٹکڑے کر دیئے گئے تھے ــ عرب ممالک کے سینہ پر اسرائیل کا ناسور قائم کر دیا گیا تھا جو اپنی جڑیں عرب ممالک کے جسم پر پھیلاتا جا رہا تھا ــ ۱۹۵۶ء اور ۱۹۶۷ء میں اس نے ایسے گہرے چرکے لگائے تھے کہ عرب دنیا تلملا کے رہ گئی تھی، بڑی بڑی طاقتوں کے پھیلائے ہوئے جال اپنی گرفت مضبوط تر کرتے جا رہے تھے۔

جب طلحہ کا بھائی مفراق کے قریب بہنے والے اردن کے معاون زرقہ سے پانی لے کر نخلستان کی طرف آرہا تھا۔ اس وقت طلحہ عمان کے مشرقی حصہ میں ایک سہ منزلہ مکان کی بالائی منزل پہ اپنے سکریٹری سے "الفتح" کی کارروائیوں کی رپورٹ سن رہی تھی، اسے یہ اطلاع مل چکی تھی کہ اس کا بھائی اپنے خفیہ مشن پہ نخلستان ارم پہنچ چکا ہے ــــ اسرائیلی ہیلی کو پٹر گرا لئے گئے ہیں اور اپنی کلاس فیلو سارہ سے مل چکا ہے ــــ اس نے اپنے سکریٹری سے کہا۔

"دیکھو، اس وقت شام کے سات بجے ہیں، ٹھیک بارہ بجے نمبر دو۔ پانچ ــــ سات ــــ الف سے رابطہ قائم کر کے میری بات احمد سے کرانا۔

تب تک ہائی کمانڈ سے مزید ہدایات موصول ہو جائیں گی۔"

طلحہ نے اپنی عینک اتاری اور نچلی منزل میں چلی گئی، جہاں اس کے دونوں لڑکے سو رہے تھے ۔ اس نے دونوں کو [illegible] ۔ وہ دونوں ہی جوانی کی حدوں کو چھو رہے تھے ۔ وہ زیرِ لب بڑبڑائی ۔ "میں تمہارے بہتر مستقبل کے لئے کوشاں ہوں ۔ میرے بچو!"

اور اس مقام پر تاریخ ختم نہیں ہو گئی ۔ ایک موڑ آ گیا تھا اور طلحہ کو وہ بات یاد تھی، جو اس نے سالہا سال پیشتر کریم سے کی تھی ۔ وہ احمد کو صیہونیت کا دشمن بنا چکی تھی ۔ اور اب اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے یاد تھا کہ وہ انہیں سامراجی یا اشتراکی انسان نہیں بننے دے گی۔

اسے اپنا ماضی بھولا نہیں تھا۔

طلحہ مصر میں تھی اور اس کا وطن خانہ جنگی کا شکار تھا۔ برطانیہ اور یہودیوں کی باہم سازش کے خلاف عرب ہائی کمیٹی نے منظم طور پر جدوجہد کا آغاز کر دیا تھا۔ اس موقعہ پر یہودیوں کے ناپاک عزائم پر سے پردے اٹھنے شروع ہوئے۔ دنیا کو معلوم ہوا کہ انہوں نے خفیہ طور پر پوری فوجی تیاریاں کر رکھی تھیں اور ان کی خفیہ جماعتیں "یہودی لشکر" "ہگانہ" اور "سٹرن گینگ" اسلحہ سے پوری طرح لیس تھیں۔ ایک ہی دن میں یہودیوں نے اپنی آبادی کے گرد خاردار تار بچھا لئے۔ ریت کی بوریوں کے قلعے بنا دیئے۔ اونچی جگہوں پر سرخ روشنیاں نصب کر دیں، تاہم عربوں نے جس جہاد پر کمر باندھی تھی، وہ اکتوبر تک جاری رہا۔

عربوں نے جو حملے اپنے بچاؤ کی خاطر کئے، ان میں عورتیں بھی پیش پیش تھیں، بالخصوص صالحہ ناصر کا نام بار بار سننے میں آیا ہے۔ اس نے دستوں کی قیادت کی ۔ حریت پسندوں کو اسلحہ مہیا کیا۔ ہسپتالوں میں زخمی مجاہدین کی مرہم پٹی کی۔ طلحہ اس عرب خاتون کے کردار سے بے حد متاثر ہوئی، وہ اکثر سوچتی ــ اگر اس نے

معاشرتی بہبود کی ڈگری حاصل کر بھی لی تو کیا ہوگا، اسے اپنے عوام کے جس معاشرہ کو بہتر بنانے کے لئے اپنی صلاحیتیں وقف کرنی ہیں۔ اس معاشرہ کو تو پہلے ہی الجھنیں درپیش ہیں، اس لئے وطن کو اس کی اب ضرورت ہے، یہ کوئی بات نہ ہوئی کہ فلسطین کے آب و گل سے چل کر وہ دوسرے ممالک میں اپنی اکتسابی صلاحیتوں کو بیچتی پھرے۔ ایسی سوچ کے آتے ہی وہ اپنے ملک کے معاملات سے زیادہ آگاہ رہنے لگی، وہ انقلابی نوعیت کی کتابیں پڑھتی اور احمد کو ایسی تاریخی کہانیاں سنائی جن میں حریت، وطن پرستی، علم دوستی اور مذہبی وابستگی ہوتی۔ اب احمد بھی اخبارات کے صفحات کی ملی سرخیاں پڑھنے لگا تھا۔ وہ اکثر پوچھتا۔

"سازش کیا ہوتی ہے باجی ــــ مجاہد کون ہوتا ہے ــــ کانفرنس کسے کہتے ہیں ــ؟"

طلحہ آسان پیرائے میں احمد کو سمجھاتی اور اس کے ذہنی افق میں وسعت سمٹتی آتی۔

احمد تیسرے یا چوتھے درجہ میں پڑھتا تھا۔ جب لارڈ پیل کی زیر قیادت قائم شدہ شاہی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی۔ کمیشن نے برطانیہ کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہوئے فلسطین کی تقسیم کو ضروری قرار دیا۔ تقسیم کے برطانوی منصوبے کے تحت حیفہ اور جافہ کے درمیان ایک آزاد یہودی ریاست قائم کرنے کی تجویز پیش کی، جافہ اور یروشلم کے درمیان ایک حصہ برطانیہ کے زیر تسلط رہنا تھا۔ اور باقی عربوں کو ملنا تھا جسے ٹرانس جارڈن کا نام دیا گیا تھا۔

انہی دنوں صالحہ ناصر کو گرفتار کر لیا گیا۔ انگریزوں نے اس پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ لیکن وہ لارڈ پیل کے کمیشن کی رپورٹ کے خلاف کہتی رہی۔ طلحہ نے مصر کے اخبار "الاہرام" میں تمام عالم عرب کو جھنجھوڑنے کے لئے فلسطین کی حمایت میں کئی مضامین لکھے۔

۷ رجولائی ۱۹۳۷ء کو شام میں ایک کل عرب کانفرنس ہوئی جس میں سوا سو سے زاید نمائندوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس نے برطانوی منصوبہ مسترد کر دیا۔ اس کے بعد عربوں کا ردعمل شدت اختیار کر گیا۔ برطانیہ جو اب تک اپنے آپ کو عربوں کا ہمدرد ظاہر کرتا تھا اس کی قلعی بھی کھل گئی، یکم اکتوبر کو عرب ہائی کمیٹی کے تقریباً تمام ارکان گرفتار کر کے ملک بدر کر دیئے گئے، تاہم مفتیٔ اعظم فلسطین سید امین الحسینی بچ نکلے اور شام پہنچ کر تحریک آزادی کی قیادت کرنے لگے۔

تحریک آزادی کے قائد مفتی اعظم فلسطین امین الحسینی کے ایما پر عربوں نے برطانیہ اور یہودیوں کے خلاف گوریلا جنگ شروع کر دی، اسی جنگ کے حربیں اعلان بالفور میں گڑی تھیں، بین الاقوامی سیاست میں اپنے سامراجی منصوبوں کے لئے یہودیوں کی اعانت حاصل کرنے کی جو چال انگریزوں نے چلی تھی وہ اب کاغذی تیاریوں سے عملی صورت اختیار کرنے لگی تھی، ۱۹۱۷ء میں بوئے ہوئے بیج کے شگوفے اب پھوٹنے لگے تھے۔ اور عربوں کے لئے کوئی چارۂ کار نہ تھا، ماسوا اس کے کہ وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جائیں۔

تحریک آزادی کی کارگذاریاں طلحہ کے لئے سرمایۂ افتخار تھیں۔ وہ انہیں پڑھتی اور عملی طور ... سنے کے لئے بے چین رہتی۔ عبدالقادر الحسینی فوجی نوعیت کی

کارروائیوں کے کمانڈر تھے۔ وسطی محاذ کی کمان حسن سلامہ کے ہاتھ میں تھی۔ حریت پسندوں نے ریلوے سٹیشنوں، ریلوے لائنوں، فوجی بارکوں اور سرکاری عمارتوں پر بم پھینکے۔ سرنگیں بچھائیں اور کافی کامیابی حاصل کیں۔ نتیجے کے طور پر یہودیوں کے ساتھ برطانیہ بھی بوکھلا اٹھا۔ ایک یہودی نے حقیقت پسندانہ انداز میں کہا۔

"اگر برطانیہ اور امریکہ نے ہمیں فلسطین تقسیم کر کے دے بھی دیا تب بھی ہم عربوں کے ساتھ اچھے ہمسایوں کی صورت میں نہیں رہ سکیں گے۔"

دوسری عالمگیر جنگ کے ابتدائی دور میں حسن سلامہ اور تحریک آزادی فلسطین کے دوسرے زعما جرمنی چلے گئے۔ جہاں مفتی اعظم پہلے ہی پہنچ چکے تھے نازی لیڈروں سے لمبی چوڑی گفت و شنید کے بعد ایک معاہدہ ہوا جس میں فلسطینی نوجوانوں کو کمانڈوز (فدائیوں) کی تربیت دینا طے پایا۔ چنانچہ فلسطینی نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے جرمنی جا کر پیراشوٹ سے اترنے ہلکے اور بھاری ہتھیار استعمال کرنے افواج پر چھاپے مارنے اور دہشت پسند یہودی تحریکوں سے نپٹنے کی تربیت حاصل کی۔

فلسطین سے ایک وفد مصر آیا۔ یہ وفد مفتی اعظم کی تحریک آزادی سے متعلق تھا، اس وفد کا قائد ایک فدائی نوجوان تھا۔ دوسری جنگ عالمگیر پھیل چکی تھی انگریز نازیوں کی کامیابی سے گھبرائے ہوئے تھے۔ جو ملک آزادی مانگ رہے تھے ان سے انگریز بڑے خائف تھے۔ تاہم وہ جھوٹے سچے وعدوں سے ہر ایک کو بہلائے جا رہے تھے۔ اس وفد کے قائد نے جامع ازہر میں ایک اجتماع

سے خطاب کیا۔ فلسطین کے ماضی، حال اور مستقبل پر روشنی ڈالی ۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ بے حد گھناؤنا تھا مگر وہ سب کچھ سچ تھا۔ فلسطین کا ماضی اچھا تھا، لیکن حال اور مستقبل دونوں پر ادبار چھایا ہوا تھا۔ ایک ہی راہ تھی جو دار سے ہو کر گذرتی تھی۔

طلحہ وفد کے نوجوان قائد سے بڑی متاثر ہوئی، اس کا تبحر علم ایک ایک لفظ سے عیاں تھا۔ اس کے طرز تکلم میں اعجاز تھا ۔ الفاظ کے اتار چڑھاؤ میں اس کی اپنی شخصیت کے کئی پرتو تھے ۔ جامعہ کی مجلس المتعلمین نے وفد کے اعزاز میں ایک مختصر سی دعوت دی ۔ اس دعوت میں طلحہ کو وفد کے قائد سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ اس نے قائد سے پوچھا۔

"معاف کیجئے گا ۔ آپ نے یہودی قوم کو ایک الگ چیز اور صیہونی تحریک کو ایک دوسری چیز قرار دیا ہے ۔ میں اس بات کو نہیں سمجھ سکی۔"

"بالکل ایسے ہی خاتون ۔ جیسے جرمن قوم ایک وجود کا نام ہے اور نازی تحریک ایک دوسرے وجود کا ۔"

لیکن یہ تحریکیں خواہ نازی ہوں یا صیہونی، اپنی قوموں یا فرقوں کے علاوہ کہیں اور پرورش نہیں پا سکتیں۔ جیسے صیہونی تحریک یہودیوں میں یا نازی تحریک جرمن سے ہی اپیل کر سکتی ہے۔"

"اس کے ساتھ ہمیں یہ فرق بھی ماننا پڑے گا کہ ہر یہودی صیہونی تحریک کا ممبر یا حامی نہیں ۔ یہودی ایک مسلک اور گروہ کو ماننے والے طبقہ کا نام ہے، جبکہ صیہونی ایک ایسی جماعت اور تحریک ہے جو اس گروہ کو ہر قیمت پر

برسرِ اقتدار لانا چاہتا ہے۔"

تحریکیں اور قومیں لازم و ملزوم ہیں۔ یہی حال یہودیوں کی اس بین الاقوامی تنظیم کا ہے۔ وہ کافی دیر تک ایسی باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے دونوں ایک دوسرے کو کبھی کبھی بڑی گہری اور تجسس آمیز نگاہوں سے دیکھتے۔ طلحہ کی نظروں کا انداز دیکھ دیکھ کر دقدکا قائد کبھی کبھی اپنے موضوع سے ہٹ جاتا۔ اور اسے اپنی بات جاری رکھنے کے لیئے پوچھنا پڑتا — "میں کیا کہہ رہا تھا۔"

"آپ جامعہ میں پڑھتی ہیں ؟"

"پڑھ چکی — میں پڑھنے کی خاطر ہی یروشلم سے آئی تھی۔ لیکن یہاں آکر میرے خیالات کچھ منتشر ہو گئے۔"

"آپ یروشلم کی رہنے والی ہیں ؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"کس علاقہ کی ؟"

"ہیرڈگیٹ کی۔"

"خوب۔"

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں ؟"
میں بھی یروشلم میں ہی رہتا تھا۔"

"کہاں ؟"

"برج داؤد کے قریب۔"

"وہاں تو شیخ کریم الجواد کا مکان بھی ہے۔"

"ہاں — ہاں — وہ تو میرے چچا ہیں — انہی کی نظروں کا فیضان ہے کہ مفتیٔ اعظم نے مجھے اپنی قربت کا اعزاز بخشا ہے۔"

"تعجب ہے — مجھے بھی شیخ کریم کی نظروں کا فیض حاصل رہا ہے۔"

قائد حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے بہت سے ذاتی قسم کے سوالات ایک ہی دفعہ کر ڈالے۔ اس کا حسب نسب پوچھا، تعلیم پوچھی — مصروفیات کے بارے میں پوچھا اور جب رسمی تقاریب کے بعد دعوت اختتام پذیر ہوئی، تو قائد نے طلحہ سے کہا۔

"میں ابھی کئی دن قاہرہ میں ہی ہوں — میں آپ سے ملوں گا — مجھے اپنا اتا پتا بتلا دیں — آپ جیسی خواتین تو آزادیٔ فلسطین کے لئے بہت کچھ کر سکتی ہیں — مفتیٔ اعظم آپ کے ذمہ کوئی نہ کوئی کام سونپ کر بڑے خوش ہوں گے۔"

"مجھے بھی بے انتہا خوشی ہو گی کہ میرا وقت بے مقصد نہیں گذر رہا۔"

طلحہ نے اپنا پتہ قائد وفد مجتبٰے حامد کو دیا۔

بے شک وہ ایک سوجھ بوجھ رکھنے والی نیک دل اور نیک سیرت خاتون تھی، اس نے اپنی زندگی کے متعلق اگر کبھی سوچا تھا تو یہی کہ وہ کس طرح اپنے شہیدوں کا انتقام لے سکتی ہے — کیسے وہ اپنے بھائی کو وطن پرست بنا سکتی ہے اور خود وہ اپنا وقت کیسے کسی تعمیری طریق سے گذار سکتی ہے — آج اس کی سوچوں کا انداز مختلف تھا۔

طلحہ ایک انسان بھی تھی اور عورت بھی —

اس نے ان چار سالوں پہ نظر ڈالی جو اس نے مصر کی سرزمین پہ گذارے تھے اس نے اکثر اندھیری راتوں کو ایک نامعلوم خوف محسوس کیا تھا اور راحیل کو اپنے سینہ سے بھینچ بھینچ لیا تھا۔ کئی مشکل مرحلوں پر اس نے سوچا تھا کہ کاش اس کا باپ اس وقت موجود ہوتا ۔ یا اس کا بھائی جوان ہوتا ۔ وہ اس کے بڑھتے اور پھیلتے وہموں کے فرضی ہیولوں کو توڑ پھوڑ دیتا ۔ جب وہ چند دن بیمار ہوئی تھی تو اس کا ننھا بھائی اس کے لئے ڈاکٹر کو بلا کر لایا تھا۔ اس کی بیماری کچھ ایسی نوعیت کی تھی کہ وہ کسی کو بتا بھی نہیں سکی تھی ۔ سپاٹ سی گھریلو زندگی میں کسی مرد کا سایہ نہیں تھا ۔ یہ کتنا بڑا خلا تھا۔

اس نے مجتبےٰ حامد کے متعلق سوچا تو یہ خلا از خود بھرسا گیا۔ اس کے ذہن میں وہ دو آنکھیں ابھر آئیں جو اسے باتیں کرتے کرتے بڑے میٹھے انداز سے دیکھ رہی تھیں۔

اسے یروشلم میں اپنا وہ گھر یاد آیا جس میں اس کا باپ اس کی ماں سمیت رہتا تھا ۔ وہ چھوٹا سا گھر جس میں گذشتہ کئی صدیوں سے اس کے آبا و اجداد رہتے آتے تھے، اب بے آباد پڑا تھا۔ اس میں کوئی مردانہ قہقہہ نہیں گونج رہا تھا، کوئی نسوانی آواز نہیں اٹھتی تھی۔

"پیارے یروشلم" وہ زیر لب بڑبڑائی ۔ القدس ۔ پیغمبروں کی سرزمین امت مسلمہ کا قبلۂ اول ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر معراج کی اولیں منزل ۔ تیرہ صدیوں کی اسلامی تاریخ کے علمبردار ۔ مجھے تو کس قدر یاد آرہا ہے ۔ لیکن میں تیرے پاس آؤں تو کیسے ۔؟"

وہ اپنے کمرے سے نکل کر احمد کے کمرہ میں پہنچی ـــ وہ ابھی تک روشنی جلائے پڑھ رہا تھا ـــ آرمینیا کی ایک لڑکی کی کہانی ـــ جو بے حد خوبصورت تھی، بے حد لائق تھی، لیکن اسے ایک دیو نے قید کر رکھا تھا اور دور دیس کا ایک شہزادہ دیو کو قتل کرنے کے لئے جزیرہ پر لنگر انداز ہو چکا تھا۔

احمد نے اپنی باجی کو دیکھتے ہی کہا۔

"باجی جنگ ہونے والی ہے"

"وہ تو ہو رہی ہے"

"کب ہو رہی ہے ـــ ابھی تو شہزادہ ساحل پر پہنچا ہے"

"اچھا ـــ ابھی شہزادہ ساحل پر پہنچا ہے ـــ خوب ـــ اب سو جاؤ ـــ کل پھر پڑھنا"

"نہیں میں تو پڑھ کر سوؤں گا ـــ بڑے مزے دار کہانی ہے"

"میں تو اب سوتی ہوں ـــ اچھا ـــ خدا حافظ"

وہ اپنے بستر پر لیٹی تو اس نے سوچا ـــ جنگ تو واقعی دیر سے شروع ہے ـــ فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان ـــ یورپ میں انگریزوں اور جرمنوں کے درمیان ـــ اور یہاں میرے دل میں فرائض اور جذبات کے درمیان ـــ

تاہم شہزادہ آ چکا ہے ـــ وہ اس دیو سے لڑے گا جو خدشات کی صورت میں میرے لاشعور میں بیٹھا ہے ـــ اور پھر جو جیتے گا اس کی عملداری ہو گی ـــ دیکھیے کون جیتتا ہے ـــ؟

اس نے کروٹ بدلی۔ دور نیل کے کنارے بنی ہوئی بین الاقوامی شاہراہ پر ٹینکوں کے چلنے کی آواز آرہی تھی جو شاید لیبیا کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جہاں نازی فوج تصادم کے لئے تیار بیٹھی تھی ـــــــ وہ اٹھ کر کھڑکی تک آئی تاکہ اسے بند کر دے۔ ٹینکوں کے چلنے کی آواز نہ سن سکے۔

قاہرہ چاندنی میں نہایا ہوا تھا ـــ بلیک آؤٹ کی وجہ سے شہر میں کوئی بتی نہیں جل رہی تھی۔

کھڑکی بند کرتے ہی خاموشی زیادہ پراسرار ہوگئی ـــ وہ اٹھی اور پھر احمد کے کمرہ میں آئی، اسے یوں ہی وہم گذرا تھا کہ کوئی روشنی کی کرن اس کے کمرہ سے باہر تو نہیں جھانک رہی ـــ

اطمینان کرنے کے بعد جب وہ واپس اپنے کمرہ کی طرف آنے لگی تو احمد نے پوچھا۔

"کیا بات ہے باجی؟"

"کوئی بات نہیں؟"

"کوئی بات تو ہے ـــ کیا ڈر لگ رہا ہے؟"

"نہیں ـــ نہیں ـــ ڈرنے کی کیا بات ہے ـــ میں دیکھ رہی تھی کہ کہیں تمہارے کمرہ کی روشنی باہر تو نہیں جارہی"

"اس کمرہ کی روشنی باہر کیسے جاسکتی ہے ـــ یہ تو اندر والا کمرہ ہے"

"اس روشندان سے تو باہر جاسکتی ہے"

"نہیں اس پہ تو سیاہ کاغذ لگا ہوا ہے"

"اچھا چلو اب سو جاؤ۔"

"چلو میں تمہارے کمرہ میں سوتا ہوں باجی۔ تم ڈر رہی ہو؟"

"نہیں میں اپنا بستر تمہارے کمرہ میں لے آتی ہوں۔"

جب وہ بستر لینے جا رہی تھی تو سوچ رہی تھی کہ کیا واقعی وہ ڈر رہی ہے۔ نہیں وہ ڈری نہیں تھی، بلکہ مجتبیٰ حامد سے ملنے کے بعد وہ تنہائی کو شدت سے محسوس کرنے لگی تھی۔

پہلے وہ مرد بن کر حالات کا مقابلہ کرتی رہی تھی اور آج ایک آئیڈیل مرد کو دیکھتے ہی اس کی نسوانیت جاگ اٹھی تھی۔

اگلی چند ملاقاتوں میں طلحہ مجتبےٰ حامد سے کافی گھل مل گئی۔ ان کی گفتگو بظاہر سیاسی ہوتی۔ لیکن ان کا انداز تخاطب، زبان کا رس اور لوچ، نظروں کا ملانا اور چرانا سب اس بات کی غمازی کرتے تھے کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہیں۔

ایک ملاقات طلحہ کے گھر پہ ہوئی، مجتبیٰ حامد نے احمد کو دیکھا تو اس کے چہرہ کا رنگ اتر گیا۔ اس نے فوراً طلحہ سے پوچھا۔

"آپ شادی شدہ ہیں؟"

"نہیں تو!" طلحہ مسکرائی۔ "احمد تو میرا بھائی ہے!"

"آپ نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"میں نے اس موضوع پر کبھی سوچا ہی نہیں!"

"کبھی بھی نہیں؟" مجتبےٰ حامد نے اپنی نظریں طلحہ کے چہرہ پر گاڑتے ہوئے

طلحہ خاموش ہو گئی، وہ جھوٹ بولنا نہیں چاہتی تھی، مجتبیٰ حامد سے پہلی ملاقات کے بعد ہی اس نے اپنے متعلق سوچنا شروع کر دیا تھا۔ طلحہ کو خاموش پا کر مجتبیٰ حامد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔

"طلحہ — میں نے کئی دفعہ اپنا گھر بسانے کے متعلق سوچا ہے — محض اس خیال کے تحت کہ میں کبھی بالکل اپنے آپ سے غافل ہو کر اس چہار دیواری میں پڑا رہ سکوں اور میرے گھر کی ملکہ میری ہمزاد بن کر میرے نفع اور نقصان کا خیال رکھے۔ لیکن میرے ذہن میں جس عورت کا ایک تصور موجود تھا وہ کبھی بھی حقیقت کے لباس میں نظر نہیں آئی۔ لیکن جب سے آپ کو دیکھا ہے — آپ سے باتیں کی ہیں تب سے میں محسوس کرتا ہوں کہ میری منزل میرے سامنے ہے۔"

طلحہ نے آہستہ سے اپنا ہاتھ مجتبیٰ حامد کے ہاتھ سے کھینچ لیا۔ دو بڑے بڑے آنسو اس کی دونوں آنکھوں سے ڈھلک گئے — یہ ایک ایسا اقرار تھا جس کو صرف مجتبیٰ حامد ہی پڑھ سکتا تھا۔

اگلے ہفتہ دونوں کی شادی ہو گئی۔

ایک ہفتہ طلحہ اور مجتبیٰ حامد اکٹھے رہے۔ احمد ان کے ساتھ ہوتا۔ کبھی وہ اہرام دیکھنے چلے جاتے اور کبھی نیل کے کناروں پہ گھومتے رہتے۔ کبھی عجائب گھر میں مصر کے قدیم تمدن پہ بحث مباحثہ کرتے اور کبھی مصر کے قدیم کھنڈروں پر — کبھی کبھی ان کی گفتگو حال پہ لوٹ آتی اور مصر کی موجودہ حالت ان کے سامنے ہوتی۔

نحاس پاشا کا دور اقتدار تو ۱۹۳۸ء سے ہی ختم ہو چکا تھا۔ جبکہ شاہ

فاروق نے اکثریت حاصل کر کے اسے ریجنسی کونسل کی صدارت سے ہٹا دیا تھا لیکن جنگ کے شروع ہو جانے سے اب ۱۹۳۶ء کے معاہدہ کے تحت برطانوی حکومت کو یہ اختیار حاصل تھا کہ مصری حکومت کی موجودگی کے باوجود مصر میں اپنے وسیع تر اختیارات استعمال کر سکے۔ شاہی محل سازشوں کا شکار ہو چکا تھا۔ اور اطالوی اثر قبول کر چکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جنگ شروع ہونے کے بعد مصری حکومت کاٹھ کا اُلو ہو کر رہ گئی، فلسطین کی آزادی خواب دیکھنے والی تنظیمیں مجبور ہو گئیں اور سیاسی افق پر سناٹا سا چھا گیا۔

مجتبیٰ حامد کو واپس یروشلم پہنچنے کے احکامات ملے تو اس نے طلحہ سے ساتھ چلنے کو کہا۔ بے شک احمد اب کافی سوجھ بوجھ والا دس برس کا لڑکا تھا۔ لیکن طلحہ جنگ کے دنوں میں اسے کبھی اقامتی درس گاہ میں نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس نے مجتبیٰ حامد سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

"سارے یورپ پر جنگ کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں اسے وہاں بھی کسی سکول میں نہیں بھیجا جا سکتا۔ پھر چچا کریم سے بھی اب تمہیں زیادہ رقوم نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ مشرق وسطیٰ میں جنگ کے باعث تجارت کافی متاثر ہوئی ہے۔ سوچو کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔"

"یہی تو میں سوچ رہی ہوں۔ میرے خیال میں تو مجھے کچھ عرصہ اور مصر میں رہنا چاہیئے ـــــ ایک سال کم از کم ـــــ احمد تب تک سیکنڈری سکول میں آ جائیگا۔ اور شاید تب تک مشرق وسطیٰ سے جنگ بھی ٹل جائے۔"

"بہتر ہے۔ میں تمہاری رائے سے اتفاق کرتا ہوں۔"

اگلے روز مجتبیٰ حامد علی الصبح ہی طلحہ سے رخصت ہو کر چلا گیا۔ طلحہ اسے دور سڑک پر جاتے ہوئے دیکھتی رہی ۔۔ پھر وہ احمد کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ آہستہ آہستہ اس نے احمد کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنی شروع کر دی جس سے احمد کی آنکھ کھل گئی، اس نے طلحہ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ اسے مجتبیٰ حامد کے چلے جانے کا ابھی تک علم نہیں تھا۔

"باجی ۔۔ آج آپ جلدی بیدار ہوئی ہیں"

"ہاں ۔۔ تمہارے بھیا چلے گئے ہیں"

"کہاں؟"

"یروشلم"

"ہم نہیں جائیں گے کیا؟"

"ہم بھی جائیں گے لیکن ابھی نہیں ۔۔ ذرا جنگ تو تھم لے"

"جنگ کی کیا خبر ہے باجی ۔۔ آج کل"

"جنگ کی خبریں اچھی نہیں ہیں ۔۔ مصر کے اردگرد سارے ملکوں میں جنگ کا خطرہ ہے۔ اطالوی فوجیں اب مصر کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ لیبیا میں انہوں نے طوفان برپا کر رکھا ہے"

"لیبیا تو مصر کے قریب ہی ہے میں نے نقشہ میں دیکھا تھا"

"ہاں نقشہ میں قریب ہے لیکن ویسے بہت دور ہے ۔۔ لیکن پھر آج کل ہوائی حملے دور دور جا کر کئے جاتے ہیں۔ ہر وقت خطرہ ہے"

دونوں بہن بھائی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر ناشتہ کیا۔ سکول کا

وقت ہوا تو احمد سکول چل دیا۔ طلحہ اکیلی گھر میں رہ گئی۔ پچھلے چند دن مجتبیٰ حامد کی جو رفاقت اسے نصیب ہوئی تھی، اس کی یاد بڑی سہانی تھی۔ اسی یاد میں اس کی ساری عروسی لطافتیں گھلی ملی ہوئی تھیں۔ لیکن بر ... کا جنہوں نے فلسطینی نوجوانوں کو بے چین کر رکھا ہے۔ مجتبیٰ حامد کے بچھڑتے ہی جذبات و لطافت کا سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ اور اب جنگ کا خطرہ ایک اور عفریت بنا بیٹھا تھا۔

۱۹۴۰ء کا زمانہ آگیا۔ جنگ کے خدشات اور زیادہ بڑھ گئے۔ بری بری خبریں آنے لگیں۔ مشرق بعید میں اور دیگر برطانوی مقبوضات میں بے حد پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ برطانوی فوجوں کو نازی افواج سے کئی محاذوں پر لڑنا پڑ رہا تھا۔ لیکن شمالی افریقہ میں ایک زبردست لڑائی ابھی متوقع تھی۔ کیوں کہ اگر انگریز مصر کھو دیتے تو ساری دنیا میں ان کی جنگی چالیں ناکام ہو جاتیں۔ اس لئے انگریز اپنی تمام تر کوششوں سے بحیرہ روم اور نہر سوئز کو اپنے تصرف میں رکھنے پر مجبور تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب جلد ہی کچھ ہونے والا ہے۔ اطیفہ، طبروک، اور العالمین پر جنگ کے بادل گھرے ہوئے جا رہے تھے۔ قاہرہ خاموش تھا۔ فاروق کی حکومت کبھی کبھی برطانوی سرکار کی خوشنودی کے لئے کوئی اعلان کر دیتی تھی ـــ اور بس ـــ

طلحہ کے لئے نہیں، ہر شخص کے لئے یہ تحیر اور بے یقینی کا دور تھا۔ اسے مجتبیٰ حامد کے خط ملتے رہے۔ پہلے پہلے تو وہ اپنی اداسی کا ذکر کرتا جو اسے طلحہ سے وابستگی کے بعد محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ یروشلم کی حالت پر تبصرہ کرتا۔

گلی محلوں اور شہر سے ہوتا ہوا اس کا ذہن پورے فلسطین کی طرف گھوم جاتا۔ اور وہ چیدہ چیدہ واقعات سے خط کا دامن بھرتا جاتا۔ آخر میں وہ ایک پر امید انداز سے اس سے رخصت ہوتا اور رخصت ہوتے وقت احمد کی خیریت پوچھنے سے متعلق اور جلد ملنے کی دعا پر چند جملے لکھتا ہے۔ اس کے ہر خط کا انداز یہی ہوتا۔

دسمبر ۱۹۴۰ء میں جو خط طلحہ کو ملا اس کا انداز قدرے مختلف تھا، اس نے لکھا تھا۔

جان من!

تم سوچتی تو ہو گی کہ تمہاری نظر انتخاب بھی پڑی تو کیسے مرد پر ۔۔۔ جو تمہاری رفاقت کا دم تو بھرتا ہے مگر عملی طور پر اس کا بھرم نہیں رکھتا۔ تمہارے خطوط سے اگرچہ میری بڑی تشفی ہو جاتی ہے لیکن میں سوچتا ہوں تم پر یہ ظلم ہے ۔۔۔ میری زندگی خطرات سے پر ہے اور یہ تمہیں کسی بھی وقت دھوکا دے سکتی ہے ۔۔۔ میں آج کل جرمنی خفیہ پولیس گسٹاپو کی قید میں ہوں۔ انہوں نے مجھے شبہ کی بنا پر گرفتار کر رکھا ہے اور میں یہ خط ایک جرمن فوجی افسر کی نگرانی میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ وہ اس خط کو کسی عربی داں کے پاس لے جائے گا اور باقاعدہ اس کا پوسٹ مارٹم کرنے کے بعد تمہیں روانہ کرے گا، جانے یہ تم تک پہنچ سکتا ہے کہ نہیں۔

جرمن اگرچہ یہودیوں کے دشمن ہیں لیکن انہیں یہ یقین نہیں آرہا کہ میں بھی یہودیت، اور انگریزوں کا دشمن ہوں۔ تاہم میں نے ان کو ایسے افراد

کے نام بتائے ہیں جن سے مفتیٔ اعظم گوریلا طرز کی جنگ کی تربیت سے متعلق بات چیت کرنے کے سلسلہ میں مل چکے ہیں۔ اب جرمنی میں میری شناخت ہو گی اور پھر شاید ہماری ملاقات ہو سکے۔ اگر میں پہچانا نہ جا سکا تو گیلے پودا لے انسانوں کو گم کرنے میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔

تم سلمان غنی کو قاہرہ میں ملو ـــــ اس کا مکان تم جانتی ہو۔ ہم نے اس کے گھر پہ عصرانہ کھایا تھا ـــ وہ اکثر بھیس بدل کر رہتا ہے، ممکن ہے تم اسے پہچاننے میں کامیاب نہ ہو سکو ـــ اگر وہ واقعی اپنے اصلی روپ میں نہ ملے تو خادم کو کہنا، میں عربی ریت سے تعلق رکھتی ہوں ـــ پھر وہ تمہیں فی الفور ملے گا ـــ اسے میرا یہ خط دکھا دینا اور کہنا کہ اس سے ملتے رہنا ـــ وہ تمہیں، میری حالت سے آگاہ کرتا رہے گا۔ ممکن ہے اب میں تمہیں کوئی خط نہ لکھ سکوں ـــ احمد کو پیار دینا۔

تمہارا حبیب
مجتبیٰ حامد

خط پڑھ کر طلحہ کا پریشان ہونا قدرتی امر تھا ـــ اس نے اسی سہ پہر کو سلمان غنی سے ملنے کا پروگرام بنایا ـــ ذہن پر ذرا ہی زور ڈالنے سے اسے نہ صرف اس کا گھر یاد آیا، بلکہ اس کا چہرہ بھی یاد آ گیا۔

احمد کو گھر پہ اکیلا چھوڑ کر وہ سلمان غنی کے گھر پہنچی ـــ اس کا گھر کیا تھا ایک محل ہی تھا ـــ خادموں کا کوئی شمار نہ تھا۔

دروازہ پہ دستک دی تو ایک خادم نے سر نکال کر کہا۔

"جی۔ اس وقت گھر پہ موجود نہیں۔"

"کیا میں ان کا انتظار کر سکتی ہوں؟"

"نہیں وہ واپس آ بھی گئے تو کسی سے نہیں ملیں گے۔"

"دیکھو میں عربی ریت سے تعلق رکھتی ہوں اور مجھے ان سے ضرور ملنا ہے۔"

خادم نے عربی ریت کا نام سنکر متجسسانہ انداز سے اس کے چہرہ کو دیکھا اور پھر کہا۔

"آئیے۔ میں آپ کو ملاقاتیوں کے کمرہ میں بٹھاتا ہوں۔"

طلحہ اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔

مصری ساز و سامان اور تصاویر سے سجے ہوئے کمرہ میں بیٹھتے ہی اس نے محسوس کیا کہ خادم اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

خادم کے جاتے ہی سلمان غنی کمرہ میں آ گیا۔

"اخاہ۔ آپ ہیں۔ ہمارے دوست کی نصف بہتر۔"

طلحہ سلمان غنی کی بے تکلفی سے ذرا گھبرائی۔ اس کے چہرہ پہ ناخوش گواری کے اثرات پیدا ہوئے۔ سلمان غنی فوراً سمجھ گیا اور ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔

طلحہ نے اسے اپنے شوہر کا خط نکال کر دکھایا تو وہ خط پڑھ کر اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔

"میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور دوسرے کمرہ میں چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد سلمان غنی باہر آیا تو اس کے ساتھ ایک خوبصورت بیس یا ئیس برس کی لڑکی تھی۔ سلمان غنی کی نسبت وہ اس نوجوان لڑکی کو دیکھتی

رہ گئی۔ اس کی آنکھوں کی چمک میں ایک مقناطیسیت سی تھی۔ طلحہ کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس چہرہ کو پہچانتی ہے۔ لیکن کافی غور و خوض کے بعد اسے کوئی نام نہ دے سکی۔ ناچارہ سلمان غنی سے مخاطب ہوئی۔

"کیا میں اب جا سکتی ہوں؟"

"نہیں۔ ابھی سے۔ آپ ان سے ملی ہیں۔" سلمان نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں ان کو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

"پھر نہیں پہچانا نا۔ ان کو دیکھ کر لوگ ایسا ہی محسوس کرتے ہیں۔ اور پھر جب انہیں بتایا جاتا ہے تو اپنی غلطی پر آپ ہی ہنس دیتے ہیں۔"

طلحہ خاموش سلمان کی بات سنتی رہی اور اس نوجوان لڑکی کی طرف دیکھتی رہی۔

"ارے۔ آپ اب تک نہیں پہچان سکیں۔ یہ صالحہ ناصر ہیں۔" سلمان نے پھر کہا۔

سلمان غنی کے ان الفاظ کے ساتھ ہی طلحہ کی نظروں میں وہ اخبارات ناچ اٹھے جن میں اس انقلابی لڑکی کے کارنامے چھپے تھے۔ اس کے آگے بڑھ کر فرطِ عقیدت سے صالحہ ناصر کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ صالحہ نے اسے سینے سے لگا لیا اور کہا۔

"میں نے الاہرام میں تمہارے مضامین پڑھے تھے۔ تم نے لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟"

طلحہ ابھی تک کوئی جواب نہیں دے سکی تھی۔ بس عقیدت مندانہ نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ صائحہ نے پھر کہا۔

"جرمن ہائی کمانڈ یقیناً مجتبیٰ کو رہا کر دے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ مگر اس کام میں کتنا وقت لگتا ہے۔ یہ ذرا سوچنے کی بات ہے"

طلحہ خاموش تھی۔ اگرچہ مجتبیٰ حامد کی گرفتاری سے وہ ملول ہو گئی تھی۔ لیکن سلمان اور صائحہ ناصر سے ملنے کے بعد وہ مایوس نہیں ہوئی تھی، اس نے صائحہ سے دوبارہ ملنے کا وقت لیا اور چلی گئی۔ راستہ بھر وہ سوچتی رہی کہ صائحہ کو سلمان نے اس کے متعلق سب کچھ بتا رکھا ہے۔

رات پھر بڑی کٹھن تھی۔ وہ اپنے شوہر کے متعلق سوچتی رہی، اس کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کو یاد کرتی۔ سوئے ہوئے احمد کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتی اور اس کے خیالات سلمان اور صائحہ کی طرف پلٹ جاتے۔ صائحہ یہاں کیا کر رہی ہے؟ سلمان کیسے مجتبیٰ کو رہائی دلائے گا۔؟ یادوں اور امیدوں کے تانے بانے بنتے ہی اس کی رات گزر گئی۔

اپنے معمولات سے فارغ ہو کر اگلی سہ پہر کو وہ پھر صائحہ سے ملنے گئی۔ صائحہ نے اسے بتایا کہ جرمن ہائی کمانڈ کو بتا دیا گیا ہے کہ گسٹاپو والوں نے مجتبیٰ کو گرفتار کر لیا ہے۔ ہائی کمانڈ نے اسے اپنی تحویل میں لے لیا ہے اور اب وہ محفوظ ہے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اسے ضروری پوچھ گچھ کے بعد رہا کر دیا جائے گا"

طلحہ نے ایک لمحہ کے لئے سوچا کہ صائحہ کو یہ کیسے اور اتنی جلدی پتہ چل گیا

کہ جرمن ہائی کمانڈ نے مجتبیٰ کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ پھر اس نے اپنے ہی ذہن پہ زور دیا کہ ہوسکتا ہے ان کے پاس کوئی ایسے ذرائع ہوں یا لاسلکی آلات سے پتہ چلا ہو۔ وہ یہ تو اچھی طرح جانتی تھی کہ صاتحہ اور سلمان دونوں تحریک آزادی سے وابستہ ہیں اور تحریک آزادی کے سربراہ اس وقت جرمن میں ہیں۔

طلحہ نے صاتحہ کو اپنے گھر بلایا۔ انہوں نے باہم دلچسپی کی بہت سی باتیں کیں، صاتحہ کے کہنے پر طلحہ نے عملی طور پر فلسطین کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔

اس نے پھر قلم اٹھایا اور ایسے مصری نوجوان مردوں اور عورتوں کو فلسطین کے مسئلہ سے آگاہ کرنے کا پروگرام بنایا جو عرب قومیت کے نام پر مر مٹنے کو تیار تھے۔ اور جنہیں احساس تھا کہ فلسطین کی تقسیم اور یہودی ریاست کا قیام تمام عالم عرب کے سر پہ لٹکتی ہوئی تلوار کی مانند ہوگا۔ ان کی ساری ہمدردیاں تحریک آزادی سے وابستہ تھیں۔ نحاس پاشا کے دوبارہ برسر اقتدار آجانے سے مصر بالکل ہی انگریزوں کا ٹھو بن گیا تھا۔ خود اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے برطانوی سفیر شاہ فاروق پر دباؤ ڈال کر اسے مسند اقتدار پر لائے تھے۔ حریت پسند نوجوان اس قسم کی حکومت کو بھی ناپسند کرتے تھے۔ لیبیا سے جنگ کا رخ طبرک اور العالمین کی طرف پلٹ چکا تھا۔ فراعنہ کی سرزمین پہ طیاروں اور ٹینکوں کی گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔

سال پہ سال گزر رہے تھے۔

۱۹۴۲ء معرکوں کا سال تھا گذر گیا۔ لیکن طلحہ کو مجتبیٰ کی کوئی مزید خبر نہ ملی۔

۱۹۴۳ء آیا اور گذر گیا۔

مشرق وسطیٰ پر جنگ کے بادل برس چکے تھے۔ صالحہ اپنے مشن پر جا چکی تھی۔ لیکن اس کی صحبت سے طلحہ اب ایک گمنام کارکن نہیں رہی تھی، وہ ہر حلقہ میں جانی پہچانی شخصیت تھی ــــ یہاں تک کہ برطانوی خفیہ پولیس اس کی ٹوہ میں رہتی تھی ــــ اسے اب شیخ کریم سے کوئی مدد نہیں مل رہی تھی۔ لیکن اب وہ مضامین لکھ کر اور تنظیم سے کچھ مدد لے کر وقت گذار رہی تھی۔ اس کا پس انداز کیا ہوا روپیہ بھی کام آرہا تھا۔

احمد سیکنڈری سکول امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ وہ خوبصورت نوجوان بنتا جا رہا تھا۔ اس کی مسیں بھیگ رہی تھیں ــــ چمکتی تیز آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی۔ اس کا اسکول کا ریکارڈ بھی بڑا اچھا تھا ــــ کھیلوں، تقریروں اور مباحثوں میں جیتی ہوئی ٹرافیوں سے اس کا کمرہ بھرا پڑا تھا۔ وہ بھی اپنے وطن کے لئے بے چین تھا ــــ بظاہر وہاں جانے سے کوئی امر مانع نہ تھا۔ لیکن اسے بھی بہن کے سہاگ کا انتظار تھا ــــ اب وہ بچہ نہیں تھا۔ لیکن اپنی بہن کے دکھ کو سمجھتا تھا ــــ لیکن وہ اس موضوع پر بہن سے بات کرنے جھجکتا تھا۔

۱۹۴۴ء کا سورج طلوع ہوا تو سیکنڈری سکول کے امتحانات شروع

ہو گئے۔ برطانوی فوج کے بھرتی کرنے والے افسران سکول میں آئے اور انہوں نے نوخیز لڑکوں کو ایسی ترغیبات دیں کہ بہت سے نوعمر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ احمد کے ذہن میں بھی ایک خیال آیا۔ اگر وہ بھی فوج میں بھرتی ہو جائے تو شاید وہ اپنے بہنوئی کی تلاش کر سکے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اسے خیال آیا کہ یہ تو برطانوی فوج کی بھرتی ہو گی۔ اپنے ہی دشمنوں کے دفاع کے لئے جان جوکھوں میں ڈالنی ہو گی۔ باجی تو اس صورت حال کو کبھی پسند نہ کرے گی۔ انہی خیالات کا ذکر اس نے اپنے کئی ہم جماعتوں سے کیا تو انہوں نے بھرتی ہونے سے انکار کر دیا۔

یہ ایک پہلا کارنامہ تھا جو اس نے برطانوی فوج کے خلاف کیا۔ اگرچہ اس میں کسی قسم کا تشدد نہیں تھا، جبر نہیں تھا۔ پھر بھی اس کی اہمیت مسلم تھی۔ اس کی باجی یہ سنکر بہت خوش ہوئی۔

سلمان غنی جب کسی سفر سے واپس آتا تو طلعت کو دلاسا دینے کے لئے کوئی نہ کوئی خبر ضرور سناتا۔ اس خبر کا تعلق بالواسطہ اور بلاواسطہ مجتبے حامد سے ہوتا۔ اس کی باتیں سنکر طلعت یقین اور سکون محسوس کرتی۔

احمد اپنی آنکھیں تیزی سے جھپک جھپک کر سلمان غنی کو دیکھتا رہتا۔

۱۹۴۴ء جنگ عظیم دوم کا آخر دور تھا۔

برطانیہ اور امریکہ کے علاوہ دیگر اتحادی طاقتوں کو بھی اپنی کامیابی کا یقین ہو چلا تھا۔ نازی ہر جگہ پسپا ہو رہے تھے۔ جنگ کا رخ ویسے بھی مشرق بعید کی طرف پلٹ چکا تھا۔ اب برطانیہ اور امریکہ کی تمام تر توجہ جنگ پر نہیں تھی، بلکہ دیگر سازشوں کے لئے بھی ان کو وقت مل رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فلسطین میں عرب آبادی کے خلاف صیہونیوں کی دہشت انگیزی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کوئی شہر، قصبہ یا قریہ ایسا نہیں تھا جہاں عربوں پہ عرصۂ حیات تنگ نہ کر دیا ہو۔

حسن سلامہ اور ان کے تربیت یافتہ مجاہدین موسم گرما میں جرمنی کے ایک فوجی طیارے میں فلسطین پہنچے، اور اریحا کے علاقہ میں پیراشوٹ سے اتر گئے۔ ان کے ساتھ بہت سا جنگی سامان اور وائرلیس وغیرہ بھی بھاری مقدار میں اتارے گئے، طے یہ پایا کہ اس کے بعد مزید جنگی سامان اور مجاہدین

بھی اتارے جائیں گے۔ مگر انگریزوں کو پتہ چل گیا۔ انہوں نے یہودی آبادی کی اعانت سے مجاہدین کا پیچھا کیا۔ نتیجتہً بہت سے لوگ پکڑے گئے۔ لیکن اس کے باوجود یہودیوں کا امن چین چھن گیا۔ حسن سلامہ شام پہنچ گئے۔ وہاں سے لبنان گئے اور عرصہ تک روپوش رہے۔

صالحہ نے طلحہ کو مختلف مقامات سے خطوط لکھے۔ ایک میں اس نے لکھا کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ مجتبےٰ حامد اس وقت لبنان میں ہے اور اس نے وہاں حسن سلامہ سے ملاقات کی ہے۔ عنقریب مفتی اعظم قاہرہ پہنچ رہے ہیں۔ تم ان سے ملنا۔ وہ تمہیں مجتبےٰ حامد کے متعلق تفصیل سے بتا سکیں گے۔ طلحہ بہت خوش تھی، اس کو دو ملاقاتوں کی امید ہو چکی تھی۔ ایک مفتی اعظم سے اور دوسرے مجتبےٰ حامد سے۔

سلمان غنی نے بھی ایک ملاقات میں صالحہ کے خط کی تصدیق کر دی۔

طلحہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ خود مفتی اعظم کا ایک خط اسے ملا۔ جس میں انہوں نے طلحہ کی تعریف کی تھی اور مجتبےٰ حامد سے اس کی وابستگی کو سراہا تھا۔ آخر میں انہوں نے طلحہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ صیہونیت کے اغراض و مقاصد سے اور اس کی ریشہ دوانیوں سے عرب نوجوانوں کو واقفیت دلائے۔ اور انہیں اس بات پہ آمادہ کرے کہ وہ فلسطین میں دلچسپی لیں اور استعماری طاقتوں کو فلسطین کی تقسیم، یہودیوں کے لئے ریاست کے قیام اور عربوں کی حق تلفی سے باز رکھنے کے لئے میدان عمل میں کود دیں۔

سلمان غنی کی اعانت سے جامعہ ازہر میں طلحہ نے پہلی دفعہ ایک پبلک

جلسہ میں تقریر کی۔ جس کا تعلق صیہونیت سے تھا۔

طلحہ نے جو کچھ اپنی تقریر میں کہا وہ کافی مطالعہ کا نتیجہ تھا۔

اس نے کہا ـــ

صیہونیت اور صیہونی کا تعلق صیہون سے ہے جو یروشلم کا ایک پہاڑ ہے ــ یروشلم کا شہر دو متوازی پہاڑوں اور ان کے مابین وادی پر ہے مشرقی پہاڑ موریا ہے جس پر بیت المقدس ہے۔ مغربی پہاڑ صیہون تھا، جو دونوں میں زیادہ سر بلند ہے ــ ہیرود کے زمانہ میں تین دیواریں تھیں، ہر دیوار کا ایک خاص حصہ شہر کو گھیرے ہوئے تھا۔ شہر مختلف حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ شہر پناہ کے متعدد پھاٹکوں میں سے ایک صیہون پھاٹک بھی تھا۔ ہیڈریان کے عہد سے لے کر یودوسیا کے عہد تک صیہون پھاٹک شہر قدس کا جنوبی پھاٹک سمجھا جاتا تھا۔ پہلی قدیم آبادی صیہون پر ہی تھی۔ موریا کا پہاڑ بھی جس پر حضرت سلیمان نے مسجد اقصیٰ تعمیر کی تھی اسے بھی قدیم آبادی میں شامل کر لیا گیا۔ اور روایت سے صیہون پہاڑ قدس کے خصوصی مقامات مقدسہ میں سے ایک تھا اور اسے "ام الکناس" خیال کیا جاتا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں بیت المقدس کے بعد گرجوں میں اس کا دوسرا نمبر تھا۔ قدرتاً اور تعمیری لحاظ سے یہ ایک ناقابل تسخیر قلعہ کی مانند تھا۔ اسی پہاڑ صیہون پر حضرت داؤد کی قبر ہے ــ اسی نام کی مناسبت سے یہودیوں کی عالمگیر تنظیم کا نام صیہونیت یا صیہونی ہے۔"

نام کی اس توجیہہ کے بعد طلحہ نے تحریک کی ابتدا کی وضاحت کی۔

یہودی تمام دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن کسی ملک میں ان کی اکثریت نہیں تھی۔ انہیں کسی جگہ بھی قومیت کے حقوق حاصل نہیں تھے۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے خفیہ تحریکیں چلانا۔ یا پس پردہ سازشیں کرنا ان کی عادت بلکہ فطرت بن چکی ہے ـــ صیہونی سے مراد وہ تمام یہودی ہیں جو صیہونیت کی طرف رخ کر کے فلسطین کی قومی حکومت کے خواہاں اور اس مقصد کے لئے کوشاں رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام یہودی صیہونی نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے ایسے یہودی فرقے بھی ہیں جنہوں نے پرجوش صیہونیوں کی تحریک کی کبھی تعریف نہیں کی۔

سترھویں صدی عیسوی سے صیہون تحریک کا مرکز دی آنا میں قائم ہوا۔ مختلف طریق سے اپنے ارادوں کی تکمیل کے لئے انہوں نے جال پھیلانے شروع کر دیئے۔ انگلستان میں لارڈ اتھس چائیلڈ نے فلسطین میں یہودیوں کی واپسی اور ان کے قیام کی کوششوں میں بے انتہا دولت صرف کی ـــ لارڈ بکنیں فیلڈ، لارڈ سیلسبری اور مسٹر لارنس اول فلنٹ نے برطانیہ میں اس امر کی کوشش کی کہ ترکی حکومت یہودیوں کو آزادی کا چارٹر دے۔ اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے یہودی تنظیم نے برطانوی ہتھکنڈوں کو استعمال کیا، سنہ ۱۸۰۵ء میں لندن میں مقیم ایک یہودی نے ایک کمپنی اسی مقصد کے لئے قائم کی۔ ۱۸۷۶ء میں جارج ایلیٹ نے "دانیال ڈیرونڈا" نامی ایک کتاب شائع کرائی۔ اور حیوّن، سائن نامی ایک سوسائٹی قائم کی۔ جس کا مقصد بظاہر تو ارض مقدس میں زراعتی نوآبادیات کا قیام تھا۔ لیکن دراصل صیہونیت

سے مقاصد کی تکمیل تھی۔ مسٹر کونالیٹ نے تجویز پیش کی کہ یہودی سرمایہ سے وادیٔ فرات میں ریلوے لائن تعمیر کی جائے گی۔ بیرن دی نرشن نے نوآبادیوں کی تحریک شروع کی۔ اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے اپنی جیب خاص سے نوے لاکھ پونڈ کا عطیہ دیا۔ تحریک کے ایما پر کئی ادارے، مجالس، بینک اور امدادی بینک کھولے گئے۔

دیانا کے ایک یہودی صحافی ڈاکٹر تھیوڈور ہرزل نے ۱۸۹۶ء میں یہودی ریاست کے قیام کا ایک ٹھوس تصور پیش کیا۔ کہ دیگر اقوام کو مفلوج بنایا جائے۔ اور ارض مقدس کو اپنا قومی وطن بنانے کے لئے پوری پوری جدوجہد کی جائے۔

انہوں نے اپنے اس منشور پر اس شدت سے عمل کیا کہ ۱۹۴۴ء میں یہودیوں کی تعداد ۵۲۸۷۰۲ ہوگئی ــــ اور اب ان کی تعداد سات لاکھ سے زیادہ ہو چکی ہے۔

ملک بھر میں انتشار پھیلا ہوا ہے ــــ عرب بے بس ہو چکے ہیں ــــ میں جو سمجھی ہوں یا میری طرح جن دوستوں نے اس صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی ہے، وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ صیہونی فتنہ استعماری طاقتوں کا ایک بہروپ ہے، چہرہ دیکھئے تو یہودی، لیکن اس کے اندر دل و دماغ ارادے اور عزائم سب استعماری طاقتوں کے ہیں ــــ اس کا جسم ایک ہے ــــ لیکن جانیں صد ہزار ــــ کون انکار کر سکتا ہے کہ استعماری طاقتوں کا مقصد یہودیوں کو وطن دلانا نہیں بلکہ عرب ممالک میں ایک نئی یورپی طاقت

کے قیام کے ذریعہ ان ممالک کو ہمیشہ دبا کر رکھنا ہے۔

عربوں پر کٹھن آزمائش کا وقت ہے۔ یہ مسئلہ صرف فلسطین کا نہیں، تمام عالم عرب کا ہے ــــ اور اگر ہم اب ا ــ ـ ـ ـ ـ سکے تو یہ جاننا مشکل ہے کہ ہمارا انجام کیا ہوگا ــــ ہم کیا کریں اور ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ اس کا جواب آپ لوگوں کو خود مرتب کرنا ہے۔"

تقریر کے بعد ہال میں ایک سکوت تھا ــ سناٹا تھا ــ سامعین ابھی تک کرسیوں پر بیٹھے تھے ــ انہیں ابھی کچھ اور سننے کی تمنا تھی ــــ ان کے ذہنوں کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

صدر جلسہ نے مجمع پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

" اگر کوئی وضاحت طلب بات ہو تو فاضل مقررہ آپ کے سوالات کا جواب دینے کو تیار ہیں۔"

ایک کونہ سے ایک لڑکی نے ہاتھ کھڑا کیا ــ صاحب صدر کی اجازت سے" اس نے کہا ــ" کیا فاضل مقررہ بتا سکتی ہیں کہ خواتین اس سلسلہ میں کیا کر سکتی ہیں۔؟"

" برطانوی تہذیب کی آمد سے عرب لڑکیاں اب وہ نہیں رہیں جو آج سے صدیوں پیشتر تھیں ــ ہمارے ہمسایہ ملک شام کی خواتین کی زندگی ہمارے سامنے ہیں، ہم ان سے کافی سبق سیکھ سکتی ہیں" طلحہ نے جواب دیا۔

جلسہ برخاست ہوا تو وہی لڑکی طلحہ کے پاس آئی۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

"میرا نام شازیہ الخیری ہے ــ میں جامعہ میں پڑھتی ہوں۔ میں نے آپ کے مضامین پڑھے ہیں اور آج آپ کی تقریر سنی ہے ــ اللہ نے آپ کو بڑا علم دیا ہے ــ کیا میں آپ کو آپ کے گھر پہ مل سکتی ہوں ــ"

"ہاں ــ ہاں ــ مل سکتی ہیں" طلحہ کے بجائے سلمان غنی نے جواب دیا۔

وہ بھی شازیہ الخیری کو خدا حافظ کہہ سلمان کے ساتھ چل دی ــ وکٹوریہ گاڑی پر بیٹھ کر جب وہ شاہراہ بیروت پہ پہنچے تو بجائے گھر کے سلمان نے وکٹوریہ والے کو نیشنل میوزیم چلنے کو کہا۔ طلحہ حیران ہوئی اور اس نے سلمان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو سلمان غنی نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

میوزیم سے آگے نکل کر وہ ایک کشادہ گلی میں داخل ہوئے۔ اور پھر ایک چھوٹی سی گلی سے ہوتے ہوئے ایک تنگ دروازے والے لیکن اندر سے بے حد کشادہ مکان داخل ہوئے۔ ایک نوجوان نے سلمان کو سلام کیا اور ساتھ ہی انگلی کے اشارے سے ایک طرف مڑنے کو کہا۔ ایک کمرہ سے ایک نورانی سی آواز آرہی تھی۔

"جب کہ اسلام کی نعمتوں سے بڑھ کر اور کوئی نعمت، اور ایمان کی دولت سے بڑھ کر اور کوئی دولت نہیں ــ تو پھر...... اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"اور یاد کرو اس نعمت کو جس سے اللہ نے تم کو نوازا۔ جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اللہ کی عنایت سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔ اور تم بالکل جہنم کے کنارے پہ تھے (قریب

تھا کہ اس میں گر جاتے) تو اللہ نے تم کو اس سے نکال لیا اور اسی طرح اپنی آیات تم سے بیان کرتا ہے تاکہ تم کو ہدایت کی راہ اپنالو۔"

وہ دونوں کمرہ میں داخل ہوئے۔ کمرہ بڑے بڑے جبہ پوشوں سے بھرا پڑا تھا اور ان سے خطاب کرنے والا کہہ رہا تھا۔

"سیاسی شخصیتوں کی ایک بہت بڑی تعداد ان بے لگام ٹھوؤں اور مطلق العنان جابرانہ حکومتوں کی نذر ہو گئی ہے۔ بہت سے لوگ قتل کر دیئے گئے ہیں اور کچھ خود بھاگ گئے ہیں۔ اب ان لوگوں کا صرف ایک مقصد رہ گیا ہے کہ ملک میں ہر اٹھتی آواز پر، ہر دھڑکتے دل، اور ہر چلتی ہوئی نبض کو ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا جائے اور وہ کانٹا ہی نکال دیا جائے جو پہلو میں چبھ سکتا ہو۔"

روئے سخن کس طرف تھا اور مضمون کس عنوان کے تحت تھا اس کا اندازہ کہنے والے کی شخصیت سے ہو سکتا تھا ــــ اور طلحہ تو انگشت بدنداں تھی۔ یہ بولنے والی شخصیت جبّہ و عمامہ سمیت جانی پہچانی تھی۔

یہ تو مفتیٔ اعظم تھے۔

انہیں دیکھتے ہی طلحہ اپنے خیالات میں کھو گئی ــــ عالم اسلام کی عظیم شخصیت ــــ مسلمانان عرب، بلکہ مسلمانانِ عالم کے سربراہ اس کے اتنے قریب تھے ــــ وہ قاہرہ پہنچ چکے تھے۔ اور اسے بھی یہ بتایا جا رہا تھا کہ وہ قاہرہ آنے والے ہیں۔ یہ اچانک آمد اور اچانک ملاقات بڑی ہی زندگی بخش تھی۔ طلحہ انہیں دیکھ

رہی تھی۔ اور اپنے ذہن میں کئی اٹھتے ہوئے سوالات کو حل کر رہی تھی۔ اس نے اپنے خیالات کی جولانی میں یہ سنا ہی نہیں کہ مفتی اعظم کیا کہہ رہے ہیں۔

جب خطاب ختم ہوا تو طلحہ پھر اپنے ماحول میں لوٹ آئی۔ سلمان نے چند مخصوص رفقار کار کی موجودگی میں طلحہ کو مفتیٔ اعظم کے سامنے پیش کیا۔ تو مفتی اعظم نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"بیٹی — تم بڑا کام کر رہی ہو — نیک عرب خواتین سے ایسی ہی توقع کی جا سکتی ہے — شیخ کریم اور مجتبٰے حامد سے میں تمہارے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں۔ خود میں نے تمہارے مضامین الاہرام پڑھے ہیں — لیکن بیٹی مجھے تمہارا یہ لباس پسند نہیں — یہ انگریزوں سا ہے —" مفتیٔ اعظم نے جدید وضع کے تراشے ہوئے طلحہ کے لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا —

"تم نقاب بھی نہیں اوڑھتی — یہ بھی اچھا نہیں —"

طلحہ شرم سے پانی پانی ہو گئی — اس نے وعدہ کیا کہ وہ لباس اور نقاب کا خاص طور پر خیال رکھے گی۔

پھر مفتیٔ اعظم دیگر زعمار اور سلمان غنی سے دیر تک باتیں کرتے رہے جب مجلس برخاست ہوئی تو انہوں نے کہا۔

"طلحہ بیٹی — میں تمہارے لئے ایک تحفہ لایا ہوں — جو تمہارے گھر پہنچا دیا گیا ہے — اسے سنبھال کر رکھنا۔ بڑا قیمتی ہے — اب کافی وقت ہو گیا ہے — تم گھر جاؤ — تھوڑی دیر میں ہی اندھیرا چھا جائے گا — کرفیو اور بلیک آؤٹ کے زمانہ میں ہم رات کو کچھ نہیں کر سکتے — سلمان

تمہیں گھر تک چھوڑ جائے گا۔"

مفتی اعظم میرے لئے تحفہ لائے ہیں ۔۔۔ اس نے راستہ میں سوچا۔ کیا ہو سکتا ہے وہ تحفہ ۔؟ اس نے سلمان سے پوچھا تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔

تحفہ کے متعلق سوچتی وہ گھر پہنچی ۔۔۔ احمد اپنے کمرہ میں تھا۔ وہ سیدھی اپنے کمرہ میں گئی ۔۔۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ۔۔۔ اس کے بستر پر مجتبیٰ حامد سو رہا تھا ۔۔۔ اس کا جی چاہا کہ وہ دوڑ کر اس کے چوڑے چکلے سینہ میں اپنا سر چھپالے اور رو رو کر دل کی بھڑاس نکالے، لیکن وہ یہ سوچ کر کہ جانے وہ کہاں کہاں بھٹکتا رہا ہے ۔۔۔ اسے کتنی نیند آئی ہوئی ہے اور شادی سے پہلے بھی تو اس نے یہی کہا تھا کہ وہ اپنا گھر بنانا چاہتا ہے جس میں وہ بے فکر پڑا رہ سکے۔ اور کوئی دوسرا ۔۔۔ اس کے متعلق سوچے ۔۔۔ اس نے آہستہ آہستہ خاموشی سے کمرہ میں گھوم کر اپنی ضرورت کی اشیاء اکٹھی کیں۔ لباس تبدیل کیا۔ احمد کے کمرہ میں گئی ۔۔۔ وہ بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ بہن کو دیکھ کر بولا۔

"کب لوٹیں ۔۔؟"

"ابھی !"

دونوں بہن بھائیوں کی نظریں ملیں تو ان میں چمک پیدا ہوگئی۔ رخساروں پر رنگ ابھر آیا۔

"پتہ چلا ؟" احمد نے پوچھا۔

طلعت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جگانا نہیں ہے۔ تین دن پیدل سفر کیا ہے"
طلحہ نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔
ڈھانپی ہوئی روشنی کی تاریکی میں جب وہ پھر کمرہ میں داخل ہوئی تو
بے اختیار اس کا ہاتھ مجتبیٰ حامد کے بالوں تک پہنچ گیا۔
وہ اس کا شوہر تھا۔ اس کا مجازی خدا۔
اس نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے اس کے بال سنوارے ——
مجتبیٰ حامد نے کروٹ بدلی اور طلحہ کی کلائی پکڑ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔
"طلحہ"
"ہاں سرتاج"
دور سے کہیں جذبات کی لہروں پہ ڈولتی آواز آئی۔

دروازہ پہ دستک ہوئی۔ احمد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک اٹھارہ برس کی لڑکی کھڑی تھی۔۔ اس نے غور سے احمد کی طرف دیکھا۔

"میں شازیہ انجیری ہوں ۔۔۔ مجھے طلحہ باجی سے ملنا ہے۔"

"وہ تو گھر پہ نہیں ہیں۔"

"کب تک لوٹیں گی ۔۔۔ انہوں نے مجھے وقت دیا ہوا ہے۔"

"آپ اندر آکر انتظار کریں ۔۔۔ اگر وقت دیا ہے تو آتی ہی ہوں گی۔"

شازیہ اندر آگئی ۔۔۔ احمد نے اسے ڈرائینگ روم میں بٹھایا۔۔ اس کے سامنے چند اخبارات اور رسائل رکھے اور خود اپنے کمرہ میں چلا گیا ۔۔۔ شازیہ نے ایک رسالہ کے چند اوراق پلٹے ۔۔۔ اخبارات پہ ایک نظر ڈالی اور پھر اٹھ کر کمرہ میں ٹہلنے لگی ۔۔۔ اس نے کمرہ میں سجی ہوئی چند تصاویر کو دیکھا۔ قطعات پہ نظر ڈالی، چھت کو گھورا۔ اور پھر ملحقہ غسل خانے میں جھانکا۔ پھر اطمینان سے صوفہ پر بیٹھ گئی۔

سکرٹ سے اس کی ٹانگیں گھٹنوں سے اوپر ذرا ننگی ہو گئیں تو اس نے سکرٹ کو درست کیا۔ پھر جانے کیا خیال آیا کہ اس نے سکرٹ کو ذرا اور اونچا کر دیا۔ جس سے اس کی صحت مند رانوں کا کچھ حصہ صاف نظر آنے لگا۔ اپنے کٹے ہوئے بالوں کی ایک لٹ اس نے پیشانی پہ گرا لی ـــ پھر اس نے پیتل کے بنے ہوئے اونٹ کے ماڈل کو اٹھا کر میز کے کونہ پہ سجایا۔ احمد نے آواز سنی تو کمرہ میں آ گیا ـــ اس نے شنازیہ پہ نظر ڈالی تو جھینپ کر رہ گیا۔ لٹ میں سے جھانکتی ہوئی آنکھ کو مٹکاتے ہوئے اس نے احمد سے کہا۔

"کبھی آپ نے بتایا نہیں کہ طلحہ باجی آپ کی ہوتی ہیں"؟

"میری بہن ہوتی ہیں ـــ اور کیا ہوتی ہیں"۔

"خوب ـــ اتنی بڑی بہن کے بھائی کو یہ علم نہیں کہ جب کوئی گھر میں کسی سے ملنے آئے اور کچھ دیر انتظار کرنا پڑے تو گھر میں موجود افراد اخلاقاً مہمان کے پاس بیٹھتے ہیں"۔

"کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے"؟

"نہیں میں اکیلے میں گھبرا رہی تھی ـــ بیٹھئے آپ سے باتیں کریں"۔

احمد بیٹھ گیا۔ لیکن اس کی نظروں میں حجاب و شوق کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ کنکھیوں سے شنازیہ کی خوبصورت ٹانگوں کے عریاں حصوں کو دیکھتا۔ جھینپ جاتا۔ نظریں ادھر ادھر پلٹ کر پھر وہیں آ جاتیں۔

نے پوچھا۔

"آپ کہاں پڑھتے ہیں؟"

"سیکنڈری سکول میں ۔ آج کل امتحان ختم ہوئے ہیں۔"

"میں بھی وہیں پڑھتی رہی ہوں۔"

"آج کل آپ کیا کرتی ہیں؟"

"پڑھتی ہوں ۔ جامعہ میں ۔ تم بھی جامعہ میں پڑھو گے نا؟"

"خیال تو ہے ۔ لیکن باجی بہتر جانتی ہیں۔"

اسی طرح ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں ۔ شازیہ نے احمد کو پریشان کرنے کے لئے اپنی آنکھوں، بالوں کی لٹوں اور اداؤں سے کافی کام لیا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہو گیا کہ نوخیز لڑکا لڑکیوں سے ملا جلا نہیں۔ اور اس کے جذبات میں تلاطم برپا ہو چکا ہے۔

اچانک دروازہ پہ دستک ہوئی۔ احمد یہ کہہ کر کہ شاید باجی آئی ہیں۔ دروازہ کی طرف لپکا۔ اور واقعی اس کی بہن اور بہنوئی آئے تھے۔ احمد نے شازیہ کی آمد کے متعلق بتایا۔ تو طلحہ سیدھی ڈرائینگ روم میں آئی۔ شازیہ بڑی سنبھل کر بیٹھی تھی اور بڑی متین نظر آ رہی تھی۔ وہ کافی دیر تک طلحہ سے فلسطین کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اس نے پوچھنے کی کوشش کی کہ مفتیٔ اعظم اب کیا چاہتے ہیں۔ ان کا طریق کار کیا ہوگا۔ اور ہم خواتین کو وہ کیسے کیسے فرائض سونپیں گے۔ طلحہ نے ایسے سوالات کا جن کا پالیسی سے تعلق تھا کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ ہی اسے علم تھا۔ اس نے شازیہ کو اپنے خاوند سے بھی ملا دیا۔ باتوں باتوں میں مجتبےٰ حامد نے پوچھا۔

"شنازیہ الخیری ۔۔ آپ کا قبیلہ فلسطین سے تعلق تو نہیں رکھتا ؟"
"رکھتا ہے ۔۔ لیکن اب تو صدیاں گذر گئیں، ہم لبنان میں مقیم ہو چکے ہیں "
"پھر آپ نے بیروت میں تعلیم حاصل کیوں نہیں کی ۔؟"
"وہاں جامعہ میں امریکی زیادہ ہے ۔۔ اسلامی اقدار کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا رہی ۔۔ لیکن یہاں حالات ابھی اس کے برعکس ہیں۔ ہر فنون کی تدریس پہ ابھی اسلام کی چھاپ تو ہے "
"آپ کبھی شام میں بھی رہی ہیں "
"نہیں " شنازیہ کی زبان میں ذرا سی لکنت پیدا ہوئی ۔
"لیکن آپ کے بالوں کی کاٹ اور گلے کا ہار تو بالکل شامی طرز کا ہے "
شنازیہ ذرا گھبرا سی گئی ۔ اس نے بالوں کی لٹوں پہ ہاتھ پھیرا اور پھر گلے کے ہار پہ ہاتھ رکھا اور کہا ۔
"نہیں ۔۔ ایسا تو نہیں ہے "
"خیر چھوڑیئے ۔۔ کہیئے قاہرہ کو آپ نے کیسا پایا ۔؟"
"بے حد دلچسپ ۔۔ جنگ کے باوجود یہاں سکون کی فضا ہے "
مجتبیٰ . . . باتیں کرتے کرتے اٹھ گیا ۔۔ احمد ایک دو بار کمرہ میں آیا ۔ لیکن کچھ کہے بغیر چلا گیا ۔
طلعت نے شنازیہ کو عشائیہ تک ٹھہرنے کو کہا ۔ لیکن شنازیہ معذرت کرتی رہی ، اور روانہ پہ رخصت ہوتے وقت اس نے ہر ایک سے ہاتھ

ملایا۔ احمد کے ہاتھ کو اس نے خاص انداز سے دبایا جس سے اس کے رخساروں پہ سرخی عود کر آئی۔

مفتی اعظم کے یورپ سے قاہرہ پہنچنے پہ تحریک آزادی پھر تیز ہو گئی تھی۔ ردعمل کے طور پر صیہونیت کے کارکنوں میں بھی طے پایا کہ اب تحریک آزادی کے کارکنوں کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔۔۔ ادھر انگریز فلسطین کو یہودیوں کے حوالے کر دینے پر تلا ہوا تھا۔ امریکہ سے اس کا گٹھ جوڑ جنگ کے فوراً بعد کامیاب رہا تھا۔ عربوں کو فلسطین سے نکالنے کے لئے یہودی قتل و غارت پہ اتر آئے تھے۔ ملک در ملک پھیلی ہوئی سازشوں کے یہودی جالوں نے کام شروع کر دیا تھا۔۔۔ عرب بھی آسانی سے قابو میں آنے والے نہیں تھے۔ وہ بھی ترکی بہ ترکی جواب دینے پہ اتر آئے۔ القدس کے محاذ پہ عبدالقادر الحسینی ڈٹ گئے۔ وسطی محاذ کی کمان ایک بار پھر حسن سلامہ کے ہاتھ آئی۔ تل ابیب پہ کئی حملے ہوئے۔ عباسیہ، مسلمہ، دیر حسن، ابوشوسہ، لد، رملہ، بیت حزبون، راس العلین، القباب، باب الواد، وادی العرار کے معرکوں میں عربوں کا پلہ بھاری رہا۔ لیکن دونوں فریقوں کا امن چین لٹ گیا۔ مجاہدین نے کئی یہودی بستیاں تباہ کر دیں۔ اسی دوران میں اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کی قرار داد منظور کر لی۔ اس قرار داد کا منظور ہونا تھا کہ حالات شدید تر ہو گئے۔

۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کا دن تاریخ فلسطین کا منحوس ترین دن ہے۔

مفتی اعظم نے للکار للکار کر کہا" اقوام متحدہ بڑی طاقتوں کے ہاتھوں میں ایک کھلونا ہے۔ یہ ادارہ ان کے مفادات کے سامنے بے بس ہے۔۔۔ اس

ادارے کی بے بسی بھیڑ کی سی ہے اور جو طاقتیں اس پہ چھائی ہوئی ہیں وہ بھیڑیئے ہیں۔

اے عربو! اسلام کے روپ میں ہمارے پاس ایک بہترین نظام زندگی ہے ۔ اس رشتہ سے ہم ستر کروڑ انسان ایک محاذ پر اکٹھے ہو سکتے ہیں۔ قدرت نے تپتے ہوئے صحراؤں کو معدنی دولت سے مالامال کیا ہے۔ ہم اسی کے ذریعہ استعماری طاقتوں کو نیچا دکھا سکتے ہیں۔

باوجود بڑی بڑی کوششوں کے حالات عربوں کے خلاف ہو گئے تھے۔ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء کو اسرائیل کا ناپاک وجود عمل میں آ گیا۔ برطانوی انتداب کے رخصت ہوتے ہی جنگ چھڑ گئی۔ عربوں اور یہودیوں میں گوریلا طریق جنگ زیادہ عمل میں لایا گیا۔ عرب اپنے حملوں کا نشانہ یہودی اور فوجی ٹھکانوں کو بناتے۔ انہوں نے جافہ سے یروشلم جانے والی سڑک بند کر کے یہودیوں کی سپلائی لائن توڑ دی۔ ہمسایہ عرب ملکوں، مصر، اردن، عراق، شام اور لبنان نے اعلان کیا کہ ان کی افواج فلسطین میں امن قائم کرنے کے لئے میدان عمل میں اتریں گی۔ عربوں کا پلڑا بھاری نظر آیا تو اقوام متحدہ میں یہودیوں کے دوست حرکت میں آ گئے۔ ان کی کوششوں سے جنگ ایک ماہ کے لئے بند ہو گئی۔ جنگ بندی کے اس وقفہ میں یہودیوں کو چیکوسلواکیہ سے جدید ترین اسلحہ کی بھاری مقدار پہنچ گئی، روس اور پولینڈ سے کمیونسٹوں کے تربیت یافتہ یہودی نوجوان بھی ہزاروں کی تعداد میں پہنچ گئے ۔ جب ان کی تیاریاں مکمل ہو گئیں تو انہوں نے جنگ بندی کا معاہدہ توڑ دیا اور عرب آبادیوں پر حملے شروع کر دیئے۔ راملہ

لیا اور دیگر میدانی علاقوں پر اسرائیل نے قبضہ کر لیا۔ ۱۸ر جولائی کو دوبارہ جنگ بندی ہوئی۔ اقوام متحدہ کے فوجی مبصر کونٹ برناڈوٹ کو ستمبر میں یہودی دہشت پسندوں نے ہلاک کر دیا۔ پھر بھی اسرائیل کی اتنی سرپرستی کی گئی، کہ تمام یورپی اور امریکی طاقتوں نے اسے تسلیم کیا۔ مئی ۱۹۴۹ء میں اسے اقوام متحدہ کا ممبر بنا لیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء میں رافہ، غازہ اور العریش یہودیوں کے قبضہ میں آ گئے۔ صحرائے نجف کے بیشتر حصے پر اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔ غزہ اور رافہ کی ایک پٹی مصر کے قبضہ میں آئی۔

دنیا میں پھیلے ہوئے پونے دو کروڑ یہو[illegible]ں میں سے ساڑھے ستاون لاکھ جرمنوں نے مار ڈالے تھے۔ بیس لاکھ ... روس میں تھے۔ پچاس لاکھ امریکہ میں، ہزاروں میں گنی جانے والی تعداد کو سامراجی طاقتوں نے ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کر دیا۔ جہاں وہ من مانی کاروائیاں کرنے کے لئے سازشوں کو ترتیب دے سکیں۔

عرب ممالک میں برطانیہ اور امریکہ نے ایسی چالیں چلیں کہ ان کو ایک دوسرے کا مخالف بنا دیا۔ شاہ فاروق نے یہاں تک کہہ دیا کہ ہم سرزمین مصر سے ایسی سازشوں کو نہیں ابھرنے دیں گے جن کی وجہ سے ان کے تعلقات یورپی ممالک سے خراب ہوں۔ عملی طور پر سرزمین فلسطین میں عربوں کا قتل عام جاری رہا لیکن دیگر عرب ممالک میں فلسطین کی آزادی کی آزادی کی تحریکیں دب سی گئیں۔ مقبوضہ فلسطین سے مہاجرین کا سیلاب اردن کے علاوہ دیگر ملحقہ عرب حکومتوں کے لئے ایک لمحہ فکریہ بن گیا۔

اسی دوران میں طلحہ اور مجتبیٰ حامد عمان آ چکے تھے۔ احمد جامعہ میں زیر تعلیم تھا۔ اس کی ملاقاتیں اکثر شازیہ سے ہو رہی تھیں۔ سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ کافی سمجھدار ہو گیا تھا۔ وہ ہر بار شازیہ کو طرح دے جاتا۔ سلمان غنی نے اسے ایک دوبار ٹوکا کہ وہ شازیہ کے ساتھ گھومتے نہ جایا کرے لیکن شازیہ کی موجودگی میں اسے اپنے حواس بجا رکھنے میں کامیابی نہ ہوئی۔

ایک روز اسے مجتبیٰ حامد کا خط ملا۔ جس میں اس نے تحریر کیا تھا کہ اللہ نے اسے ایک خوبصورت بھانجہ عطا کیا ہے اور یہ اس کے بھانجہ کی مہربانی تھی کہ طلحہ کئی ماہ سے گھر میں ہی رہ رہی تھی ۔۔۔ اس نے بھی شازیہ کے متعلق لکھا تھا کہ مجھے شک ہے وہ یہودی النسل شامی دوشیزہ ہے اور اس کا تعلق صیہونیت سے ہے ۔۔۔ اس لئے اسے زیادہ اہمیت نہ دی جائے اور محتاط رہا جائے ۔۔۔

جذبات کی رو میں بہا ہوا نوجوان احمد اپنے بہنوئی کے ان شبہات کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ شازیہ نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کی تھی ۔۔۔ عمر اور تعلیم کی نسبت سے شازیہ بہرحال احمد سے کافی آگے تھی ۔۔۔ احمد جب فلسطین کا ذکر کرتا تو شازیہ اسے کہتی ۔۔ "چھوڑو احمد ۔۔ مفت کے دکھ مول نہ لو ۔۔ تم قانون کی ڈگری حاصل کر و ۔۔ اور چین کی بنسی بجاؤ ۔۔ قاہرہ میں بے شمار ترقی کے مواقع موجود ہیں"

احمد کو شازیہ کی یہی ایک بات ناگوار گذرتی تھی ۔۔ وہ اپنی صلاحیتیں اپنے عرب بھائیوں کے لئے وقف کر دینا چاہتا۔

شازیہ اسے نیل کے کنارے لے جاتی ـــ کشتی میں سیر کراتی ـــ اپنے بال کھول کر لہرا دیتی ـــ ہوا میں اڑتے ہوئے بالوں کے درمیان اس کا حسن بے حد پرکشش ہو جاتا ـــ کبھی کبھی وہ غسل کا لباس روزمرہ کے لباس کے نیچے پہن کر آ جاتی اور احمد کے سامنے ہی پانی میں اتر جاتی۔ کناروں کے ساتھ ساتھ تیرتی اور احمد اس کے سفید و شفاف جسم کو نیلگوں پانی میں ہچکولے کھاتا دیکھتا رہتا ـــ جب وہ باہر نکلنا چاہتی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیتا۔ اس لمحے اس کے جسم میں ان جانی لہریں سی اٹھتیں اور وہ اس کا ہاتھ کافی دیر تک تھامے رہتا۔

ایک ایسی ہی حسین شام تھی۔ شازیہ نے ایک غیر ملکی ریسٹوران سے احمد کو کھانا کھلایا ـــ اسکندریہ جانے والی سڑک پہ اپنی ایک دوست کے گھر لے گئی ـــ اندر بیٹھے وہ باتیں کرتے رہے۔ رات آ گئی ـــ ہر طرف جگمگ روشنیاں پھیل گئیں۔ احمد نے چلنے کو کہا تو شازیہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"بڑے سنگدل ہو" شازیہ نے انداز سے کہا۔

"کیسے ـــ؟"

"ایسے ہی ـــ مجھے ملتے ہو ـــ میرے ساتھ گھومتے ہو ـــ میرا جسم چھوتے ہو ـــ میٹھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہو ـــ لیکن کبھی تم نے یہ نہیں کہا ـــ آؤ شازیہ ـــ ہم ایک رات اکٹھے گزاریں"

احمد اس بے باکانہ گفتگو سے جھینپ گیا۔

"شازیہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو"

"جیسی ایک عورت اپنے کسی مرد دوست سے کرتی ہے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر قریب پڑے ٹیبل لیمپ کا بٹن دبایا۔ کمرہ میں گہری سبز روشنی پھیل گئی ـــ پھر شازیہ نے ایک ایک کر کے دوسری روشنیاں بجھا دیں۔ ہر چیز سبز روشنی میں ڈوب گئی ـــ اس کی دوست کمرہ میں آئی۔ جانے اس کا نام کیا تھا اس نے انتہائی باریک لباس زیب تن کر رکھا تھا ـــ سبز روشنی میں وہ یوں لگ رہی تھی جیسے سفید ہاتھی دانت کے مجسمہ پر کسی نے ہلکا سا ریشمی غلاف چڑھا دیا ہو ـــ

اس نے طشتری میں دو گلاس ایک میٹھے مشروب سے بھر رکھے تھے۔ اصرار کر کے اس نے احمد اور شازیہ کو پلایا ـــ اس مشروب میں ایسی تیز دوا ملائی گئی تھی کہ احمد بے بس ہو گیا ـــ اسے بالکل یاد نہ رہا کہ وہ کون ہے ـــ کہاں ہے ـــ اس نے شازیہ کی طرف ایسی حریص نظروں سے دیکھا کہ شازیہ جیسی شاطر عورت بھی کانپ کر رہ گئی ـــ تاہم اس نے احمد کو باتوں میں لگا دیا ـــ اور اسے کہا۔ دیکھو بے تاب نہیں ہوا کرتے ـــ ایسی راتیں اور بھی آئیں گی ـــ بلکہ اس سے بہتر ـــ وہ اٹھی اور اس نے رقص کرنا شروع کر دیا ـــ

رقص کے دوران وہ اپنے کپڑے اتارتی جاتی۔ جسم کو ایک بل دیتی تو رومال نیچے گر جاتا ـــ دوسرا بل دیتی تو سکرٹ کے بٹن کھل جاتے۔ تیسرے سے سب کچھ نیچے آ گرتا ـــ یہاں تک کہ اس کے جسم پہ انتہائی مختصر کپڑے رہ گئے جس سے مشکل سے ستر پوشی ہوتی تھی ـــ اس نے مصر کا مخصوص بیلی

ناچ ناچا۔ اس نے اپنی ناف کو یوں نچایا کہ احمد کی نظریں اس پر جم کر رہ گئیں۔ اس نے آگے بڑھ کر شازیہ کو پکڑنا چاہا تو شازیہ نے اس کے چانٹے رسید کر دیئے ۔ احمد پھر بھی اس کے پیچھے بھاگتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے اس کو اس کے مختصر سے لباس سے پکڑ لیا۔ اب شازیہ نے اسے گالیاں بھی دیں اور اس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ احمد یہ سب کچھ برداشت کر گیا۔ شازیہ بھاگ کر دوسرے کمرہ میں چلی گئی ۔

اس کی دوست دوسرے کمرہ میں تصاویر کا ایک البم دیکھ رہی تھی۔ شازیہ کو دیکھ کر کہنے لگی ۔

"سناؤ"

"کیا سناؤں ۔ کوئی خاص نوجوان نہیں ۔ بڑی جلدی بہک گیا ہے۔ کام آئے گا ۔ جاؤ اسے بہلاؤ"

اس کی دوست اٹھ کر احمد کے پاس آئی ۔ احمد ابھی تک شازیہ شازیہ پکار رہا تھا اور قالین پر اوندھے منہ گرا تھا۔ اس کے چہرے پہ تھوک ابھی تک پڑا تھا۔ شازیہ کی دوست نے اسے اٹھایا۔ منہ ہاتھ دھلایا۔ اور تسلی دی کہ شازیہ اسی کی ہے اور اسے ہی مل کر رہے گی۔ اسی کی خاطر وہ ناچ رہی تھی ۔ اور اسے یوں بے تابی نہیں دکھانی چاہیئے تھی ۔ جب وہ یہ باتیں احمد کو سمجھا رہی تھی تو اس کے قریب بھی ہوتی جاتی تھی ۔ احمد نے اسے بھی پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

"میں تمہاری دوست کی دوست ہوں ۔ مجھے تو ایسی نظروں سے نہ دیکھو"

ساتھ میں اس نے اور زیادہ اپنائیت کی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ احمد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تو وہ تقریباً اس پہ گر کر رہ گئی۔ جسم کے ساتھ جسم ٹکراتے ہی احمد اپنے بس میں نہ رہا۔ وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹنے لگا۔ خود اس نے احمد کا منہ چوم لیا اور کہا "شریر لڑکوں سی باتیں مت کرو" اسی لمحہ شازیہ اندر آگئی۔

فطرت کے ہاتھوں اس کا تراشا ہوا جسم عریانی کی آخری حدود کو چھو رہا تھا۔ احمد اسے دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ کمرہ کی سبز فضا کو شازیہ نے بڑھ کر تاریکی میں تبدیل کر دیا۔ احمد کافی دیر تک اکیلا قالین پر پڑا رہا۔ پھر اس نے ٹٹول کر روشنی کی تو کمرہ میں وہ اکیلا ہی تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اٹھا۔ کمرہ سے باہر نکلا۔ دوسرے کمروں میں جھانکا۔ دونوں سہیلیوں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ وہ باہر کے دروازے کی سمت بڑھا۔ گلیوں سے ہوتا ہوا شاہراہ بیروت پہ آگیا۔ نیل کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ جو احمد کو بڑی بھلی لگی۔ وہ اپنے متعلق سوچتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

باقی رات اس نے بستر پر کروٹیں بدلتے کاٹ ڈالی۔ اسے کیا ہو گیا تھا، اس نے اپنے آپ کو ذلیل کیوں کرایا۔ لیکن وہ گرم، جوان اور تراشا ہوا بدن۔ اسے شدت سے شازیہ کو اپنے بازوؤں میں لینے کی خواہش محسوس ہوئی۔

جوں جوں احمد اس رات کے واقعہ کے متعلق سوچتا اس کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس رات کی ملاقات کے کئی پہلو تھے۔ شنازیہ خود اسے شاہراہ بیروت لے گئی تھی، خود ایسا ماحول تیار کیا جس میں وہ بہک سکے۔ اپنے جسم کی عریانی سے اس کے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ پھر جب اس نے دست شوق دراز کیا تو اسے بے حد ذلیل کیا گیا۔ وہ سوچتا کہ اسے ذلیل کیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی دوسرا پہلو سامنے آ جاتا ہے۔ اگر اس کا مقصد ذلیل کرنا ہی تھا تو پھر اس حد تک پہنچی ہی کیوں ــــ ہو سکتا ہے وہ رقص اور عریانی کو تو معیوب نہ سمجھتی ہو اور میری وارفتگی نے اسے طیش دلا دیا ہو ــــ واقعی اسے میرے ساتھ محبت ہے ــــ دوسرے کمرہ میں جا کر اس نے اپنی دوست کو بھی تو میری دلجوئی کے لئے بھیجا تھا ــــ پھر خود آئی تھی ــــ مگر ــــ مگر ــــ اس نے سوچا ــــ مجھے کیا ہو گیا تھا ــــ اب اگر میرے سامنے شنازیہ بالکل ہی عریاں کھڑی ہو تو میرے جذبات میں تلاطم پیدا نہ ہو ــــ

اس نے اس رات کی یاد کی ایک ایک کڑی جوڑی ۔ سے جو مشروب پلایا گیا تھا اس میں کچھ تھا ۔ لیکن اگر اس میں کچھ تھا تو یہ عجیب بات ہے کہ نشہ میں ہونے کے باوجود اسے ہر واقعہ اور ہر بات اچھی طرح یاد ہے ۔

"کیا مجھے سبز روشنی میں گھلی ملی عریانی نے بہکا دیا تھا ۔" اس نے ذہن پہ زور دیا ۔ اور اسے احساس ہوا کہ ہر بات ، ہر نظارہ ، اس کے ذہن میں محفوظ ہے ۔ شازیہ کے رقص کرتے تھرکتے ہوئے جسم کی یاد سے ہی اس کے کانوں کی لوئیں تپنے لگیں ۔ وہ خود اس کی تلاش میں چل نکلا ۔ اس واقعہ کے بعد شازیہ اسے نہیں ملی تھی ۔ اسے طمانچہ اور تھوک بھی یاد تھا لیکن اس نے دل کو تسلی دی کہ اس کی وارفتگی کا یہی علاج تھا ۔ غصہ حرام ہوتا ہے ۔ اس میں شازیہ کا کیا قصور ۔

وہ شازیہ کو تلاش کرتا رہا ۔ وہ شاہراہ بیروت والے مکان پہ بھی گیا ۔ اسے شازیہ کی دوست ملی ۔ اس نے احمد کو بتایا کہ شازیہ تو اس کے لئے بے حد بے چین ہے ۔ لیکن چونکہ اس کے جذبات کی رسوائی سفلی ارادہ سے کی گئی تھی اس لئے وہ اسے ملنا نہیں چاہتی ۔ احمد نے بڑی آہ وزاری کی ۔ لیکن شازیہ سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی ۔

جوں جوں شازیہ سے ملنے میں دیر ہوتی رہی توں توں جذبات کا الاؤ بڑھتا چلا گیا ۔ احمد پڑھنے بیٹھتا تو کتاب کے صفحات پر شازیہ ناچنے لگتی اور پھر آہستہ آہستہ اس کے کپڑے اترجاتے ۔ عریاں سے عریاں تر ہوتی جاتی ۔ احمد کی پیشانی پہ پسینے کے قطرے نمودار ہو جاتے ۔ وہ پریشان ہو جاتا ۔

اس کے دل و دماغ پر۔ شازیہ بری طرح چھائی ہوئی تھی۔

ایک روز جب وہ پھر شازیہ کی دوست کے پاس گیا تو اس نے بتایا کہ شازیہ تو اس کا نام لے لے کر جی رہی ہے لیکن وہ اس سے ملنے سے مجبور ہے ۔۔۔ ابوظفر نے اسے قصرِ حجاب میں قید کر رکھا ہے۔

"ابوظفر کون ہے؟"

"ابوظفر تحریکِ آزادیٔ فلسطین کا بدترین دشمن ہے ۔۔۔ شازیہ نے مجھے کہا تھا کہ میں آپ کو بتا دوں اور اگر آپ اسے بچا سکتے ہیں تو بچا لیں۔"

احمد کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک گئیں ۔۔۔ اس کی محبوبہ کو ایک دشمن نے حبسِ بے جا میں رکھا ہے اور وہ یوں بے سبب شازیہ کو بدگمانیوں کا ہدف بنا رہا ہے۔ اس نے شازیہ کی دوست سے پوچھا۔

"مجھے کیا کرنا چاہیئے ۔۔۔ میں شازیہ کو قید میں نہیں رہنے دوں گا۔"

"ابوظفر صرف مر کر ہی اس کا پیچھا چھوڑ سکتا ہے۔"

"تو میں اسے مار دوں گا ۔۔۔ قتل کر دوں گا۔"

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ ایسا مت کہو ۔۔۔ میں آج شازیہ سے ملوں گی اور کل تمہاری ملاقات کا بندوبست کر دوں گی۔"

اگلے روز شازیہ قاہرہ کے بین الاقوامی ہوٹل میں احمد سے ملی۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا عربی لباس پہن رکھا تھا۔ چہرہ پہ کسی قسم کی شوخی نہ تھی حزن آمیز یاسیت سے بھرا ہوا چہرہ لئے وہ احمد کے سامنے بیٹھی رہی ۔۔۔

احمد اسے دیکھتا رہا اور کہتا رہا میں تمہارے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے یوں نہ چھوڑ دو۔ تم پہلی خاتون ہو جسے میں نے قریب سے دیکھا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ان چند باقی باتوں کا جواب شازیہ نے صرف اس قدر دیا۔

"میں جانتی ہوں کہ اس وقت بھی ملاقات کرتے وقت اسرائیلی جاسوس مجھے دیکھ رہے ہیں۔ وہ سب کچھ ابوظفر کو بتا دیں گے۔ اور مجھ پر تشدد کیا جائے گا۔ اگر تمہاری محبت سچی ہے تو آج ابوظفر کو ٹھکانے لگا دو۔ وہ آج شام سامری پل پر کچھ جاسوسوں سے ملنے جائے گا۔"

احمد کو فیصلہ کرنے میں قطعی دیر نہ لگی کہ وہ ضرور ابوظفر کو ختم کر دے گا۔ ایک رقیب روسیاہ ختم ہو گا۔ دوسرے دشمن ملک وزیر۔ [illegible] مصیبت کہ وہ ابوظفر کو پہچانتا نہیں تھا۔ اسے شازیہ کی سہیلی نے ابوظفر کا فوٹو دیا۔ یہ ایک نوجوان کا فوٹو تھا۔ جس کے سر پر عرب عمامہ تھا۔ جبہ اوڑھے ہوئے تھا۔ داڑھی مخروطی شکل میں صرف ٹھوڑی کے نیچے تھی۔ مونچھوں کے بل ہونٹوں کے گوشوں سے آ کر اوپر کو اٹھ گئے تھے۔ اس کی شکل کافی رعب دار تھی۔

جب احمد شازیہ سے رخصت ہونے لگا تو اس نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر اپنے قریب کھینچتے ہوئے اس نے زور سے احمد کے رخساروں کا بوسہ لیا۔ اور کہا تمہارے واپس آنے پر ہم مصر سے نکل چلیں گے۔"

احمد [illegible] دیا۔

وہ سرِشام ہی سامری پل پر پہنچ گیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا۔۔۔ کبھی اس کنارے اور کبھی اس کنارے تک گھومتا رہا۔۔۔ کبھی وہ تصویر نکال کر دیکھتا اور کبھی گھڑی پہ نظر ڈالتا۔ کبھی سورج کے ڈھلتے سایوں کو گھورنے لگتا۔

جوں ہی ذرا سائے لمبے ہوئے تو اسے ایک طرف سے یورپی لباس پہنے پل کی طرف بڑھتا ہوا۔ ایک آدمی نظر آیا۔ احمد نے فوٹو دیکھا اور نو وارد کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لباس کے اختلاف کے باوجود احمد کو اسے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔۔۔ وہ ابوظفر ہی تھا۔ احمد اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ جب وہ پل کے وسط میں پہنچا تو احمد نے بڑھ کر اس کو پکڑنے کا ارادہ کیا۔ اس نے تیز تیز قدم اٹھائے۔ اور ابوظفر کے قریب پہنچ گیا۔ زیرِ جامہ سے خنجر نکالا اور ابوظفر پر حملہ آور ہوا۔

ابھی لہرایا ہوا خنجر ہوا میں ہی تھا کہ ابوظفر تیزی سے نیچے جھک گیا۔ زور سے نیچے آتا ہوا ہاتھ احمد کو جب اچانک روکنا پڑا تو وہ اپنے جسم کا توازن قائم نہ رکھ سکا۔ ابوظفر نے پلٹ کر اسے ایک ایسا گھونسا لگایا کہ احمد کے ہاتھ سے خنجر چھوٹ کر دور پل کے ایک کنارے پہ جا گرا۔ احمد اسے اٹھانے کو لپکا تو دوڑتے ہوئے ابوظفر نے احمد کو پکڑ لیا۔ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

"بیوقوف۔۔۔ احمد تم ہو۔"

احمد اپنا نام سنکر حیران رہ گیا۔۔۔ اس نے لڑنے کا ارادہ ترک کر دیا اور پل سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔۔۔ اس نے ابوظفر کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔ ابوظفر نے اس کی متجسسانہ نظروں کو زیادہ انتظار نہیں کرنے

دیا۔ اس نے کہا مجھے پہچانو ــــ میں سلمان غنی ہوں۔"
سلمان غنی کا نام سنکر احمد کی اوسان کی قوتیں بالکل جواب دے گئیں ــــ
سلمان غنی نے پھر کہا۔
"شازیہ نے بھی وہی کیا جو دوسری یہودی لڑکیاں کر رہی ہیں، انہوں نے اسی طرح ابوزہیر، خالد حسینی اور علامہ شہیر کو قتل کروایا ہے۔ مجھے بھی مدت سے خطرہ کا احساس تھا لیکن یہ معلوم نہیں تھا اس کام کے لئے شازیہ نے تمہیں چنا ہے ــــ جانتے ہو اگر میں قتل ہو جاتا اور تم گرفتار نہ کئے جا سکتے تو یہ مشہور کیا جاتا، کہ سلمان غنی کو طلحہ کی وجہ سے قتل کیا گیا ہے۔"
احمد سلمان غنی کی باتیں سن کر حیران رہ گیا ــــ کیا شازیہ اور اس کی دوست واقعی یہودی ایجنٹ ہیں اور ان کا تعلق صیہونیت سے ہے ــــ اس نے سوچا اور سلمان غنی سے کہا۔
"انہوں نے تو مجھے بتایا تھا کہ ابوظفر یہودیوں کا ایجنٹ ہے ــــ اور عالم اسلام کے خلاف سازشیں کرتا ہے۔"
"انہوں نے تمہاری نوعمری اور جذباتیت سے کام لیا ہے۔ ایسا کام تمہاری عمر کے نوجوانوں ہی سے لیا جا سکتا ہے ــــ وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ سلمان غنی کبھی ابوظفر کا بہروپ بھر کر مجاہدین کو اسلحہ مہیا کرتا ہے اور کبھی ابن مروان بن کر سرحد عبور کرتا ہے ــــ جو جنگ ہم لڑ رہے ہیں ــــ اس میں ہر فرد مجاہد اور ہر رہنما کے مختلف روپ ہیں ــــ بہرکیف اب تم جاؤ ــــ میں خود شازیہ سے نمٹ لوں گا۔"

احمد منہ لٹکائے سامری پل سے قاہرہ کی طرف لوٹا ۔ اس میں جانے کیسے ہمت اور سمجھ بوجھ کا طوفان امڈ آیا۔ وہ سیدھا شاہراہ بیروت پر شازیہ کی دوست کے مکان پر گیا ۔ وہ چپکے سے گھر میں دیوار پھاند کر داخل ہوا ۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ اسی مخصوص کمرہ میں سبز روشنی جل رہی تھی ۔ ہلکی ہلکی موسیقی کے زیر و بم میں شازیہ کی دوست محو رقص تھی۔ اسی مخصوص صوفہ پر ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ جس کی آنکھوں میں کیف و سرور کی کیفیت تھی، گہری سبز روشنی میں دیوان پہ نیم عریاں لباس میں شازیہ لیٹی تھی ۔ اس کے جسم پر سوائے پتلے سے گون کے اور کچھ نہ تھا۔ ڈھکی ہوئی عریانی سے اس ... بدن میں اس قدر جنسی کشش تھی کہ احمد ایک لحظہ کے لئے پھر گھبرا گیا اور اس کے ذہن نے سوچا، ہو سکتا ہے سلمان غنی بھی دوہری شخصیت کا حامل ہو ۔ ایک طرف مجتبیٰ حامد کا دوست اور دوسری طرف دشمنوں کا ... ۔ لیکن مجتبیٰ حامد کے مضبوط کردار، مفتیٔ اعظم سے براہ راست تعلق کی وجہ سے اسے اپنا خیال باطل معلوم ہوا۔

اس نے دروازہ پہ دستک دی۔ رقص تھم گیا ۔ روشنی بجھ گئی ۔ اور شازیہ عریانی کو نمایاں کرنے والے گون میں دروازہ پر آئی۔

"شازیہ! میں اپنے مشن میں کامیاب لوٹا ہوں ۔ میں تم سے اسی وقت شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا۔"

"بے وقوف نہ بنو ۔ اندر میری دوست کے ملنے والے ایک غیر ملکی صحافی بیٹھے ہیں ۔ آہستہ بات کرو۔"

"اندر بیٹھے ہوئے صحافی کہیں تمہارے دوست تو نہیں ــــ تم اس لباس میں وہاں کیا کر رہی ہو؟"

"یہودی تحریکوں کو دبانے کے لئے کبھی کبھی ایسا بھی کرنا پڑتا ہے۔"

"میں ایسی قوم پرستی پہ لعنت بھیجتا ہوں۔ جہاں عورتوں کو اپنے جسم سے تلوار و بندوق کا کام لینا پڑے۔"

"تم اس وقت جاؤ ــــ میں کل تمہیں ملوں گی۔"

احمد نے مضبوطی سے شازیہ کی کلائی پکڑ لی اور اسے اسی لباس میں گھسیٹتا ہوا صدر دروازہ تک لے آیا ــــ شازیہ نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا تو اس نے اسے کہا۔

"تم اگر شور کرو گی تو یاد رکھو میں خنجر تمہارے پیٹ میں بھونک دوں گا تم بڑی حسین ناگن ہو، جس کے جسم سے نظر پھسل پھسل جاتی ہے ــــ میں تمہاری حقیقت مجتبیٰ حامد کے خطوط اور سلمان غنی کے کہنے کے باوجود نہ پہچان سکا ــــ لیکن اب میں تمہیں پہچان چکا ہوں ــــ تم یہودی تحریکوں کو دبانے کے لئے نوجوان عربوں میں جنسی ہیجان برپا نہیں کرتی بلکہ تاریخی قلعہ الموت کے برگ حشیش کی طرح ان کو مدہوش کر کے اور وصل کی امید دلا کر تحریک آزادی فلسطین کے رہنماؤں کو قتل کروا رہی ہو ــــ شکر ہے کہ میں تمہارا آلۂ کار نہیں بن سکا۔ میں تمہیں خود قتل نہیں کروں گا لیکن میں تمہیں ننگا کر کے ضرور چھوڑوں گا ــــ ننگے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہارا یہ گون اتار دوں گا، بلکہ تمہارے حالات سے اور تمہاری کارروائیوں سے پردہ

اٹھاؤں گا۔ مصر کے نوجوان جب تمہیں پہچانیں گے تو اسی طرح تمہارے منہ پر طمانچے لگائیں گے اور تھوکیں گے جس طرح تم نے اپنی جنسی کشش کا امتحان لینے کے لئے مجھے طمانچے لگائے تھے اور میرے منہ پر تھوکا تھا؟

شازیہ کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا۔

"تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے"

"مجھے غلط فہمی ہوئی نہیں۔ بلکہ میری غلط فہمی دور ہوئی ہے۔ کیا تم نہیں جانتی تھی کہ مفتی اعظم کا معتمد خاص سلمان غنی ہی ابوظفر تھا"

شازیہ اب بھی خاموش تھی۔

احمد نے شازیہ کو بالوں سے پکڑا اور اس کا منہ اپنے منہ کے قریب لا کر اس پر تھوک دیا۔ شازیہ خاموش رہی۔ احمد نے جھٹکے سے اس کے بال چھوڑ دیئے، اور خود اپنے گھر کی سمت ہو لیا۔

نصف رات گذری ہوگی کہ احمد کے گھر کا دروازہ کھٹکا۔ احمد اٹھ کر دروازہ تک آیا۔ اور پوچھا کون ہے؟

"میں ہوں سلمان غنی"

احمد نے آواز پہچان لی اور دروازہ کھول دیا۔

سلمان نے اندر گھستے ہی کہا۔

"مجھے تمہارا فکر تھا۔ اب بھی تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ بادا کوئی آفت آجائے"

احمد چپ چاپ سلمان کے ساتھ ہو لیا۔

صبح جامعہ میں اسے شازیہ نظر نہیں آئی ۔۔۔ اور پھر کبھی بھی نظر نہیں آئی۔
سلمان نے اسے بتایا کہ اپنا راز فاش ہو جانے کے ڈر سے صرف
شازیہ ہی نہیں اور بھی کئی لڑکیاں یورپ کی راہ اسرائیل پہنچ گئی ہیں۔

احمد کو اس بات کا بڑا تجسس تھا کہ وہ صحافی کون تھا جو شازیہ سے
ملاقات کی آخری رات ان دونوں یہودی ایجنٹوں کا رقص دیکھ رہا تھا۔

احمد کے علاوہ تحریک آزادی سے تعلق رکھنے والے کچھ اور رہنما بھی
حیران تھے۔ کہ عرب رہنماؤں اور مخیر ہستیوں کے قتل کے واقعات میں کمی
کیوں آگئی ہے ؟

لیکن عام عرب نہیں جانتے تھے کہ سب فتنہ پرداز اب اسرائیل میں
اکٹھے ہو رہے ہیں جہاں صیہونیت کو ایک پناہ گاہ مل چکی ہے۔ انتہائی سرعت
سے یہودیوں نے اسرائیل میں ماضی کے تاریخی مقامات پر نئی زندگی کا آغاز
کر دیا ہے، وادی ایلہ میں یمن سے آنے والے یہودیوں کو آباد کیا جا رہا ہے۔ یہ
وہ مقام ہے جہاں داؤد نے جالوت کو قتل کیا تھا۔

بحر مردار کے ساحل پر مسادا کے نزدیک یہودا کے بیابان میں ایک یوتھ
ہوسٹل تعمیر کیا گیا ہے کہ ہر طبقہ خیال کے لڑکے لڑکیاں وہاں اکٹھے ہو سکیں۔
اسی مقام پر ۷۱ ء میں سلطنت یہودیہ کی فوجوں نے رومیوں سے آخری جنگ
لڑی تھی۔

بیر شیبہ جہاں حضرت ابراہیم نے تمرس کا پودا اپنے ہاتھ سے لگایا تھا۔۔
اب اسرائیل کے صحرائی صوبہ نقب کا دارالحکومت ہے ۔۔۔ اور وہاں ہر جگہ

بائبل کے عہد نامہ عتیق پر بحث و مذاکرات جاری رہتے ہیں۔ اور اسرائیل نئی نسل کو بڑے زور شور سے ایک جنگجو نسل بنانے کی سعی کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ویزمین اور بن گوریال ایک وسیع تر جنگ کے لئے تیاریوں میں مشغول ہیں۔

سازشی یہودی اب وہاں اکٹھے ہو رہے تھے۔

عربوں نے فلسطین میں امن قائم کرنے کا جو دعویٰ کیا تھا۔ اسے سچ کر دکھایا۔ مصر، شام، عراق، اردن، لبنان اور سعودی عرب کی فوجیں فلسطین میں داخل ہو گئیں۔ شام اور مصر سے تو اخوان مجاہدین کئی روز سے پہلے ہی فلسطین میں مختلف مقامات پر کارنامے سرانجام دے رہے تھے۔ مصر سے ایک اور کھیپ اخوان مجاہدین کی اردن کی راہ نئی قائم شدہ اسرائیل کی مملکت میں ایک معرکہ کے لئے داخل ہونے کے لئے روانہ ہوئی۔ اس کھیپ میں احمد بھی تھا جو عمان میں چند روز اپنی بہن اور بھانجے کو دیکھنے کے لئے رکا۔ مجتبیٰ حامد حسب سابق کسی مقام پر اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔ احمد اس دستہ میں جس نوجوان سے سب سے زیادہ متاثر تھا وہ ان کے دستہ کا قائد ابو عمار تھا۔

ابو عمار کی عمر اس وقت بیس اکیس کے لگ بھگ ہو گی وہ القدس میں پیدا ہوا تھا۔ سولہ سترہ برس کا تھا کہ اسرائیلیوں کے خلاف القدس کے محاذ پر

عبدالقادر الحسینی کی قیادت میں پہلی بار حصہ لیا۔ وہ اس وقت طالب علم تھا۔ متواتر تین سال اس نے اسرائیلیوں کے خلاف دادِ شجاعت دی۔ اسرائیل کی ریاست قائم ہوئی تو دل برداشتہ ہوکر دیگر عرب مہاجرین کے ساتھ ہجرت کر گیا۔ اور ادھوری تعلیم مکمل کرنے کے لئے جامعہ قاہرہ میں داخلہ لے لیا۔ کبھی فراغت ہوتی یا ضرورت ہوتی تو چند نوجوانوں کو ساتھ لے کر اسرائیل میں کسی ٹھکانے پر حملہ کرتا اور ہمیشہ کامیاب واپس لوٹتا۔

جملہ عرب فوجوں کی کمان والیٔ اردن شاہ عبدالقادر کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن بدقسمتی تھی کہ عرب افواج کی متحدہ کما... عمل میں نہ آسکی۔ عرب فوجوں میں نہ تو اشتراک عمل تھا اور نہ ہی نظم وضبط ... وہ کوئی موثر کارروائی کرنے کا منصو. بھی نہ بنا سکے۔ مصری فوجیں تعداد اور برتری کے لحاظ سے سب سے زیادہ تھیں۔ بالکل ایسی ہی بات تھی جیسے فرعون نے حضرت سلیمان کے وقت اسرائیل پر فوج کشی کی تھی۔ ان کا انجام اب بھی وہی ہوا جو ہزار ہا سال پیشتر ہوا تھا۔ اردن کی فوجوں نے میدان کارزار میں زیادہ کارنامے انجام دیئے۔ میجر ایڈگرا وبلینس نے کہا۔

"اردن واحد ملک تھا جس نے اپنے آپ کو دل وجان سے اور مکمل طور پر جنگ کے حوالے کر دیا تھا۔"

اردن کی کل فوج ساڑھے چار ہزار تھی اور اس کی تربیت بھی متحدہ فلسطین میں برطانوی افواج کی امدادی فوج کے طور پر کی گئی تھی۔ آزاد ہونے کے بعد ان افواج کو اپنے بل بوتے پر لڑنا پڑا۔ وہ بڑھتی بڑھتی جبرون تک

جا پہنچیں اور اسے قبضہ میں کرنے کے بعد بیت لحم میں مصری فوجوں سے جا ملیں اور بیت المقدس جانے والی سڑک کو کاٹ دیا تھا۔

احمد نے حبیب طلحہ کو بتایا کہ ابو عمار ان کے راستہ کا لیڈر ہے تو اس کی بہن نے ابو عمار کی بڑی تعریف کی۔ اس نے احمد کی اور اس کے دستہ کی کامیابی کی دعا کی۔ اور پوچھا۔

"ابو عمار کا کیا پروگرام ہے؟"

"وہ واپس جامعہ قاہرہ میں جائے گا۔ مجھے خود بھی واپس پہنچنا ہے۔"

"اس کا کہاں تک جانے کا پروگرام ہے؟"

"صحرائے نجف میں کسی مقام پر۔"

ایسی ہی مختلف باتیں کرنے کے بعد احمد واپس اپنے دستہ میں آ گیا۔ اس کی زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ایک ایسی مہم میں حصہ لے رہا ہے جس کا مقصد حملہ تھا۔ ویسے تو اس نے برطانوی حکومت کی ملازمت سے انکار کر کے اور شازیہ کے چنگل سے نکل کر بھی اپنے ضمیر کو روشن رکھا تھا لیکن اب ایک اطمینان کی لہر اس کے قلب و جگر میں دوڑ رہی تھی۔ وہ ایک اہم کام پر جا رہا تھا۔

سرحد پار کرنے کے بعد ابو عمار نے اپنے دوستوں کو تاریکی میں خاموش بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموش بیٹھ گئے تو چند خچروں والے ابو عمار کے مخصوص اشارے سنکر آ گئے۔ مجاہدین ان خچروں پر سوار ہوئے۔ خچروں کو لانے والے صحرائی عرب تھے۔ انہیں زیادہ دور نہیں جانا تھا۔ ایک مقام پر جا کر وہ رک گئے۔

سامنے روشنیاں ہی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

اب ابوعمار نے بتایا کہ یہ وہ کیمپ ہے جہاں دریائے اردن کے پانی سے صحرائے نجف میں آبیاری کے یہودی [illegible] تکمیل کے لئے بڑی بڑی مشینری اکٹھی کی گئی ہے۔ بہت سے غیر ملکی انجینئر بھی یہاں موجود ہیں۔ لیکن ہمیں صرف مشینری کو نشانہ بنانا ہے۔

ریت پہ چلتے چلتے وہ ایک خاردار تار کے احاطہ میں پہنچے۔ دو یہودی سپاہی اندھیرے میں احاطہ کے اندر پڑے پٹرول کے ذخیرہ کی حفاظت کر رہے تھے۔ دو مجاہدین خاموشی سے سپاہیوں تک پہنچے۔ پیشتر اس کے کہ وہ اپنی رائفلوں کو سنبھالتے یا صورت حال سے واقف ہوتے، انہیں میٹھی نیند سلا دیا گیا۔

ذخیرہ سے بہت سے کنستر اٹھا اٹھا کر مختلف مقامات پر رکھے گئے۔ پھر ان کے ساتھ چھٹانک چھٹانک وزن کے مخصوص انداز کے بنے ہوئے بم باندھے گئے، ان بموں کو برقی تاروں سے جوڑنا شروع کیا۔ انجینئری کی تعلیم ادھوری ہونے کے باوجود ابوعمار نے تاروں کو بڑی احتیاط سے جوڑا ــــ مختلف مجاہدین کو اس نے کنستر معہ بم دیوہیکل مشینریوں کے نیچے رکھنے کو کہا۔ پٹرول کے ذخیرہ میں بم کو احمد نے ایک ڈرم کے ساتھ باندھا ــــ پھر وہ سب خچروں پر سوار ہو گئے۔

اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے وہ خچروں پر سوار ہوئے تھے۔ انہوں نے خچروں کو فارغ کر دیا۔ خود انہوں نے خاموشی سے سرحد پار کی۔

ابھی چند قدم ہی چلے ہوں گے کہ صحرا دھماکوں سے گونج اٹھا۔ پٹرول کے جلنے سے اس قدر شعلے بلند ہوئے کہ دور دور تک صحرا روشن ہو گیا۔

ابو عمار نے ساتھیوں کو بتایا کہ تاروں کو جوڑنے کے بعد چھ مختلف جوڑوں سے میں نے چھ ٹائم بم باندھے تھے۔ ان ٹائم بموں میں دو دو منٹ کا وقفہ رکھا تھا تاکہ اگر ایک کام نہ کرے تو دوسرا سہی۔ دوسرا نہ کرے تو تیسرا سہی، جب ایک بھی ٹائم بم کام کرتا تو اس کے ساتھ بندھا ہوا ایک اسپرنگ ایک ایسی تار کو جھٹکا دیتا جس سے چھ سو وولٹ کی کرنٹ تاروں میں دوڑ جاتی اور باقی بم ایک ہی وقت پر پھٹ کر پٹرول کو آگ لگا دیتے۔ ہمارا مشن کامیاب رہا ہے اور پہلے ہی بم نے ٹھیک کام کیا ہے۔

احمد بڑا حیران ہوا۔ اسے ایک لمحہ کے لئے خیال آیا کہ قانون پڑھنے کی بجائے اس نے انجینئرنگ میں داخلہ لیا ہوتا تو کیسا اچھا ہوتا۔

احمد کی بڑی خواہش تھی کہ وہ یروشلم جائے۔ اپنے اس گھر کو دیکھے جس سے وہ ۱۹۳۶ء میں پانچ برس کی عمر میں بچھڑا تھا۔ اس کی بہن نے ہیرود گیٹ میں واقع اپنے مکان کی یاد ہمیشہ احمد کے ذہن میں تازہ رکھی ـــ مکان کی یاد کے ساتھ ہی اسے اپنی وہ بہن یاد آئی جو یہودی جارحیت کا شکار ہوئی تھی ـــ ماں یاد آئی ـــ باپ یاد آیا ـــ اسے ان کے چہرے یاد نہیں تھے۔ بچپن کی چند باتیں خواب کی طرح یاد تھیں، پھر بھی اسے ان ہستیوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ جو اگرچہ اب موجود نہیں تھیں لیکن اس کی زندگی ان سے وابستہ ضرور رہی تھی۔

اس نے ارادہ کیا کہ وہ یروشلم جائے گا۔ اور ضرور جائے گا۔
عمان سے جب اس کے دوسرے ساتھی مصر روانہ ہو رہے تھے وہ ان سے علیحدہ ہو گیا۔ اپنی بہن کے گھر گیا۔ اپنے مشن کی کامیابی کی خبر سنائی اور ابو عمار کی لیاقت اور مہارت کا ذکر کرتا رہا۔ پھر اس نے یروشلم جانے کا پروگرام طلحہ کو بتایا۔ طلحہ نے اسے بتایا کہ اگرچہ یروشلم اردن کا ایک صوبہ اور اس صوبے کا صدر مقام ہے لیکن حالات ابھی ایسے نہیں کہ وہاں جایا جا سکے۔ بیت المقدس کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے کر اقوام متحدہ نے تنازعہ کی صورت باقی رکھی ہے اور وہاں یہودیوں نے کافی جال پھیلا رکھے ہیں۔

احمد ان باتوں سے نہیں گھبرایا۔ اس نے کہا۔
"باجی کیا تمہیں اپنا گھر یاد نہیں آتا؟"
"آتا ہے۔ لیکن وہ تمہارا گھر ہے۔ عورت کا گھر تو اس کے خاوند کا گھر ہوتا ہے اور میں وہاں موجود ہوں۔"
"تم ٹھیک کہتی ہو باجی۔ میں شیخ کریم سے ملوں گا اور پھر اپنے گھر جاؤں گا۔"
"ہاں۔ ہاں۔ جاؤ۔ لیکن پہلے شیخ کریم سے برج داؤد جا کر ملنا۔ خدا کرے وہ زندہ ہوں۔ میں نے ان کے متعلق عرصہ سے کچھ نہیں سنا۔"
"خدا کرے میری ان سے ملاقات ہو جائے۔"
"ویسے وہاں صالحہ ناصر بھی موجود ہے، میں تمہیں ان کا پتہ تو نہیں بتا سکتی کیونکہ مجھے بتایا ہی نہیں گیا۔ لیکن اگر تم شیخ کریم سے ملے تو وہ ضرور اسے جانتے

ہوں گے ـــ اگر وہ نہ بھی ملیں تو مسجدِ اقصیٰ کے پیش امام سے ملنا۔ پچھلے دنوں وہ یہاں آئے تھے اور ہمارے ہاں ٹھہرے تھے ـــ وہ بھی اپنے ہم خیال ہیں۔"

رات احمد نے عمان میں اپنی باجی کے ہاں ہی گذاری ـــ تیمی سے کھیلتا رہا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکراتا اور ہمک کر اس کے بازوؤں میں چلا جاتا ـــ جیسے اسے شروع سے ہی پہچانتا ہو ـــ ہنستا ہوا اپنی بہن سے کہتا۔

"میں اس کا ماموں ہوں۔"

طلحہ مسکرا دیتی۔

پھر اس نے شازیہ اور اس کی دوست کی، اور اپنی غلطی کا قصہ سنایا۔

طلحہ نے کہا۔

"چلو خدا نے بہتر کیا۔ میں تو اس دن ہی ٹھٹھکی تھی جب وہ میری غیر حاضری میں تمہارے پاس بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھی ـــ تمہارے بھائی نے بھی اس کو پسند نہیں کیا تھا۔"

"مجھے یاد ہے لیکن وہ میرے دل و دماغ پر اس طرح چھا گئی کہ میں اپنا آپ بھول گیا تھا۔" احمد نے اعتراف کیا۔

"یہی تو ان یہودی عورتوں کا کمال ہے۔"

اگلی صبح وہ بہن سے فارغ ہو کر ٹرانس جارڈن بس سروس کے ذریعہ یروشلم روانہ ہوا۔ اس نے بس میں سوار اپنے ایک بوڑھے ہمسفر سے کہا۔

"ہم یروشلم کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے۔"

"حالات درست رہے تو آج رات ۔۔۔ ورنہ ہو سکتا ہے کبھی بھی نہ پہنچیں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"بڑی باتیں ہیں ۔ صدیوں کا دارالامن بیت المقدس اب تنازعات کی آماجگاہ بن گیا ہے۔"

"کیوں کیا ہوا ہے ۔۔؟" احمد نے انجان بن کر بات بڑھانے کی خاطر کہا۔

"تمہیں نہیں معلوم ۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"یروشلم کا۔"

"یروشلم کے ۔ اور پھر نہیں جانتے کہ کیا ہوا ہے ۔؟" اس کے عمر رسیدہ ہمسفر نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں ۔ میں یروشلم کا رہنے والا ہوں لیکن میں ۱۹۳۶ء میں مصر چلا گیا تھا۔ اب لوٹ رہا ہوں۔"

"اتنا عرصہ ۔۔۔ بارہ سال تم وہاں رہے۔"

"کس کے ساتھ؟"

"اپنی باجی کے ساتھ۔"

"وہاں کیا کرتے تھے؟"

"پڑھتے تھے۔"

"اتنا عرصہ ملک پر جو بیتی ہے کیا تمہیں اس کا علم ہے؟"

"کچھ کچھ علم ہے"

بوڑھے نے اپنی ڈاڑھی کھجائی۔ "کچھ کچھ علم ہے" وہ بڑبڑایا۔

"تم نوجوان اسلام سے بیگانے ہوتے جا رہے ہو۔ اشتراکی رجحانات نے ساری قوم کو کمزور کر دیا ہے"

بوڑھا مسافر اسے کوئی دردمند عرب جان پڑا۔ احمد نے اس کی باتوں میں دلچسپی لی۔ اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔

بوڑھا اسے سناتا رہا کہ بیت المقدس پر کیا گذری۔ اس نے آہ بھر کر کہا۔

"اقوام متحدہ نے بیت المقدس کو بین الاقوامی علاقہ قرار دے دیا۔ لیکن ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو یہودیوں کی ایک زبردست فوج نے قبلۂ اول کو آگھیرا۔ قدیم شہر کے اندر اخوان مجاہدین چار ماہ سے یہودیوں کا مقابلہ کر رہے تھے نئے شہر میں بھی یہودیوں نے عربوں کے محلے قطمون کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اخوان ان سے نبرد آزما تھے۔ ان کے پاس ہتھیار بہت تھوڑے تھے اور وہ بھی زیادہ تر پرانی قسم کے۔ گولے بارود کا ذخیرہ بھی ناکافی تھا۔ لیکن یقین جانو وہ اپنے جوشِ ایمان، خلوصِ نیت، شوقِ شہادت، اللہ اللہ کے بھروسے پر آخری وقت تک لڑتے رہے۔ شہر جدید کا محلہ قطمون عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ تو انہوں نے قدیم شہر کو یہودیوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے جان کی بازی لگا دی۔ القدس مسلمانوں کا مقدس شہر ہی نہ تھا بلکہ مضافات سے آئے ہوئے بیس ہزار مسلمان بھی وہاں پناہ لئے ہوئے تھے،

چند ہفتے پہلے یہودی شہر دیر یاسین میں قتل عام کر چکے تھے۔ اگر یہاں بھی یہودی غالب آ جاتے تو وہی کرتے، یہودیوں کے پاس جدید اسلحہ تھا، ان کی تعداد کافی تھی۔ ان کی سپلائی لائن بھی قائم تھی۔ اس لئے ان کا دباؤ بڑھنا شروع ہو گیا۔ بالآخر اخوان مجاہدین نے اردن کی فوجوں سے مدد مانگی۔

عرب افواج کا کمانڈر جنرل گلب پاشا بیت المقدس کے اندر جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی اس خواہش کے پیچھے اگرچہ متعدد سیاسی اور مذہبی اسباب کار فرما تھے۔ تاہم اس نے اپنے موقف کے لئے فوجی بنیاد فراہم کر لی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ گلی کوچوں کی جنگ میں زیادہ اہمیت کسی فوج کی ماہیت کو نہیں کمیت کو حاصل ہوتی ہے۔

اردنی فوج کے پاس گولے بارود کا ذخیرہ بہت کم ہے۔ جسے شہر کی موٹی موٹی دیواروں پر ضائع کرنا عقلمندی نہیں۔ مزید برآں عرب افواج اگر شہر میں الجھ گئیں تو رملہ اور لدو غیرہ، غیر محفوظ ہو جائیں گے۔ اور یہودی کسی وقت وسیع پیمانے پر حملہ کر دیں گے۔ چنانچہ اخوان کو مشورہ دیا گیا کہ وہ بیت المقدس خالی کر دیں لیکن اس تجویز کو دستوں نے رد کر دیا بلکہ کہا "یہودی ہماری لاشوں پر سے گذر کر ہی بیت المقدس میں داخل ہوں گے۔"

احمد کا دل اخوان مجاہدین کے جذبہ ایثار سے بھر آیا۔ اس نے دل ہی دل میں ان کے جذبۂ حریت کی داد دی، اور مزید متوجہ ہو کر بوڑھے ہمسفر کی بات سننے لگا۔ بوڑھے کو معرکہ بیت المقدس کی ایک ایک بات یاد تھی۔

"تم جانو بیٹے مایوسی میں انسان سر دھڑ کی بازی لگا دیتا ہے، اردنی فوج

سے مایوس ہو کر بیت المقدس کی ساری آبادی گھروں سے باہر نکل آئی۔ رات بھر جنگ ہوتی رہی، غضب ہو گیا ـــ میں نے عورتوں، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں میں فلسطین میں ہونے والے ہنگاموں کے اندر اتنا جوش کبھی نہیں دیکھا جتنا اس رات دیکھا۔

رات بھر کر استقلال کام آیا۔ صبح یہودی فوج بھاگ نکلی۔ اس سے اردنی فوج کے ایک افسر نے ٹیلیفون پر صورت حال دریافت کی تو اسے بتایا گیا کہ یہودی فوج پسپا ہو چکی ہے اور ہمارے پاس گولہ بارود تقریباً ختم ہے۔ اگر اب ہماری مدد نہ کی گئی تو یہودیوں کے تازہ حملہ کی صورت میں ہم شہر کی مدافعت نہیں کر سکیں گے۔ اسی روز سہ پہر کے قریب اردن کی فوج بیت المقدس میں داخل ہو گئی۔ شہر کے یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے، اس کامیابی کا سہرا اخوان کے سرفروشوں کے سر ہے۔

احمد نے سوچا کہ اخوان سرفروش عوام میں واقعی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کی تنظیم نے حقیقتاً عرب عوام کی خدمت اپنے لہو سے کی ہے۔

بوڑھے نے پھر بتایا

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ عرب عوام کی سوچ کا انداز ایک ہے۔ وہ عرب ہونے کے علاوہ مسلمان ہیں۔ اسلام کے رشتہ سے ان کے دل ایک دوسرے کے بڑے قریب ہیں لیکن ہماری حکومتیں مصلحتوں کے انداز سے سوچتی ہیں۔ کچھ عرصہ کے لئے متفق ہوتی ہیں، اور پھر ان کے درمیان پھوٹ

بڑھ جاتی ہیں۔ اندازہ کرو پہلے ہماری افواج نے ہر جگہ یہودیوں کو پسپا کر دیا۔ اور پھر خود مجبور ہو گئے۔ باہم نفاق نے انہیں کہیں کا نہ رکھا۔"

وہ پھر واقعات کی تفصیل بتانے لگا۔

دوسرے محاذوں پر بھی اسرائیل مار کھا رہا تھا۔ مصر، صحرائے نقب کے بڑے حصے پر قابض ہو چکا تھا۔ اس کی فوجیں بیرشیبہ، جیبرون، بیت لحم اور بیت المقدس کے جنوبی نواح میں کھڑی تھیں۔ اس محاذ پر بھی مصر کے اخوان، یہودیوں کی بڑھتی ہوئی قوت کو پسپا کرنے میں پیش پیش رہے تھے شمالی فلسطین میں مفتی اعظم فلسطین کی افواج آزادی پے در پے فتوحات حاصل کر رہی تھیں اور ایک بہت بڑا علاقہ اسرائیلیوں کے ہاتھ سے نکل گیا تھا، عراقی فوجیں جنین، تلکرم اور نابلس کے مثلث پر قابض تھیں، اور مغرب میں سمندر کے قریب یہودیوں کے شہر ہدیرہ تک پہنچ گئی تھیں، شامی فوجوں نے وادی اردن میں ایک مورچے پر قبضہ کر لیا تھا۔ اردن کی فوجوں نے بیت المقدس کے نئے شہر کی ناکہ بندی کر رکھی تھی اور ایک لاکھ یہودی محاصرے کی حالت میں تھے، پانی اور خوراک سے محروم ہو جانے سے ان کی مزاحمت کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ موت ان کے سر پہ منڈلا رہی تھی۔

اس صورت حال سے بین الاقوامی صیہونیت سخت مضطرب تھی۔ بیت المقدس کے محاذوں پر یہودیوں کی شکست سے امریکی یہودیوں میں زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ چونکہ اردن کی فوجیں ان فتوحات میں پیش پیش

تھیں۔ اس لئے برطانیہ، پرخوب لے دے ہوئی۔ آخرامریکہ کے دباؤ پر برطانیہ نے اردن اور دوسرے عرب ملکوں کو اسلحہ کی ترسیل روک دی۔ اینگلو اردن معاہدے کے تحت اردنی فوج کو تربیت دینے کے لئے جو برطانوی افسر مہیا کئے گئے تھے، انہیں واپس بلا لیا گیا۔ سلامتی کونسل میں برطانوی نمائندے سر الیگزنڈر کیڈ وگن نے اعلان کیا کہ برطانیہ، اردن کو دی جانے والی اقتصادی امداد پر نظرثانی کر رہا ہے۔

سلامتی کونسل نے یروشلم اور دیگر تمام محاذوں پر ۲۹ رمئی سے جنگ بندی کے احکام جاری کر دیئے۔ اسرائیل نے عارضی التوائے جنگ کو فوراً قبول کر لیا۔ عرب تذبذب میں پڑ گئے، بظاہر ان کا پلہ بھاری تھا۔ لیکن ایک مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے جس باہمی اعتماد و اتحاد، مشترکہ حکمت عملی، اشتراک عمل، اور پرخلوص جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے وہ محروم تھے۔ سامان جنگ کے لحاظ سے بھی وہ کسی بڑی اور طویل جنگ لڑنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے۔ ان کی حربی قوت کا ایک بڑا حصہ ختم ہو چکا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ چند دن اور نکال سکتے تھے۔ رہی سہی کسر باقی طاقتوں کے دباؤ اور برطانیہ کی طرف سے اسلحہ روک دینے کے اقدام نے پوری کر دی، ۲۷ روز کے بعد عرب بھی عارضی التوائے جنگ قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔

عارضی جنگ بندی چار ہفتے رہی۔ اس اثناء میں یہودیوں نے اپنی فوجیں ازسرنو منظم کیں۔ اور ان کی کمان کے لئے اعلیٰ انگریز افسروں کی خدمات حاصل کیں۔ اشتراکی روس کی ہدایت پر چیکوسلاواکیہ نے اپنے اسلحے کے ذخائر اسرائیل

کے لئے کھول دیئے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مغربی ملکوں اور امریکہ سے لڑاکا اور بمبار طیارے جنہیں برطانیہ، امریکہ اور جنوبی افریقہ کے غیر یہودی پائلیٹ چلا رہے تھے۔ اسرائیل کے خفیہ ہوائی اڈوں پر پہنچ گئے۔ دوسری طرف مغربی ملکوں نے عرب ملکوں کو اسلحہ بھیجنے پر کڑی پابندی عائد کر دی تھی۔

جب التوائے جنگ کا مقصد پورا ہوگیا۔ یہودی نئے سرے سے تازہ دم اور کیل کانٹے سے لیس ہو گئے۔ تو انہوں نے ۸ جولائی کو پھر سے جنگ چھیڑ دی، اب پانسا پلٹ چکا تھا۔ عرب افتراق کا شکار ہو چکے تھے۔ عرب افواج کے پاس اپنی تعداد اور اسلحہ سے زیادہ علاقہ تھا۔ جس کا اسے دفاع کرنا تھا۔ عراق نے نہ صرف رملہ اور لُد کے دفاع میں اردن کا ہاتھ بٹانے سے انکار کر دیا تھا بلکہ اس نے ایک رات پہلے راس العین سے اپنی فوجیں بھی ہٹالی تھیں۔

مصری فوجیں اگرچہ بیت المقدس کے دفاع میں چند میل جنوب میں چھاؤنی ڈالے پڑی تھیں مگر انہوں نے بیت المقدس کے دفاع میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دفاعی جنگ کا سارا بار اردن پر آن پڑا۔ تین دن کی زبردست جنگ کے بعد اردنی فوجوں کو لُد کا ہوائی اڈہ اور رملہ خالی کرنا پڑا۔ بیت المقدس کی جنگ نہایت شدید تھی۔ فریقین کو بے پناہ جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ آخر اسرائیلی پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اب وہ شمالی فلسطین کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور شہر پر شہر فتح کرتے ہوئے مشرقی گلیلی تک بڑھتے چلے گئے۔ شمال سے فارغ ہو کر انہوں نے اپنی ساری بکتر بند فوج لتردن سیکٹر پر لا ڈالی۔ ۱۵ جولائی کو سلامتی کونسل نے جنگ بند کر دینے

کے نئے احکام جاری کیے۔

جنگ بندی کا یہ دور وسط اکتوبر تک رہا۔ اس مرتبہ بھی اسرائیلیوں ہی نے اس کی خلاف ورزی کی۔ انہوں نے اچانک جنوبی فلسطین پر حملہ کر دیا اور مصری فوجوں کو بیر شیبہ اور دوسرے اہم مقامات سے نکال دیا۔ اب اسرائیلی غزہ کی طرف بڑھے مصری فوجیں بیت لحم اور حبرون خالی کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ شاہ عبداللہ نے ایک بار پھر جرأت مندانہ اقدام کیا۔ اور اچانک حملہ کر کے حبرون بیت لحم سیکٹر پر قبضہ کر لیا۔ سردیوں کے آغاز میں اسرائیلی ہر محاذ پر بڑھ رہے تھے۔ اسرائیلی طیارے، قاہرہ اور دمشق پر بمباری کر رہے تھے۔ اخوان مجاہدین نے وسطی اور شمالی فلسطین کے محاذ پر اسرائیل کی فوجوں کو روکنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی مگر شامی اور مصری فوجوں کی قوت مزاحمت نہ ہونے کے برابر تھی اور اخوان کی ساری قربانیاں رائیگاں گئیں۔

اور بیٹے اب صورت حال یہ ہے کہ اسرائیلی شامی فوجوں کو ان کی سرحدوں تک دبا لے گئے ہیں۔ مصری فوجوں کے پاس غازہ کی پٹی رہ گئی ہے۔ عراق مالی بحران کا شکار ہو گیا ہے۔ اردن بیچارا کیا کرے۔

اچانک بس رک گئی۔ بوڑھے کی تقریر کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اسی نے احمد سے کہا۔ "آؤ ذرا پانی وغیرہ پی کر تازہ دم ہوں۔ اس سے آگے پانی کافی دور جا کر ملے گا۔" دونوں بس سے اتر گئے۔

یروشلم پہنچ کر احمد نے اپنے ہمسفر سے برج داؤد کا پتہ پوچھا۔ بوڑھے نے مخصوص نظروں سے احمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میاں صاحبزادے کیوں جان جوکھوں میں ڈالتے ہو —— میرے گھر چلو۔ رات بسر کرو، صبح خود تمہیں برج داؤد لے چلوں گا —— اگر ہمارا سفر خیریت سے کٹ گیا ہے تو اس کا مطلب یہ مت سمجھو کہ ہم اس مقدس شہر کے گلی کوچوں میں محفوظ ہیں۔"

بوڑھے مسافر کی یہ دعوت احمد کے دل کی آواز تھی۔ وہ تو یہ چاہتا ہی تھا کہ رات کسی ایسی جگہ گذارے، جہاں اس کے دوست ہوں۔ دشمن نہ ہوں۔ اسے ایسے دو ہی ٹھکانے یاد تھے۔ ایک شیخ کریم کا گھر اور دوسرے صالحہ ناصر کا گھر — لیکن ان دونوں ٹھکانوں میں سے اسے کسی کا علم بھی نہیں تھا۔ یروشلم اس کے لئے نیا شہر تھا۔ گو اس نے شہر اور بیت المقدس کے متعلق بہت کچھ پڑھا تھا لیکن شنیدہ اور دیدہ میں فرق ہوتا ہے۔ تاہم یہ وہ سرزمین تھی جس کی خاک

سے اس کا خمیر اٹھا تھا۔

وہ بوڑھے مسافر کے ساتھ ہولیا۔

سڑک سے ہٹ کر وہ گلیوں میں چلتے راستہ بدلتے ایک ملبند و بالا مکان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے، بوڑھے مسافر نے تین دفعہ دروازہ کو اپنی چھڑی سے کھٹکھٹایا، پھر چھڑی بائیں ہاتھ میں تھام کر ہاتھ کی ہتھیلی سے تین دفعہ کھٹکھٹایا، دروازہ میں لگی ہوئی چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور ایک لحظہ کے لئے جھانکا۔ پھر دروازہ کے کنڈے کھولنے کی آواز آئی۔ دروازہ چرچرایا اور وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔ لڑکی گرم جوشی کے ساتھ ابی کہہ کر بوڑھے شخص سے لپٹ گئی۔ بوڑھے نے اسے پیار کیا اور دروازہ بند کرنے کی ہدایت کی۔

لڑکی کی عمر دس بارہ برس کے قریب ہوگی۔ لیکن قد و قامت سے اس کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔

"سارہ" بوڑھے نے کہا "مہمان کو مہمان خانہ میں لے جاؤ ــــ اور جس چیز کی ضرورت ہو ان کو دو۔"

احمد اس لڑکی کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

لڑکی بلا کی تیز تھی ــــ اس نے مہمان خانہ تک پہنچتے پہنچتے۔ احمد سے کئی سوالات کر ڈالے۔

"کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جاؤ گے؟ کتنے دن یروشلم میں رہو گے؟ تم اخوان تو نہیں؟ نہانا ہو تو ادھر آ جائیے گا؟ وہ سامنے مہمان خانہ ہے؟ کھانا کس وقت کھائیں گے؟

احمد اس لڑکی کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس گھر میں مہمان آتے رہتے ہیں۔ اور لڑکی اس سلسلہ میں کافی تربیت یافتہ ہے کہ مہمانوں کو کس طرح ٹھہرایا جاتا ہے ــ لیکن ابھی تک اسے اپنے محسن کا نام بھی معلوم نہیں ہوا تھا۔ حالاں کہ سارے سفر میں بوڑھے نے پوری تاریخ اسے سنا دی تھی۔

احمد نہایا۔ کپڑے وغیرہ تبدیل کئے۔ کمرہ کے سامنے بنے ہوئے صحن میں آبیٹھا ــ اتنے میں وہی لڑکی شربت کا ایک جگ اور گلاس اٹھائے آئی ــ احمد نے پیٹ بھر کر شربت پیا ــ شربت کیا تھا بس ایک شیریں اور خوشبودار محلول تھا ــ احمد کو محسوس ہوا جیسے اس کی ساری تھکن دور ہو گئی ہے۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھا مسافر بھی نیچے اتر آیا اور احمد ــ ا آکر بیٹھ گیا۔

احمد نے پوچھا۔

"کیا میں اپنے محسن کا نام پوچھ سکتا ہوں"؟

"کیوں نہیں ــ میرا نام علی محجوب ہے ــ میں اسلام کا ایک ادنیٰ خادم ہوں ــ سارہ میری بیٹی ہے ــ اس گھر میں سارہ، اس کی ماں، ایک خادمہ اور میرے سوا کوئی نہیں رہتا ــ لیکن میرے دو بیٹے اردنی فوج میں ملازم ہیں اور وہ اعلیٰ تربیت کے لئے باہر گئے ہوئے ہیں"۔

"آپ کیا کاروبار کرتے ہیں"؟

"میں اب تو کوئی کاروبار نہیں کرتا ــ لیکن کبھی مرحوم فلسطین میں ناظم الامور تھا"۔

"لیکن مجھے آپ کے دولت کدہ، آپ کو اور آپ کی صاحبزادی کو دیکھ کر

محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے ہاں مہمان کثرت سے آتے ہیں"

"ہر بستے گھر میں مہمان آتے ہی ہیں!"

"آپ کی بیٹی نے مجھ سے پوچھا تھا۔ تم اخوان تو نہیں"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا"

"تو پھر تم سارہ کی ساری ہمدردیوں سے محروم ہو گئے"

"وہ کیوں؟"

"اس کی ماں اسے اخوانوں کے متعلق باتیں سناتی رہتی ہے ۔۔ میرے ہاں آنے جانے والوں میں زیادہ تعداد ان حریت پسند نوجوانوں کی ہوتی ہے جو تقسیم فلسطین کے مخالف ہیں اور جو یہودیوں کے دشمن ہیں ۔۔ ان کی خدمت کر کے سارہ سمجھتی ہے کہ وہ اپنا گھر جنت میں تعمیر کر رہی ہے"

"ماشاء اللہ ۔ بڑے اچھے خیالات ہیں"

"جو بھی سمجھو ۔ عرب دنیا میں ایسی بہت سی تحریکیں جنم لے چکی ہیں جن کا مقصد یہودیوں کو ختم کرنا ہے ۔ اسرائیل کا وجود مٹانا ہے ۔ اس مقصد کے حصول میں کتنا عرصہ لگتا ہے۔ اس کا فیصلہ وقت ہی کرے گا"

تھوڑی دیر کے بعد کھانا آ گیا جو نان، شہد، بھنے ہوئے گوشت اور شوربہ پر مشتمل تھا۔ کھانا کھانے کے بعد دیر تک قہوہ کا دور چلتا رہا۔ جب علی محبوب نے سمجھا کہ خادمہ بھی سو گئی ہے تو ایک لمبی سی انگڑائی لے کر وہ بھی اٹھ کر سونے کے لئے چلا گیا۔ احمد کے لئے خادمہ نے اسی صحن میں کھلی ہوا میں

بستر لگا دیا تھا۔ وہ بھی لیٹ گیا۔

علی الصبح موذن کی اذان کے ساتھ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھا وضو کیا اور زندگی میں پہلی بار سر بسجود ہوا ــــ فجر کی ... اسے سکون کی بے پناہ دولت مل گئی ہو۔ اسے ہر چیز عجیب عجیب لگ رہی تھی۔ سر کو خدائے عزوجل کے حضور جھکا کر جس راحت کا اسے احساس ہوا، اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ دین فطرت کا راستہ بڑا ہی پر امن ہے اور اس راہ پہ چل کے جملہ خدشات کا رنگ بدل جاتا ہے۔ تبھی تو قرونِ اولیٰ کے مسلمان بے خطر کفر کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے تھے۔ سندھ کے میدانوں تک ان کو ایک عرب دوشیزہ کی پکار لے گئی۔ اور اندلس کے ساحلوں تک انہیں ان کا احساسِ حق و باطل لے گیا۔ وہ ہر مرحلہ پر، ہر مقام پہ کامیاب و کامران لوٹے ــــ ان کے سجدوں کے خلوص نے انہیں ہر بات سے بے نیاز کر دیا۔

دل و دماغ کے بوجھوں کو وہ بالکل ہلکا محسوس کر رہا تھا۔

علی محجوب تیار ہو کر احمد کے پاس آیا۔ سارہ ناشتہ لے آئی ــــ وہ ناشتہ کرنے لگے تو علی محجوب نے سارہ سے کہا۔

"بیٹی ــ یہ بھی اخوان ہے۔" اس کا اشارہ احمد کی طرف تھا۔

احمد نے دیکھا کہ سارہ نے اپنے باپ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ لیکن اس کے چہرہ پہ ایک سرخ لہر دوڑ گئی۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔

"ہاں میں اخوان ہوں ــ میں نے ابھی دو دن پیشتر اسرائیل کا ایک تیل کا ذخیرہ بھی جلایا ہے۔"

سارہ کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ احمد نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا تو اس کی بظاہر عمر سے اس کی ذہنی عمر اسے کہیں زیادہ نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں چمک کے ساتھ ساتھ بے پناہ ذہانت بھی تھی۔ اور اس ذہانت کا اظہار اس کے کام کرنے کے طریقوں سے بھی ہوتا تھا گو اس کی عمر دس برس تھی لیکن خادمہ کے کھانا کھلانے اور سارہ کے شربت پلانے اور ناشتہ لانے کے انداز بڑے مختلف تھے۔

"بہت خوب —" علی محجوب نے کہا اور پھر سارا سے مخاطب ہوا۔

"بیٹی ہمارے سارے مہمان ایسے ہی بہادر اور جانفروش ہوتے ہیں"۔

سارہ برتن سمیٹ کر لے گئی۔ احمد اور علی محجوب گھر سے نکل کر برج داؤد کی طرف روانہ ہوئے۔ شیخ کریم کو تلاش کیا لیکن اس کا پتہ نہ چلا۔ ایک محلہ دار نے بتایا کہ شیخ کریم ہیرو گیٹ میں اپنے ایک دوست کے مکان پہ چلا گیا ہے، وہاں ملے گا۔ وہ ہیرو گیٹ پہنچے۔ پوچھتے پوچھتے بالآخر وہ شیخ کریم کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

بڑے بڑے موٹے شیشے کی عینک سے جھانکتے ہوئے اس نے دونوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ علی محجوب نے بتایا۔

"شیخ کریم — میں ہوں علی محجوب"

"علی محجوب —— اور میرے غریب کدہ پہ —— آؤ —— آؤ —— اندر آؤ —"

احمد نے دیکھا کہ علی محجوب کا نام سنکر شیخ کریم کا بڑھاپا ایک دم۔

ماضی کی طرف لوٹ گیا ۔۔۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا " علی محبوب واقعی کوئی اہم شخصیت ہے "

ایک کشادہ سے کمرہ میں بٹھا کر شیخ کریم نے کہا۔

" میں اپنے معزز مہمانوں کی کیا خدمت کروں "

" تکلف میں نہ پڑو دوست ۔۔۔ یہ میرے ساتھ احمد ہے ۔۔۔ تمہارے شہید دوست کا بیٹا ۔۔۔ طلحہ کا ۔۔۔ ائی ۔۔۔"

شیخ کریم آہستہ سے اٹھا اور اس نے احمد کو سینے سے لگا لیا۔ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پیشانی چومی ۔۔۔ اور اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو احمد کے کندھوں پہ آگرے ۔۔۔ پھر یہ آنسو شدت اختیار کر گئے اور شیخ کریم چیخیں مار مار کر رونے لگا ۔

" بیٹا ۔۔۔ خدا تمہیں زندہ سلامت رکھے ۔ نیک کرے ۔۔۔ میں تم لوگوں کے بارے میں بڑا پریشان رہا۔ لیکن مجتبےٰ حامد کے خطوط سے تمہاری خیریت سنکر ڈھارس بندھی ۔۔۔ پھر تاریخ نے ایسا پلٹا کھایا کہ ہماری تقدیریں بدل گئیں ۔ برنج داؤد میرا رہنا مشکل ہو گیا۔ تو میں تمہارے اس مکان میں اٹھ آیا ۔۔۔ یہ تمہارا ہی مکان ہے ۔۔۔ میرے مرحوم دوست کا ۔۔۔

علی محبوب نے شیخ کریم کو تسلی دی اسے خاموش کرایا۔ پھر شیخ کریم احمد کو اندر زنانہ کمرہ میں لے گیا۔ شیخ کریم کی بیوی بھی احمد کو دیکھ کر خوب روئی ، اور اسے پیار کرتی رہی ۔

شیخ کریم نے اپنی بیوی سے کہا۔

"احمد اپنے ساتھ علی محجوب کو لے کر آیا ہے۔"
"کون علی محجوب — جس کی دوراندیشی اور محنت سے ہم لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔"
"ہاں ہاں وہی علی محجوب — جس نے زندگی بھر کی کمائی ہوئی ساری دولت سے اسلحہ خرید کر نوجوانوں میں تقسیم کیا تھا — جس کے لڑکوں کی کوشش سے اردنی فوج بیت المقدس میں داخل ہوئی تھی — اور جس کے دسترخوان پر جب تک کوئی مہمان نہ آجائے، کھانا نہیں چنا جاتا۔"
"زہے قسمت — بیٹا — تم علی محجوب جیسے عظیم انسان سے کیسے ملے؟" پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے کہا۔
"چلو — اس کے لئے شربت لے جاؤ — تم خود ان کی اپنے ہاتھوں سے خدمت کرو۔"
احمد کے دل میں علی محجوب کی عظمت کے نقش اور گہرے ہو گئے۔ اس نے سوچا "میں نے کس فخر سے بتایا تھا کہ میں نے اسرائیل کا تیل کا ذخیرہ تباہ کرنے میں نمایاں کام کیا ہے — یہ میرا اوچھا پن ہی تو تھا — اور یہ علی محجوب — اس نے اپنے متعلق کوئی بات ہی نہیں کی — اور لوگ اس کا نام سنکر اسے سر آنکھوں پہ جگہ دیتے ہیں — واقعی بے لوث خدمت کا لطف کچھ اور ہی ہے۔"
شیخ کریم بھران کے پاس آ بیٹھا — اس وقت کی باتیں چھڑ گئیں جب احمد ابھی بچہ تھا اور جب اس کی بہن، ماں اور باپ کو شہید کر دیا گیا تھا —

شیخ کریم نے تجارت کا ذکر بھی کیا جو جنگ عظیم کی وجہ سے تباہ ہو گئی تھی۔ احمد کو خاص طور پر اس کے باپ کے مکان کے متعلق بتایا کہ کس طرح یہودیوں نے سارے بازار کو جلا کر خاک کر دیا تھا لیکن اس کے باوجود احمد کی کچھ رقم اس کے پاس محفوظ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

شیخ کریم نے اصرار کیا کہ احمد اپنے ہی گھر میں ٹھہرے۔ لیکن علی محجوب نے کہا ــ "نہیں ابھی تو یہ برخوردار میرا مہمان ہے"

شیخ کریم اور اس کی بیوی سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے احمد علی محجوب کے ساتھ واپس آ گیا۔ اب کے پیش نظر صالحہ ناصر کو تلاش کرنا تھا۔

احمد نے پوچھا۔

"بزرگوارم ــ عورت کو تلاش کرنا بہت مشکل ہو گا"

"نہیں، صالحہ ناصر کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہو گا ــ میں اس کے متعلق جانتا ہوں بڑی مومن خاتون ہے"

پر پیچ گلیوں سے ہوتے ہوئے ایک مکان پر رک کر دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک معمر شخص نے دروازہ کھولا۔ اندر آنے کے لئے اصرار کیا۔ لیکن علی محجوب نے معذرت طلب کرتے ہوئے کہا۔

"فی الحال مجھے ابو عمار کے مکان تک پہنچنا ہے، محفوظ راستہ کون سا ہو گا۔؟"

معمر شخص نے وضاحت کے لئے مختلف گلیوں کے نام لے کر ابو عمار کے گھر کا پتہ بتایا۔

احمد بڑا حیران ہوا کہ ابو عمار کون ہے؟ کیا یہ وہی ابو عمار تو نہیں جو ان کے دستہ کا قائد تھا۔ لیکن وہ نوجوان لڑکا ہے ۔۔۔ اسے ان بزرگوں سے کیا نسبت ۔۔۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک الجھن پیدا ہو چکی تھی۔ تاہم اس نے اس کی وضاحت کرانا مناسب نہ سمجھی، اور اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کو کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا۔

علی محجوب پھر آگے آگے چلنے لگا ۔۔۔ لیکن احمد یہ جان کر بھی حیران ہوا کہ راستہ میں ملنے والے افراد میں سے کسی نے اسے مخاطب نہیں کیا۔ کیا ان راہ چلتے لوگوں میں سے کوئی بھی اس کو نہیں جانتا ۔۔۔ لیکن جہاں رک کر بات کرتا ہے وہاں سب اسے اپنائیت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

وہ پھر ایک مکان پہ آکر رک گئے۔ در و دیوار پہ نظر ڈال کر اطمینان کرنے کے بعد علی محجوب نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک ملازم نے دروازہ کھولا، جھک کر سلام کیا۔

"عزیز ہیں" علی محجوب نے پوچھا۔

"جی تشریف لائیے" خادم کے پیچھے چلتے ہوئے وہ ایک سجے سجائے کمرہ میں پہنچے ۔۔۔ کمرہ کے اندر آثار قدیمہ کی تصاویر آویزاں تھیں۔ بیت المقدس کے مختلف حصوں کی تصاویر ان میں نمایاں تھیں۔

مسجد اقصیٰ، مسجد صخرہ کا منظر، مسجد خلیل، مسجد عمر، اور قبۃ الصخرہ وغیرہ کی تصاویر تو بہت بڑی تھیں۔

جلد ہی صالحہ ناصر کمرہ میں آگئیں۔

علی محجوب نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا تو وہ پریشان ہو کر کہنے لگی۔ "آپ مجھے گنہگار کرتے ہیں۔"

"نہیں عزیزہ! تمہاری جیسی بیٹیوں کی عزت کرنا ہمارا فرض ہے۔"

ابھی تک صالحہ ناصر نے احمد کو نہیں دیکھا۔ اس پہ نگاہ ڈالتے ہی ایک لمحہ کے لئے اس نے سوچا۔

"تم احمد تو نہیں — طلحہ کے بھائی —" اس نے احمد کو پہچانتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں — میں نے تو آپ کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔"

"میں نے بھی پہچان لیا ہے — لیکن اس وقت تم چھوٹے تھے۔"

احمد صرف مسکراتا رہا — اس نے سوچا "وہ اتنا بھی چھوٹا تو نہیں تھا۔"

قہوہ آ گیا۔ ہلکی ہلکی خوشبو سارے کمرہ میں پھیل گئی۔ خود صالحہ ناصر نے اٹھ کر قہوہ پیش کیا۔

پھر موضوع سیاست پہ آ گیا۔ عرب لیگ زیر بحث رہی۔ عرب لیگ کے جھنڈے تلے مصر، عراق، یمن، اردن، لبنان، سعودی عرب اور شام وغیرہ نے فلسطین کے مسئلہ کے متعلق جو کچھ کیا تھا اس کا جائزہ لیا گیا۔ موجودہ بحران پر سیر حاصل تبصرہ ہوا۔ امریکہ اور چیکوسلاواکیہ سے اسرائیل کو ملنے والے طیاروں اور اسلحہ پر اظہار تشویش کیا گیا — احمد نے اندازہ کیا کہ صالحہ ناصر جملہ معاملات کو اشتراکی نقطۂ نظر سے جانچتی تھی، جبکہ علی محجوب کا انداز اسلامی تھا۔ لیکن ایک بات تھی، دونوں کو جملہ حالات اور تفصیلات پر پورا پورا عبور تھا۔

اور دونوں اس بات پر متفق تھے کہ یہودی غاصب ہیں۔ استعماری طاقتیں ان کی پشت پناہی کر رہی ہیں۔ اور ان کا استیصال اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ تمام عرب طاقتیں متحد ہو جائیں گی اور ہر مرد و عورت سپاہی بن جائے گا۔

"لیکن یہ اب بڑی لمبی جد و جہد کی بات ہے ۔۔۔" علی محجوب نے کہا۔

"اسرائیل ایک حقیقت بن چکا ہے۔ کرۂ ارض کا نقشہ تبدیل ہو چکا ہے۔ اور یہودی اپنے پاؤں جمانے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔"

"نجب کے بارے میں مذاکرات کا کیا نتیجہ نکلا؟" صالحہ نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ۔۔۔ اقوام متحدہ کے سویڈش کمشنر کی جان بھی گئی اور نجب بھی عربوں کو نہ مل سکا۔" علی محجوب نے جواب دیا۔

"کتنا حیرت کا مقام ہے، یہودیوں نے اس کی جان لی اور وہی فائدہ میں رہے۔"

"میں نے جتنی بھی مجالس میں شرکت کی ہے ۔۔۔ عمان کانفرنس سے بھی ابھی ابھی لوٹا ہوں ۔۔۔ ہر جگہ مایوسی کا ہی دور دورہ ہے ۔۔۔ بن گوریاں کے ہر بیان میں شرارت ہوتی ہے۔ لیکن ہم ابھی تک کسی ایک کا جواب بھی نہیں دے سکے۔"

"جب تک میری بات پر عمل نہ کیا گیا کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

"حکومت تو تمہاری تجویز پر عمل کرنے سے رہی۔ لیکن عوامی طور پر لڑکیوں کی فوجی تربیت کا منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے ۔۔۔ اخوانوں کی تعداد بھی برابر بڑھ رہی ہے۔ اور تم دیکھو گی ہماری تحریک انشاء اللہ کوئی رنگ ضرور لائے گی۔"

صالحہ نے احمد کو پھر ملنے کے لئے کہا۔

واپسی پر پھر دروازہ سارہ نے کھولا۔ احمد نے محسوس کیا کہ ان کو زندہ وسلامت واپس گھر پاکر اسے خوشی ہوئی ہے۔

یہ سارہ جو علی محجوب کی گود میں پل رہی تھی یروشلم کے سیکنڈری سکول میں پڑھتی تھی۔ اور تقاریر کے علاوہ ڈراموں اور مباحثوں میں حصے بھی لیتی تھی اور یہ مسلمہ بات تھی کہ اسے ہر مقابلہ میں فتح نصیب ہوتی تھی۔

احمد اس چھوٹی سی بھرپور شخصیت سے بڑا متاثر ہوا۔

احمد ایک ہفتہ دمشق میں رہا۔ ایک ایک رات وہ شیخ کریم اور صالحہ کے ہاں بھی رہا۔ باقی سارے دن اس نے علی مجوب کے ہاں گذارے۔ جب وہ واپس عمان روانہ ہونے لگا تو علی مجوب نے کہا۔

"میاں صاحبزادے اب پھر تم سے ملاقات کب ہو گی؟"

"جب آپ فرمائیں گے!"

"میں شاید تم سے قاہرہ میں ملوں۔ عنقریب ہی مجھے ابو عمارہ سے ملنا ہے۔"

احمد نے ابو عمار کا نام سنا تو اسے پھر اپنا نوجوان قائد یاد آیا ـــ اس نے سوچا "کیا ابو عمار قاہرہ میں ہے؟"

"میں ابو عمار کے بارے میں آپ سے پوچھنا بھول ہی گیا تھا ـــ ایک ابو عمار کو میں بھی جانتا ہوں ـــ وہ جامعہ قاہرہ میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا ہے ـــ اس کا وطن القدس ہے کیا آپ اسی کے متعلق ہی تو بات نہیں

کہہ رہے تھے:

"توتم انسے جانتے ہو — میں اسی کے متعلق بات کہہ رہا تھا —
وہ اگرچہ نوجوان ہے لیکن سوجھ بوجھ اور اپنے کارناموں کے لحاظ سے وہ ہم
بوڑھوں سے بہت آگے ہے — یہی حال صالحہ ناصر کا ہے — تم
ابوعمار سے ملتے رہنا — پھر انشاءاللہ ہمارا تمہارا ساتھ زندگی بھر رہے
گا — ہم جسے اپنا دوست کہتے ہیں پھر اسی کے لئے ہمارا دل زندگی بھر
دھڑکتا رہتا ہے — اخوان دوسروں کے لئے ہی جیتے مرتے ہیں"

احمد اس محبت اور خلوص سے رچی بسی پیش کش کا کیا جواب دے
سکتا تھا۔ ممنون نظروں سے علی محجوب کو دیکھتا رہا۔ بس چلنے لگی تو علی محجوب
نے نصیحتاً کہا۔

"ہاں ابوعمار سے اکیلے ملنا — اخوان اپنے دوستوں کو تنہائی میں
پہچانتے ہیں یا میدان جنگ میں"

اب احمد کی سمجھ میں آیا کہ راہ چلتے علی محجوب سے کبھی کسی نے علیک
سلیک کیوں نہیں کی۔

سفر کے دوران وہ سوچتا رہا۔ اسے یروشلم سے کیا ملا ہے — سب
سے پہلے اسے اس طمانیت کا احساس ہوا جو اللہ کے حضور سربسجود ہو کر اسے
نصیب ہوئی تھی — پھر اس خلوص بھری تواضع کا خیال آیا جو علی محجوب نے
اس سے روا رکھی تھی۔

شیخ کریم اور اس کی بیوی کی باتیں کتنی زندگی سے پر تھیں اور صالحہ ناصر

کی زندگی میں عمل کو کتنا دخل تھا۔ ان ساری باتوں سے اس کی زندگی براہ راست متاثر ہوئی تھی، دس برس کی سارہ کو قوم اور وطن سے کس قدر الفت تھی، اور وہ اخوانوں کی خدمت کر کے کس قدر خوشی محسوس کرتی تھی ـــ ہر ایک ـــ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ ایسے پہلو تھے جنہیں وہ زندگی بھر کے لئے اپنی شخصیت میں سمو لینا چاہتا تھا ـــ اس نے نیت کی کہ جب بھی زندگی میں آرام سے بیٹھنے کا موقع ملا تو وہ یروشلم میں ہی آکر رہے گا اور مصر کو تو اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد لازماً چھوڑ دے گا۔

عمان میں چند دن وہ پھر اپنی ہمشیرہ کے پاس رہا۔ اس دوران میں ایک دفعہ مجیب رات گھر پر رہا۔ احمد سے شازیہ کے متعلق تفصیلی بات چیت کرتا رہا اور سنتا رہا۔ اس نے بتایا۔

"یہودیوں نے باقاعدہ ایک ایسا تربیتی مرکز قائم کر رکھا ہے، جہاں عورتوں کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کی تربیت دی جاتی ہے اور پھر انہیں یا تو کسی کی نگرانی میں یا اگر وہ خود قابل اعتماد ہوں تو انفرادی طور پر مختلف کام سونپے جاتے ہیں، یہ کام زیادہ تر جعل سازی، دستاویزات کی چوری جاسوسی، افشائے راز اور قتل وغیرہ کی ترغیبات پر مشتمل ہوتے ہیں، ساری دنیا میں اس مرکز کی تربیت یافتہ عورتیں موجود ہیں۔"

مجیب بھی کوئی انجان نہ تھا۔ جب سے شازیہ نے اس کے ہاتھ باندھے میں [illegible] تھی، تب سے عورتوں کے معاملات میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ ویسے بھی [illegible] اب ایسی تھی جب مخالف جنس کے معاملات میں دلچسپی لینے کو جی خواہ

مخواہ چاہنے لگتا ہے
پھر بھی وہ کوشش کرتا تھا کہ اس کے ذہن میں کسی ایسے خیال کا گذر نہ ہو جو اسے مقصد سے ہٹا دے یا اس کی دیگر دلچسپیوں پر حاوی ہو۔
جب کبھی مشکل مقام آتا وہ سر بسجود ہو جاتا اور اسے ایسی روحانی غذا ملتی کہ شیطان نوسوں دور بھاگ جاتا۔
وہ واپس قاہرہ پہنچ کر ہمہ تن اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ابو عمار سے اس کی ملاقات اکثر ہوتی رہتی لیکن آج تک تنہائی میں وہ اپنے یروشلم کے قیام کے تاثرات اسے نہیں بتا سکا تھا۔
وقت گذرتا رہا۔
سیاسی افق پہ تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ لیکن ایسی کوئی تبدیلی نہ ہوئی جس سے عربوں کے زخموں پہ مرہم رکھی جاتی۔
۱۹۷۹ء کی ابتدا سے ہی مذاکرات کا کافی زور رہا۔ اسرائیل کو امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک سے فوجی نوعیت کی جو امداد ملتی رہی، اس کی وجہ سے عرب ممالک فلسطین کی جنگ آزادی میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے ۔ مذاکرات کا جو نتیجہ نکلا اس کے تحت اردن کو سابق فلسطین کا پانچواں حصہ، مصر کو غازہ مختصر حصہ اور باقی سارا علاقہ یہودیوں کو دے دیا گیا۔ عرب عوام اور طلباء نے تمام ملکوں میں مظاہرے وغیرہ کئے لیکن کون سنتا تھا۔ سال کی ابتدا میں ہی روڈس نامی جزیرے میں اسرائیل کے ساتھ ہنگامی صلح کے معاہدہ پر دستخط ہو چکے تھے ـــــ اور اب تک سعودی عرب، یمن اور عراق کے

سوا باقی سب عرب ملکوں نے اسرائیل کے ساتھ الگ الگ معاہدہ کر لیا تھا، ہر معاہدہ میں ایک دفعہ یہ رکھی گئی ـــــ کہ اسرائیل اور متعلقہ عرب ملکوں کے درمیان موجودہ حد بندی مستقل ہے عارضی نہیں۔

اخوان کی ایک خفیہ مجلس میں ابو عمار نے گرج گرج کر کہا۔

"دوستو ـــ ان معاہدوں پر حقیقت پسندانہ نظر ڈالو ـــ فلسطین کی پہلی جنگ آزادی ختم ہو گئی ہے ـــــ عربوں کے ہاتھ سے آدھے سے زیادہ وہ علاقہ بھی نکل گیا ہے جو اقوام متحدہ کی قرارداد کے پیش نظر عربوں کو ملنا چاہیئے تھا۔ یہ سارا علاقہ سرسبز و شاداب علاقہ تھا۔ نئی سرحد پر واقع بے شمار دیہات کا سہاگ لٹ گیا۔ عرب عوام اپنی لہلہاتی زمینوں، پھل دار درختوں اور نارنگی کے کنجوں سے محروم ہو گئے ہیں ـــ دس لاکھ سے زائد فلسطینی عرب اردن اور دوسرے عرب ممالک میں پناہ لینے آ چکے ہیں ـــ عیسائی عرب جنہوں نے عرب قومیت کا فتنہ پروردہ مسلمانوں میں بویا تھا۔ اس جنگ میں تماشائی بنے رہے ہیں اور یہودیوں کی درپردہ امداد کرتے رہے ہیں۔ یہودی جس عرب بستی میں داخل ہوئے عیسائیوں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ لاکھوں مسلمانوں کے گھر اجڑے ہیں لیکن کسی ایک عیسائی کو بھی ادھر سے ادھر نہیں ہونا پڑا ـــ عربوں نے اس جنگ کا آغاز تذبذب، شک اور عدم اعتماد کی فضا میں کیا تھا اور اب ان میں مزید انتشار پیدا ہو چکا ہے ـــــ ایک دوسرے کو شکست کا ذمہ دار ٹھہرا رہے ہیں ـــ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں دوستو! ـــــــــ ہم مسلمان پہلے ہیں اور عرب بعد میں ـــ آؤ ہم مسلمان بن کر عہد کریں کہ ہم

استعماریت اور یہودیت دونوں کے خلاف لڑیں گے۔ اور اس حالت میں بھی لڑیں گے جبکہ ہمارے پاس کوئی ہتھیار بھی نہ ہو۔"

یہودی اور عیسائی امت رسول کے دشمن ہیں ___ اور ان کی ہمارے خلاف سازشیں دن بدن منظر عام پر آرہی ہیں ___ آؤ ہم مل کر کوئی پروگرام بنائیں۔"

اس قسم کی کئی مجالس منعقد ہوئیں، لیکن کوئی عملی صورت نظر نہ آئی۔ امریکہ و برطانیہ کا "ناجائز بچہ" خوب پھل پھول رہا تھا۔ عرب دنیا اندرونی خلفشار میں مبتلا تھی، بے چینی ... موجود تھی۔

اخوان عرب مہاجرین کی زندگی میں حرارت بکھیرنے کے لئے اور دشمن کے خلاف مزاحمت کا جذبہ پیدا کرنے کے لئے کوشاں تھی، لیکن حالات ایسے تھے کہ ان کا فوری سنبھلنا بڑا مشکل دکھائی دے رہا تھا۔ مسلمانوں اور بالخصوص عربوں کی فوجی نوعیت کی عسکری تحریک کے بڑے بڑے لیڈر جام شہادت نوش کر چکے تھے۔ عبدالقادر الحسینی جیسے مجاہد، حسن سلامہ جیسے پرجوش اخوان قوم و وطن پر قربان ہو چکے تھے۔ ابودرہ یوسف، سعید القائد، محمد صالح الحمد (ابو خالد) اب نوجوان نسل کی قیادت کے لئے موجود نہیں تھے۔ فلسطینی مہاجر شدید مایوسی اور بے چارگی کے عالم میں تھے۔

امریکہ اپنے نوزائیدہ بچے کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ اسرائیل کو امریکہ کے ممتاز اخبارات "نیویارک ٹائمز" وغیرہ مشرق وسطیٰ میں جمہوریت

کی ایک روشن مثال کے طور پر پیش کر رہے تھے، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ۱۹۵۲ء کے قانون قومیت سے عربوں کو اسرائیل میں دوسرے درجہ کی شہریت حاصل تھی۔ اس قانون کی وجہ سے ایک یہودی اسرائیل کی سرزمین پہ قدم رکھتے ہی معزز شہری بن جاتا تھا لیکن اڑھائی لاکھ عرب جو قرن ہا قرن سے اسی زمین پہ رہتے آئے تھے اور ظلم و تشدد کے باوجود اپنے گھر اور زمینیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہوئے تھے وہ اس وقت تک اسرائیل کے شہری نہیں بن سکتے تھے۔ جب تک کہ وہ یہ ثابت نہ کریں کہ وہ ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء سے پہلے فلسطین کے شہری تھے۔ حقوق قومیت کے لئے ہر عرب کو چھ شرائط پوری کرنا پڑتیں۔ جن میں سے ایک عبرانی زبان کا جاننا تھا۔

سرحدی دیہات کے عربوں کو اندرون ملک منتقل کر دیا گیا۔ ان کی زمینیں اور مکان نو وارد یہودیوں کو دی گئیں، ہر عرب کو شناختی کارڈ رکھنا پڑتا۔ فوجی حکومت ان کی نگرانی کرتی رہی۔ اور ان کے لئے سرشام کرفیو نافذ کر دیا جاتا۔

عرب دنیا کے مخالف اور اسرائیل کے حق میں امریکہ کی خبر رساں ایجنسیاں ریڈیو ٹیلی ویژن، اور اشاعتی ادارے اس جوش خروش سے سرگرم عمل تھے کہ ان کے پروپیگنڈے کے آگے گوئبلز بھی طفل مکتب نظر آتا تھا۔ یہ ساری کارگذاری ان پچپن لاکھ یہودیوں کی تھی، جو امریکہ میں مقیم ہیں اور جھوٹ گھڑنے تاریخی واقعات مسخ کر کے پیش کرنے، افسانے تراشنے میں کمال کی بنا پر امریکی معاشرہ پہ چھائے ہوئے ہیں۔ وہ عربوں کی نہایت بھونڈی تصاویر امریکہ کے

عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اسرائیل کے دلفریب انداز سے ان کو گمراہ کرتے رہتے ہیں، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

عربوں کا باہمی خلفشار انقلاب مص [illegible] رونما ہوا۔ فاروق کا عہد مصر میں شہنشاہیت کا خاتمہ تھا۔ اس واقعہ انقلاب کے بعد ۱۹۵۲ء میں مصر اور امریکہ کے تعلقات خاصے خوشگوار ہو گئے۔ یہاں تک کہ اسوان بند کی تعمیر کے لئے قرض دینے کا وعدہ کیا گیا۔ امریکہ نے آنے والے سالوں میں پانچ کروڑ ڈالر کا امدادی پروگرام شروع کر دیا۔ یہ صورت حال اسرائیل کے لئے بڑی تشویشناک تھی۔ چنانچہ صیہونی کارکن اور اسرائیلی ایجنٹ قاہرہ پہنچنے شروع ہوئے، اور جاسوسی کا ایک مضبوط حلقہ قائم کر کے کام شروع کر دیا۔ امریکی دفاتر پر بم پھینکنے اور سفارتی عملہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ پھر امریکی دفاتر میں بم پھٹنے کی وارداتیں ہونے لگیں۔

قاہرہ اور اسکندریہ کی لائبریریوں میں ایسے بم رکھے گئے جن کی شکل جیبی سائز کی کتابوں کی سی تھی۔ ان کا تیزابی مادہ چند دن بعد کام کرتا، چنانچہ شارع نواد پر امریکی دفاتر میں ایسے بموں نے تہلکہ مچا دیا۔ دو یہودی لڑکے ایسے بم امریکی دفاتر میں لے جاتے ہوئے پکڑے بھی گئے۔ ان کی نشاندہی پر اور بھی ایسے جاسوس گرفتار ہوئے، مقدمہ چلایا گیا۔ اور ان کو مختلف النوع سزائیں دی گئیں لیکن امریکی اخبارات میں اسرائیلیوں نے ان کو ایسا رنگ دیا کہ امریکہ اور مصر کے درمیان پھر سے معاندانہ فضا پیدا کر دی، یہ سارا پروپیگنڈے کا زور تھا، حالاں کہ امریکہ سمجھتا تھا کہ قصور کس کا ہے۔

۱۹۵۵ء میں امریکہ نے کوشش کی کہ اسرائیلیوں اور عربوں کے درمیان مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ مذاکرات شروع ہوئے۔

امریکہ کے کہنے پر صدر ناصر نے اسرائیلی وزیر اعظم بن گوریان کی ملاقات کی پیش کش کو ٹھکرایا نہیں ــــ اگرچہ انہوں نے پیش کش قبول بھی نہیں کی تھی لیکن عام تاثر یہی تھا کہ صدر ناصر شاید ملاقات پر آمادہ ہو جائیں لیکن اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں اسرائیلی فوج نے غزہ پر حملہ کر دیا۔ مصالحت کی ساری کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

جملہ عرب حکومتیں حالات کے پلٹتے رخ کا اندازہ کرتی رہیں۔ کیمپوں کی زندگی سے تنگ آ کر فلسطینی مہاجرین اپنے دوستوں کی مدد سے چھوٹے چھوٹے چھاپہ مار گروہوں میں بٹ کر عرب سرحدوں پر اسرائیل کی بڑھتی ہوئی جارحیت کا جواب دینے لگے۔ غزہ پر دست درازی ہوئی تو مصری فوج کے انٹیلی جنس کے سربراہ مصطفیٰ حافظ نے صدر ناصر کے ایما پر فدائیوں کی ایک تنظیم قائم کی۔ جمال ناصر تو اس تنظیم میں صرف مصریوں کو بھرتی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مصطفیٰ حافظ کے مشورہ پر فلسطینی عربوں کو بھی اس تنظیم میں بھرتی کیا جائے گا۔ انہیں چھاپہ مارنے، مشین گن چلانے، دستی بم پھینکنے کی تربیت دی جاتی، ہر فدائی کو چھ پونڈ ماہانہ ملتے تھے۔

ابو عمار ان دنوں جامعہ سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد بم سازی اور دیگر بارودی مصنوعات کی تربیت کے لئے ملٹری کالج میں داخل تھا۔ احمد اگرچہ قانون کی ڈگری حاصل کر چکا تھا لیکن وہ قاہرہ سے

کہیں باہر نہ جا سکا تھا، اس نے ایک مصری کمپنی میں مشیر قانون کی حیثیت سے ملازمت اختیار کر رکھی تھی، پھر بھی اسے حریت پسند جذبوں کی جلا کے لئے کافی مواقع ملتے رہے ـــ وہ اب حالات کو زیادہ واضح صورت میں سمجھنے لگا تھا۔ اور اس کے سوچنے کے انداز میں پختگی آگئی تھی۔

علی محجوب، شیخ کریم، صالحہ ناصر، اور طلحہ سے اس کی باقاعدہ خط و کتابت جاری تھی ـــ علی محجوب اسے ملنے نہیں آسکا تھا۔ اس کی صحت اور ذمہ داریوں نے اسے طویل سفر کی اجازت نہیں دی تھی۔ لیکن اب وہ قاہرہ آرہا تھا ـــ بظاہر اس کی آمد کا مقصد سارہ کی تعلیم کا بندوبست تھا۔ کیونکہ یروشلم کے نصف حصہ پر اسرائیلی قبضہ سے بہترین درسگاہیں اس طرف ہی رہ گئی تھیں ـــ علی محجوب کے ساتھ اس کی بیوی بھی آرہی تھی۔

احمد نے سوچا۔ سارہ کتنی بڑی ہو گئی ہو گی؟

پھر اس نے خود ہی اندازہ کیا ـــ آج سے سات برس پہلے وہ دس برس کی تھی اور اب تو وہ سترہ برس کی جوان دوشیزہ ہو گی۔

وہ کتنی عقل مند اور تیز تھی۔ اب تو اس کا سامنا بھی مشکل ہو گا۔

پھر اس نے دل کو تسلی دی ـــ کوئی بات نہیں ـــ میں بھی تو ان سات برس میں بھرپور تجربات کی روشنی میں پلتا رہا ہوں ـــ اسے بڑی بے تابی تھی کہ وہ کب آتے ہیں۔؟

کیونکہ اب تو فضائی سفر بھی شروع ہو چکا تھا۔ اور القدس کے ہوائی مستقر سے قاہرہ تین گھنٹوں سے زیادہ کا راستہ نہیں تھا۔

وہ انہی سوچوں میں گم تھا کہ اس کا ایک پرانا دوست اس سے ملنے آ گیا۔ باتوں باتوں میں صدر ناصر کی قائم کردہ فدائی تنظیم کا ذکر آ گیا۔ اس کا دوست بھی فدائی تحریک کا منسلک تھا اور غزہ میں کامیاب چھاپے مار کر لوٹا تھا۔

اس نے بتایا کہ غزہ کی تنظیم میں چھ صد فدائی موجود ہیں۔ اس تنظیم کے چار گروپ بنا دیئے گئے ہیں۔ اردن میں یہ کام عمان میں مقیم فوجی اتاشی کرنل صلاح مصطفیٰ کی مدد سے ہو رہا ہے ــــ اردن میں تنظیم کے اہم مراکز قلقیلیہ اور حسان ہیں۔ دنیا مان گئی ہے کہ ان فدائیوں کی سرگرمیوں سے یہودی ایک پل چین سے نہیں گذار سکتے۔ غزہ تو اسرائیل کے پہلو میں ایک کانٹا بن گیا تھا اور اسرائیلی اس کانٹے کو نکالنے کے لئے موقع کی تلاش میں تھے۔ وہ اس تنظیم کو ختم کرنے کے منصوبے سوچنے میں مشغول تھے۔

اس کا دوست چلا گیا تو اس نے ابو عمار سے ملنے کا پروگرام بنایا۔ وہ ملٹری کالج پہنچا۔ دفتر استقبال سے معلوم ہوا کہ ابو عمار کسی مشن پر قاہرہ سے باہر بھیج دیئے گئے ہیں۔ وہ سوچتا رہا کہ کہاں بھیجا گیا ہوگا اسے ــــ اسے یوں ہی احساس ہوا جیسے اسے غزہ بھیجا گیا ہو، کیونکہ اسرائیلی اسی علاقے میں زیادہ جارحانہ کارروائیوں کے مرتکب ہو رہے تھے ــــ اس کا یہ خیال کچھ اس گفتگو کے نتیجہ کے طور پر بھی تھا جو اس نے ابھی تھوڑی دیر پیشتر اپنے دوست سے کی تھی۔

جب وہ واپس لوٹ رہا تھا تو اسے شاہراہ بیروت سے گذرنا پڑا۔ اسے وہ دن یاد آئے جب شازیہ اسے اپنی سازش کا شکار بنا رہی تھی ــــ اور وہ

کتنا قیامت خیز رقص تھا ـــ وہ بیلی ڈانس ـــ اس وقت وہ ابھی نوجوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ رہا تھا۔ اب وہ پچیس برس کا نوجوان تھا ـــ اس نے بے خیالی میں شازیہ اور اپنی بہن طلحہ کا موازنہ کیا۔ پھر طلحہ اور صالحہ ناصر کی شخصیتوں کا جائزہ لیا۔

پھر وہ شازیہ کے متعلق سوچنے لگا۔

شازیہ کے متعلق سوچتے سوچتے اس کے خیالات سارہ کی طرف پلٹ گئے ـــ

وہی سارہ جسے اس نے دس برس کی عمر میں یروشلم میں دیکھا تھا ـــــ

وہی سارہ جسے اس نے مصر کے ہوائی اڈہ پر خوش آمدید کہا تھا۔

وہی سارہ جو علی محجوب جیسے اخوان لیڈر کی بیٹی تھی۔

وہی سارہ جو سیکنڈری سکول میں تعلیم کے بعد قاہرہ آئی تھی ـــــ اور جس نے اپنی لیاقت اور کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ جو طلحہ سے بڑھ کر ذہین، اور صالحہ ناصر سے بڑھ کر جوشیلی تھی ـــ جو کسی بھی مسئلے میں سیاست یا چال کی قائل نہیں تھی ـــ وہ اخوانوں کی دوست ـــ فدائیوں کی معترف اور پرستار تھی۔

وہی سارہ جس نے چار سال میں جامعہ سے معاشیات، سیاسیات اور امور خانہ داری کے مضامین میں ڈگری حاصل کی تھی۔

وہی سارہ ـــــ آج کئی برس بعد اسے مفراق کے ریتیلے ٹیلوں سے

ڈھلتی نظر آتی تھی ــــ وہ اس کے قریب تھی۔

ریت ٹھنڈی ہو چلی تھی ــ کھجوروں کے درختوں پہ سائے منڈلانے لگے تھے۔ سورج گہرائیوں میں چلا گیا تھا۔ آسمان سرخ ہو رہا تھا ــ وہ سارہ کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی اپنی عمر اب چھتیس برس کے قریب تھی۔ اس نے سارہ کی عمر کا حساب لگایا، ۲۷ برس بنتی تھی۔

جوں جوں تاریکی امڈ رہی تھی۔ اسے سارہ کی شخصیت زیادہ افسانوی معلوم ہو رہی تھی ــــ قد و قامت میں عام عرب دوشیزاؤں سے ذرا سر نکالتی تھی۔ رائفل، مشین گن اور دستی بم اس کے ہاتھوں میں کھلونے لگتے تھے۔ بے حد ذہین، آنکھوں میں متانت رقص کناں تھی:

تعلیم کے دوران وہ قاہرہ میں اکثر احمد سے ملتی رہی تھی ــــ ۱۹۵۶ء کے سویز کے معرکے میں علی محجوب شہادت پا گئے تھے۔ وہ کسی کام کے سلسلہ میں غزہ میں تھے کہ اسرائیل نے حملہ کر دیا۔ اخوان مجاہدین نے جی توڑ کر مقابلہ کیا۔ نئی تنظیم کے ارکان بڑا جی توڑ کر لڑے، لیکن جب تربیت یافتہ منظم فوجیں کچھ نہ کر سکیں تو ایسی تنظیموں سے کیا ہو سکتا تھا۔ فدائیوں پر اتنی کاری ضرب لگی کہ ان کا اٹھنا محال ہو گیا۔

ویسے بھی صدر ناصر کے دورِ اقتدار میں ایسے کئی کام ہو رہے تھے جن سے اسلام سے گہری محبت رکھنے والے بے حد پریشان تھے ــ ان لوگوں میں دو گم نام ہستیاں بھی تھیں ــــ احمد اور سارہ ــــ اور سارہ جو سیاسیات کی طالبہ تھی اس کی تو عجیب حالت تھی وہ صدر ناصر کو مشکوک

نظروں سے دیکھتی تھی۔ اس کے استدلال میں اتنا وزن تھا کہ احمد دم بخود رہ جایا کرتا تھا۔

وہ کہتی تھی ______

"ناصر کو استعماری طاقتیں برسر اقتدار لائی ہیں ___ فاروق مصر اور سوڈان کا الحاق چاہتا تھا۔ انگریزوں نے شاہ فاروق کو رام کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن فاروق نہ مانا۔ اس کا یہ قدم عرب انضمام کی پہلی کڑی تھی ___ دوسری تنظیم جس سے یہودی نالاں تھے۔ وہ اخوان المسلمین تھی، اخوان کی موجودگی میں وہ آرام سے اپنے ارادوں کی تکمیل نہ کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایک ایسا شخص تلاش کر لیا جو ان کے عزائم کو عملی جامہ پہنا سکے، چنانچہ اقتدار سنبھالتے ہی عوام کی آنکھ چھونے کے لئے ایک طرف تو ناصر نے فدائیوں کی تنظیم قائم کی، اور دوسری طرف اس نے سوڈان اور مصر کا اتحاد نہیں ہونے دیا۔ اخوان کے پچاس ہزار افراد شہید کر دیئے گئے۔ اور عرب ممالک کی پیٹھ میں ایک ایسا خنجر بھونک دیا جو زہر میں بجھا ہوا تھا۔ خدا جانے اس کا زخم کبھی مندمل بھی ہوگا یا نہیں "

احمد کے ذہن میں سوالات ابھرتے ___ وہ پوچھتا۔

"یہ بات درست نہیں۔ تمہاری سوچ کا انداز منفی ہے، اگر ایسا ہے تو پھر اسرائیل، فرانس اور برطانیہ نے مصر پر کیوں حملہ کیا ؟"

"وکیل صاحب، یہی تو وہ فریب ہے جس میں لاکھوں افراد مبتلا ہیں۔ لیکن فریب کے پردے اب چاک ہو رہے ہیں ___ سویز کے حملے کا بنیادی

مقصد اسرائیل کی توسیع تھی۔ جسے وہ بالاقساط حاصل کر رہا ہے ۔ ۱۹۵۶ میں ایک قسط حاصل کر چکا ہے۔ دوبارہ پھر وہ موقع آنے پر حاصل کرے گا ۔ ان تینوں طاقتوں کو امریکہ کی امداد حاصل تھی، لیکن آخر وقت میں امریکہ پیچھے ہٹ گیا ۔ وہ پیچھے کیوں ہٹا؛ اس کو میرے خیالات کی روشنی میں جانچو ۔ اس وقت کے وزیر اعظم برطانیہ مسٹر انتھونی ایڈن نے اپنی ڈائری میں تفصیل سے اس صورت حال کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے مصر کے دوست روس کا پول بھی کھول کر رکھ دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔

"سویز کے حملے میں بنیادی مقصد کو مقامی قیادتوں کے اختلاف نے نقصان پہنچایا ورنہ اسرائیل اپنے عزائم میں بڑی حد تک کامیاب ہو جاتا ۔ باقی رہی روس کی دھمکیاں تو یہ ڈپلومیسی کی باتیں ہیں جس سے چشم عالم میں دھول ڈالنا مقصود تھا۔"

سارہ جواب دیتی لیکن احمد کی تسلی نہ ہوتی۔ وہ تو جمال ناصر کو عرب کا ہیرو سمجھتا تھا ۔ وہ پوچھتا۔

"وہ تو کھلم کھلا امریکہ کو برا بھلا کہتا ہے۔ وہ امریکہ کا آلۂ کار کیوں کر ہو سکتا ہے؟"

"یہ سیاست کے داؤں پیچ ہیں ۔ قانون کی موشگافیاں نہیں کہ مملکت کا آئین غلط ہو یا درست ۔ اسی کی روشنی میں سب کچھ جانچا جائے ۔ جنرل برنس نے اپنی کتاب (ہو کنز مینشن) میں لکھا ہے کہ داخلی ضروریات

کے تقاضے پورے کرنے کے لئے ایسے ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں اپنی قیادت کی بقا و استحکام کے لئے ایسا بہت ضروری ہے، اگر امریکہ اور مصر ایک دوسرے کے دشمن ہیں تو میرے سادہ سے سوال کا جواب دیجئے ۔۔۔ امریکہ ناصر کو اتنی مدد کیوں دے رہا ہے۔ میں معاشیات کی طالب علم بھی ہوں، اور مجھے علم ہے کہ دنیا بھر کے تمام ممالک سے مصر فی کس زیادہ امداد وصول کر رہا ہے ۔۔۔ آخر یہ سب کچھ کیوں ہے ۔۔۔ امریکہ ہرگز اتنا بے وقوف نہیں کہ وہ اپنے دشمن ملک پر روپیہ ضائع کرتا رہے ۔۔۔ امریکہ نے مصر میں جو کچھ کرایا ہے وہ محض اسرائیل کی جڑیں مضبوط کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے اور کچھ نہیں ۔۔۔ آپ دستاویزی ثبوتوں کو تو نہیں جھٹلا سکتے نا۔

اخوان المسلمین کے خاتمہ کے بعد اکتوبر ۱۹۵۵ء میں صدر ناصر نے نیو یارک ٹائمز کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا۔

"آج کوئی عرب یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ ہمیں اسرائیل کو ختم کر دینا ہے۔ عربوں کا صرف یہ مطالبہ ہے کہ فلسطین مہاجرین کے زندہ رہنے کا فطری حق تسلیم کر لیا جائے، ان کی جائدادیں ان کو واپس دے دی جائیں جیسا کہ اقوام متحدہ کے ریزولیشن کی رو سے طے ہوا تھا۔ کیا یہ اسرائیل کے وجود کو تسلیم کرلینے کے مترادف نہیں ۔۔۔ ناصر کے پیدا کردہ عرب قومیت کے نعرے نے پورے عالم اسلام کی وحدت اور سالمیت کو خطرے میں ڈال دیا ہے ۔۔۔ سارہ بلا تکلف بولے چلی جاتی۔

احمد حیران رہ جاتا کہ ڈگری کالج کی طالبہ میں اتنی سوجھ بوجھ کیسے پیدا

ہو گئی ہے۔ یقیناً یہ تربیت کا اثر تھا اور علی محجوب کی شخصیت کا مکمل پرتو اس میں موجود تھا۔ ویسے بھی جب وہ باتوں میں اور خاص طور پر سیاسی باتوں میں الجھ جاتی تو اسے نہ تو وقت کا احساس رہتا اور نہ کسی اور مصروفیت کا خیال تک۔ احمد اسے اپنے قریب رکھنے کی خاطر مزید سوالات کرتا جاتا۔ ویسے بھی باتیں کرتے وہ اسے بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

وہ پوچھتا۔

"بھئی تمہیں تو ناصر کی ہر بات بری نظر آتی ہے۔ اگر عرب حکومتیں متحد ہو جائیں تو اس سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ ہی پہنچے گا نا۔ عرب قومیت کا نعرہ کوئی برا تو نہیں۔"

وہ کہتی۔

"بھئی میں کتنی بار اس بات پر مغز کھپا چکی ہوں کہ جب آپ محض عرب قومیت کی بنا پر اپنی سیاست کی تشکیل کرتے ہیں اور اسلام کو اس تشکیل میں دخیل نہیں ہونے دیتے تو ان مسلمانوں کو آپ سے کیا دلچسپی رہے گی، جو عرب نہیں ہیں یا جو ملت کی بنیاد پر متحد ہونا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو اسلامیت کے جذبے سے ہٹانا آسان کام نہیں، اگر ایک دفعہ ہمارے دشمن اس میں کامیاب ہو جائیں تو عربیت سے ہٹا کر عراقیت، اردنیت، شامیت اور مصریت میں لانا دشوار نہیں۔ اسی طرح عالم اسلام ٹکڑے ٹکڑے ہو سکتا ہے۔ عربی زبان کو عرب قومیت کی بنیاد ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی تعریف میں یہودی اور عیسائی بھی عرب قرار پاتے ہیں، عرب قومیت کا لبادہ

ادھر کر اسلام کو جو نقصان پہنچے گا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ۔۔۔ اور پھر دیکھیئے، عرب قومیت کے نام پر یمن میں کیا ہو رہا ہے ۔۔۔؟ اڑھائی لاکھ یمنی عربوں کے خون سے عرب اتحاد کے حامی کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں ۔۔۔ عراق کی تاریخ نے کیا کیا پلٹے کھائے ہیں۔ شام میں کس نوعیت کے انقلابات آئے ہیں اور نائجیریا میں کیا کیا ہوا ۔۔۔ ان سب انقلابات میں کون سا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ سب جانتے ہیں، اور آپ بھی جانتے ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں ۔۔۔ قبرص کے فوجی یونانی اس کے یار ہیں۔ متعصب ہیل سلاسی اس کا دم ساز ہے ۔۔۔ اسرائیل شام پر حملہ کرتا ہے تو وہ خاموش رہتا ہے ۔۔۔ اخوان اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی صلاحیت رکھتے تھے، اور وہ مسلسل تشدد کی چکی میں پس رہے ہیں۔"

ان بھیانک حقیقتوں کا جواب احمد کے پاس کچھ نہ ہوتا۔ وہ کہتا۔

"اب تم تھک گئی ہو ۔۔۔ چلو کسی ریسٹوران میں کھانا کھائیں۔"

"نہیں میں ریستوران میں کھانا نہیں کھا سکتی ۔۔۔ میں دارالاقامہ واپس جاؤں گی، وہاں کھانا میرا منتظر ہوگا۔"

"لیکن مجھے تمہارے ساتھ کھانے کا جو لطف آئے گا اس سے تو مجھے محروم نہ کر دینا۔"

"تو پھر ریستوران میں نہیں ۔۔۔ آپ کے گھر چل کر میں خود پکاؤں گی۔"

احمد کو اور کیا چاہیئے تھا۔ وہ فوراً آمادہ ہو جاتا۔ کبھی پیدل، کبھی گھوڑا گاڑی اور کبھی ٹرام وغیرہ میں وہ گھر پہنچ جاتے۔ ایسی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں۔ احمد اس کے چلے جانے کے بعد تنہائی محسوس کرتا۔ وہ کئی بار سوچ چکا

تھا کہ اسے اپنا گھر بسا لینا چاہیئے۔ لیکن وہ مصر کی کسی لڑکی سے شادی کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسے کئی دفعہ بعض لوگوں نے ترغیب بھی دی تھی۔

پھر شازیہ کے واقعہ کے بعد وہ کسی پہ اعتماد کرنے کو بھی تیار نہ تھا۔ اس کی بہن طلحہ بھی کئی بار اسے کہہ چکی تھی کہ اب اسے کس قسم کی زندگی اختیار کرنی چاہیئے تھی ۔ اس نے بھی دو تین لڑکیوں کے نام لئے تھے۔ لیکن احمد ان کے متعلق کچھ بھی نہ جانتا تھا۔

وہ اکثر تنہائیوں میں سوچتا۔ اس کی بیوی کیسی ہونی چاہیئے۔ وہ مختلف معیار مقرر کرتا، اور اپنے ملنے جلنے والوں کی تجاویز میں آنے والی لڑکیوں کے متعلق سوچتا۔ گھوم پھر کر اس کی سوچ کا دھارا سارہ کی طرف ہی آ رکتا۔ سارہ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اس کے ذہن میں جلوہ گر ہوتی۔ اور پھر وہ کچھ نہ سوچ سکتا۔ وہ سارہ سے ڈرنے کی حد تک متاثر تھا، اسے یہی فکر رہتا کہ اگر اس نے سارہ سے اپنے ارادوں کی زبان سے بات کی تو ممکن ہے وہ برا مان جائے۔ اور پھر وہ اسے اتنی بے تکلفی سے نہ ملے جلنی سے وہ اب ملتی تھی۔ اسے اس امر کا بھی احساس تھا کہ سارہ اس میں دلچسپی لیتی ہے۔ کبھی کبھی اس کی باتوں میں ایسی بات آجاتی ہے کہ وہ خود ہی جھینپ جاتی ہے یا نظریں چرا لیتی ہے۔ یا پھر موضوع بدل دیتی ہے۔

جامعہ میں ایک ثقافتی پروگرام تھا۔ مختلف ممالک کے نمائندے آئے ہوئے تھے، احمد بھی وہاں مدعو تھا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ سارہ وہاں نہیں ہے۔ تلاش کے باوجود وہ اسے نہ ملی، جب وہ اپنے گھر آیا تو وہ اس کی منتظر

تھی۔ اس نے مجھے تعجب سے پوچھا۔

"تم وہاں ثقافتی پروگرام میں نہیں تھیں؟"

"کیا تھا اس پروگرام میں؟"

"بڑا جاندار تھا۔ میں الفاظ میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔"

"پھر بھی کچھ تو یاد ہوگا نا؟"

"ہاں کچھ تو یاد ہے۔۔۔ امریکہ کی مس جینٹ نے جزیرہ ہوائی کی دوشیزہ کا رقص پیش کیا تھا۔ جب وہ پھولوں کے ہار گلے سے اتارتی تھی تو سفید حسن سے آنکھیں چندھیا جاتی تھیں، اس کی ٹانگوں پہ کیلے کی چھال کے چھلکے کا لہنگا یوں تھراتا تھا جیسے اس کا جسم لرزاں ہو۔"

"واہ واہ ۔۔۔ خوب ۔۔۔ اور کس ملک کی دوشیزہ نے آپ کو زیادہ متاثر کیا؟"

"عراق کی شبانہ نے۔"

"اس نے کیسا رقص کیا؟"

"اس نے کمال کر دیا۔ اس نے جسم کے اشاروں سے پہلے تو ظاہر کیا کہ وہ ڈر کر بھاگ رہی ہے ۔۔۔ اس کے سامنے ایک عرب مجاہد آگیا ۔۔۔ اس نے اشارات سے بتایا کہ یہودی اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ عرب مجاہد نے اسے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں ۔۔۔ اس نے گولی چلائی ۔۔۔ خوشی سے دیوانی ہو کر شبانہ نے اپنے جسم کو ایسے بل دیئے۔۔۔ مجاہد کے گرد یوں چکر لگائے کہ لوگ وجد میں آگئے۔۔۔ اپنے جسم سے بھاری بھاری کپڑے آہستہ آہستہ

اتارے اور پھر اس مجاہد کو نے کر اندھیرے میں چلی گئی۔ گویا اس نے اپنا آپ اس کے حوالے کر دیا۔"

"تو یوں کہیئے۔ کہ مجاہد کو اس نے اپنا جسم انعام کے طور پر پیش کیا۔ آپ اپنے بھائیوں کی یوں رسوائی دیکھ کر تڑپے نہیں بلکہ تالیاں بجا بجا کر داد دی۔"

"واقعی مجھے یہ عرب مجاہد والی بات پسند نہیں آئی۔ ویسے رقص خوب تھا۔"

"اور کس دوشیزہ نے آپ کو زیادہ متاثر کیا۔"

"اور کس دوشیزہ نے مجھے زیادہ متاثر کیا۔ جس نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ دوشیزہ اس وقت وہاں نہیں تھی۔ وہ میرے گھر آکر بیٹھی تھی۔"

سارہ جھینپ گئی۔ نظریں نیچی کر لیں۔ زبان پہ تالے پڑ گئے۔ احمد نے چند لمحے توقف کے بعد کہا۔

"آخر تم بتاؤ تو سہی کہ تم وہاں کیوں نہیں تھیں۔"

"اسلام دشمن قوتیں ثقافت کے روپ میں بھی اسلامی ممالک میں ایک زہر پھیلا رہی ہیں۔ محکم عقائد اسلام پر ضرب لگانے کا کام ثقافت کے نام پر ہو رہا ہے۔ اسلام سے بیزاری، نوجوانوں میں بے اعتقادی، گمراہی اخلاقی بے راہ روی سب کچھ ثقافتی گولیوں کا کرشمہ ہے۔ ہم ان گولیوں کو کھانے میں حظ اٹھاتے ہیں۔ لذتیت کا ایسا شکار ہوتے ہیں کہ اپنی بہنوں

بیٹیوں کو عریاں دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں ـــــ یہ کیسی ثقافت ہے ـــــ اور مجھے تو ایسی ثقافتی تقریبات سے گھن آتی ہے ـــ کیا آپ برداشت کر سکتے ہیں کہ طلحہ باجی ایسے پروگرام میں حصہ لے۔"

"توبہ توبہ کیسی بات کرتی ہو ـ طلحہ تو میری بہن ہے ـــ میں تو یہ برداشت بھی نہیں کر سکتا کہ تم ایسے پروگرام میں حصہ لو ـــ دیکھنے کی بات اور ہے۔"

"دیکھنے کی بات بھی وہی ہے۔"

"ہماری نوجوان نسل ثقافت کے سیلاب میں از خود اس لئے بہہ رہی ہے کہ اسے نتائج کا اندازہ نہیں، ثقافت کا نفوذ غیر شعوری طور پر بڑھتا جا رہا ہے اور یہ جرم کی حد تک بڑھتا جائے گا ـــ جرم کرنا اور اس کی سرپرستی کرنا ایک ہی بات ہے۔"

"خیر چھوڑو ـــ چلو کچھ پکاؤ ـــ کھلاؤ۔"

وہ اٹھ کر مختصر سے کچن میں چلی گئی اور کھانا پکانے لگی۔

احمد اسے اپنائیت کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ کیا وہ اسے دل کی بات کہہ دے ـــ عرب دنیا میں یہ بات کہنا کوئی بڑی بات نہیں ـــ یورپی اقوام کی تقلید میں عرب دنیا کی لڑکیاں ماسوائے سعودی عرب کے بہت آگے نکل گئی ہیں لیکن اس کے باوجود سارہ کو ایسا کہنا اس کے بس کی بات نہ تھی ـــــ

ہاں اس نے اپنی بہن طلحہ کو کئی بار سارہ کے بارے میں لکھا تھا۔ طلحہ نے عمان میں مقیم سارہ کے بھائی سے بات بھی کی تھی، اس کے بھائی نے کہہ دیا تھا اسے کوئی اعتراض نہیں ـــ سارہ خود بڑی ذہین ہے ـ بلکہ اس نے اپنی بیوی سے اسے چھٹی بھی

لکھوائی تھی۔ جس میں احمد کا ذکر تو نہیں تھا لیکن اسے کہا گیا تھا کہ وہ عمان آئے تاکہ اس کی شادی کی جائے۔ سارہ نے اسے ٹال دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ابھی اس کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جب ارادہ ہو گا تب وہ لکھے گی۔

احمد اس سے اور وہ احمد سے ملتی رہی — ایک انجانا لگاؤ باہم پیدا ہو چکا تھا۔ اشاروں اور استعاروں سے اس لگاؤ کا اظہار بھی ہوتا تھا لیکن کھل کر بات نہ سارہ نے کی اور نہ ہی احمد نے —

عجیب اتفاق تھا کہ احمد ناصر کا حامی تھا اور سارہ اس کے خلاف تھی۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کا دل حالات کے ساتھ دھڑکتا تھا اور دونوں کو یہ فکر دامن گیر تھا کہ آخر کیا ہوگا ؟ عربوں کا مستقبل کیسا ہوگا ؟ اور مشرق وسطیٰ پہ چھائے ہوئے سازشوں کے بادل کب چھٹ سکیں گے ؟

جمال ناصر نے اخوان کو کچلنے کے لئے فدائی تنظیم تشکیل کی۔ لیکن اسے بھی مصلحتوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ انہی دنوں ایک تنظیم آزادئ فلسطین کے نام سے وسیع بنیادوں پر قائم کی۔ احمد شقیری کو اس تنظیم کا سربراہ بنایا گیا۔ اس تنظیم نے عربوں کو لڑوانے کے سوا اور کوئی کام نہ کیا۔ احمد شقیری کی شعلہ بیانیوں اور صلاحیتوں کا نشانہ اردن اور سعودی عرب بنے رہے۔ عرب اتحاد کا نعرہ کھوکھلا معلوم ہونے لگا۔

یہ صورت حال احمد اور سارہ کے لئے بحث کا موضوع بھی بنتی اور ان کو ایک دوسرے کے قریب رہنے کے مواقع بھی بہم پہنچاتی رہی۔

ٹھنڈی ریت پہ لیٹے ہوئے مفراق کے صحرائی ٹیلوں سے ابھرتے ہوئے

چاند کو دیکھ کر سارہ نے ایک عربی گیت بڑی دھیمی سُر میں گنگنایا۔

"اے چاند۔ پیارے چاند
تیری چاندنی سے دکھی فلسطینیوں کو کیا
تم مشرق و مغرب دیکھتے ہو
بتاؤ تو سہی میرا محبوب کہاں سو رہا ہے؟"

احمد نے ہاتھ بڑھا کر سارہ کے بالوں کو چھوا۔ پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اسی لمحہ دور سے سارہ کو ذکیہ نے آواز دی۔

"سارہ۔"

سارہ اٹھ کر اس کی طرف دوڑی اور پھر واپس آگئی۔ اور احمد سے کہا۔

"چلیئے طلحہ باجی سے بات کیجئے۔ وائرلیس پہ۔"

"مجھے زندگی میں دو مرتبہ حیرت ہوئی ہے۔ اپنی باجی سے گفتگو کرنے کے بعد" احمد نے سارہ کے آتے ہوئے کہا۔

سوالیہ انداز میں سارہ نے سر اٹھا کر اپنے قریب پہنچتے ہوئے احمد کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ سارہ نے کوئی بات نہیں کی۔

احمد نے پھر خود ہی کہا۔

"سارہ اس کی آواز کافی بھاری تھی۔ تم نے مجھے پوچھا ہی نہیں کہ وہ کون سے دو مرحلے تھے۔ جب مجھے بے حد حیران ہونا پڑا۔"

"میرا خیال تھا آپ خود ہی بتاتے جائیں گے۔ مگر آپ تو گھبرائے ہوئے ہیں۔ کیا بات ہے۔"

"نہیں میں گھبرایا ہوا نہیں، ویسے بات ہی ایسی ہے۔"

"پھر کہیئے نا۔"

"ایک دفعہ تو مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب مجھے پتہ چلا کہ ۱۹۴۷ اور

۱۹۴۸ء کے دوران اپنے ماں باپ کے شانہ بشانہ یہودیوں کے خلاف بے قاعدہ فوجی دستوں میں شامل ہو کر لڑنے والا اور یہودیوں کی بدنام تنظیموں "ہگانہ اور برگون" کے خلاف صف آرا رہنے والا طلبائے فلسطین کی فیڈریشن کا سربراہ ابوعمار دراصل یاسر عرفات ہے ـــ اور اب وہ ہی تنظیم کا سربراہ ہے :

"اس کی شخصیت ہی ایسی ہے۔ اس نے اپنے عمل و کردار سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہی یہودیوں پر عرصہ حیات تنگ کر سکتا ہے ـــ اسے بے قاعدہ افواج میں ممتاز افسر کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے معرکوں کے علاوہ ۱۹۵۲ء میں سویز کے علاقے میں برطانوی افواج کے ساتھ جنگ کا آغاز ہوا تو فلسطینی دستوں کی کمان عرفات کے ہاتھ میں تھی۔ ۱۹۵۶ء میں پورٹ سعید' اور ابوکبیر کے مقام پہ جب فرانس، برطانیہ اور اسرائیل کی افواج اور مصری فوجوں میں تصادم ہوا، تو عرفات نے چھاپہ مار کی حیثیت سے بڑا کام کیا۔ غزا کے علاقہ میں جب اسرائیلی افواج کو فوجی نوعیت کی کامیابیاں حاصل ہونے لگی تھیں تو اس نے ایک خفیہ تنظیم کے قیام کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ اسے ۱۹۵۷ء میں مصر سے نکال کر کویت جانا پڑا جہاں فلسطینی طلباء میں سے اکثر خلیج فارس میں تیل کی افزائش اور اس صنعت کی ترقی کو دیکھ کر وہاں پہنچ گئے تھے؛

'ہاں ہاں ـــ اب تو میں یاسر عرفات کے متعلق بہت کچھ جانتا ہوں ـــ بلکہ یہ بھی جانتا ہوں کہ غزہ پر قبضہ کے بعد وہ فلسطینی نوجوانوں کی ایک موثر فوجی تحریک اور مقبوضہ خفیہ تنظیم قائم کرنا چاہتا تھا ـــ اب اس کی ضرورت اس لئے بھی تھی کہ عرب حکومتیں ایسی کسی تنظیم کی تشکیل کرنے کی فلسطینی مہاجرین کو اجازت

نہیں دے رہی تھیں ـــ لیکن غزہ پر اسرائیل کا قبضہ عربوں کے لئے ایک چیلنج سے کم نہ تھا۔ چنانچہ یاسر عرفات نے تنظیم کے خفیہ حلقے قائم کئے ـــ اس خالص فلسطینی تنظیم کا نام ہی "الفتح" ہے ـــ لیکن میں جو بات کر رہا تھا وہ تنظیم سے متعلق نہیں۔ وہ یاسر عرفات سے متعلق ہے جو ابو عمار کے نام سے اب بھی مشہور ہے ـــ حیرانگی اس بات کی ہے کہ تمہارے ابا نے اس کی تعریف کی، صاتحہ نامراب اس کی دست راست ہے ـــ اس نے بھی اس کی تعریف کی ـــ میں اس سے ملتا رہا ہوں۔ آپریشن واٹر لیک، میں میں اس کے ساتھ تھا، اس نے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ اتنا عظیم آدمی ہے"

"عظیم آدمیوں کی عظمت کی یہی نشانی ہے کہ ان میں عجز و انکساری اور شفقت کا جذبہ نمایاں ہوتا ہے" سارہ نے جواب دیا۔

"ہاں یہ بات میں نے تمہارے والد بزرگوار میں بھی دیکھی" احمد نے جواب دیا۔

"وہ بھی یاسر کے مداح تھے"

"لیکن مجھے انہوں نے کبھی نہیں بتایا کہ ابو عمار کا اصل نام یاسر عرفات ہے"

"انہوں نے بتانا مناسب نہ سمجھا ہوگا"

"ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو"

"اچھا آپ دوسری مرتبہ کب حیران ہوئے؟"

"اب اسی لمحے ـــ جو ابھی گزرا ہے ـــ طلحہ باجی سے بات کرنے کے بعد"

"بھلا بوجھو تو"

"میں کیسے بوجھ سکتی ہوں۔؟"

"تم بہت ذہین اور تیز ہو نا"

"یہ آپ کا خیال ہے؟"

"نہیں یہ تم کسر نفسی کر رہی ہو ـــ میں تو تمہارا مدت سے قائل ہوں"

"میں بھی اس لمحے بڑی حیران ہوئی ہوں"

"کس لمحے؟"

"جب آپ نے میرا قائل ہونے کا اعتراف کیا ہے"

"واقعی یہ سچ ہے ـــ میں تمہارا قائل ہوں"

"لیکن آپ نے آج تک، یہ تو تسلیم نہیں کیا۔ کہ روس اور امریکہ، کمیونسٹ اور جمہوریت پسند بلاک دونوں یہودی کٹھ پتلی ہیں"

"پھر بحث ہو جائے گی ـــ برطانیہ، فرانس اور امریکہ میں تو یہودیوں کا اثر تسلیم کیا جا سکتا ہے ـــ چند مثالیں بھی دی جا سکتی ہیں۔ لیکن روس پہ یہ الزام درست نہیں آتا"

"پھر آپ میرے قائل ہونے کا اعتراف کر کے مجھے شرمندہ کریں گے ـــ یا تو آپ مجھے جان بوجھ کر بناتے ہیں، یا واقعی آپ کی نظر سے ایسی دستاویزات نہیں گذریں جن سے یہ ثابت ہو تا کہ روس ـــ بالخصوص آج کا روس، یہودی فکر و عمل کی پیداوار ہے، اور اس کی باگ ڈور بھی استعماری طاقتوں کی باگ ڈور کی طرح یہودی قوم کے ہاتھ میں ہیں ـــ صیہونیت کے ہاتھ میں ہیں"

"میں نے جو پڑھا ہے یا دوستوں سے تبادلۂ خیالات میں اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ روس اور امریکہ ایک دوسرے کے مخالف ہیں ۔ اشتراکیت سرمایہ داری کی موت ہے ۔ روس ایک اشتراکی نظام پر عمل پیرا ہے ۔ اب تم ہی بتاؤ کہ اشتراکیت اور یہودیت کیسے ایک ساتھ چل سکتے ہیں ۔؟"

"ظاہری اور سطحی نظر رکھنے سے یہی کچھ نظر آتا ہے ۔ جیسے آپ کو ناصر عالم عرب کا ہیرو نظر آتا ہے ۔ کچھ افعال ہم سے دانستہ انجام پاتے ہیں اور کچھ غیر دانستہ طور پر ۔ کچھ حالات کے شکنجہ میں کسے افراد سے یوں ہی سرزد ہو جاتے ہیں ۔ یہودیوں نے جو جال پھیلائے ہیں اسی میں اس نے برسرِ اقتدار افراد کو کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا ہے اور کٹھ پتلی ڈور کی محتاج ہوتی ہے ۔ لیکن اس وقت ان باتوں کا کوئی موقع نہیں ۔ واپسی پر مفتیٔ اعظم عالمی سیاست پر ایک مذاکرہ کرا رہے ہیں ۔ انشاء اللہ آپ کا ذہن صاف ہو جائے گا ۔ اب سونے کی کوشش کریں ۔ زکیہ تو کب کی سو چکی ہے ۔"

"نہیں ابھی تو میں نے دوسری بات تمہیں بتانی ہے ۔"

"ہاں ہاں ۔ بتائیے نا ۔"

"طلحہ باجی نے آج صبح تم سے کوئی بات کی تھی ۔"

"ہاں کی تھی ۔"

"تم نے کیا کہا تھا ۔"

"آپ بتائیں ۔ آپ نے کیا کہا ہے ۔"

"میں تو حیرت زدہ تھا میں کیا بتا سکتا ہوں ۔ تم بتاؤ ۔"

احمد سارہ کے اس قدر قریب تھا کہ چاندنی رات میں چمکتی ہوئی سارہ کی آنکھوں کو اس نے جھکتے دیکھا، وہ معصوم سی مسکراہٹ پھیلتی دیکھی جو حجاب در حجاب عیاں ہوتی ہے۔

اس نے احمد کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس سے پانی مانگا۔ پلاسٹک کے بنے ہوئے ایک گلاس میں جب وہ پانی لے کر آیا تو سارہ چٹائی پر لیٹ چکی تھی ۔۔۔ پانی پیتے ہوئے رک کر اس نے ایک بار پھر احمد کی طرف دیکھا اور لیٹ گئی ۔۔۔

"اب آپ سو جائیں۔"

"میں نہیں سو سکوں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"تم نے کچھ بتایا جو نہیں۔"

"اس میں بتانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بتانے کی ضرورت کیوں نہیں؟"

"اس لئے کہ طلحہ باجی کے کہے کو آپ ٹال سکتے ہیں؟" اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو پھر میں کیسے ٹال سکتی ہوں۔"

احمد کے کانوں میں شہنائیاں سی بج اٹھیں ۔۔۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اپنے اندرونی جذبات کا اظہار کیسے کرے ۔۔۔ اگر وہ شوخی کرتا تو اوچھا پن

ہوتا۔ حالانکہ وہ ناچنا اور کودنا چاہتا تھا ــــ اونچی آواز میں کوئی طربیہ نغمہ الاپنا چاہتا تھا ــ

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا سامنے نظر آنے والے ٹیلے کی طرف چلا گیا، ٹھنڈی ریت پر اس کا بہترین رفیق ــ اس کا گھوڑا مرا پڑا تھا۔ وہ ابھی تک اس کی لاش کو بھی نہیں دبا سکا تھا۔ کھجوروں کے درختوں سے چھن کر چاندنی پانی کے ذخیرہ پر جھلملا رہی تھی ــــ یہ سنہری جال پھیلائے ہوئے پانی کتنا زہریلا ہو چکا تھا ــــ اس کا جی چاہا کہ وہ پانی میں کود جائے، اور تیرتا ہوا ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلا جائے۔ لیکن اب اس کی زندگی ملک و ملت کے علاوہ ایک اور ہستی کی بھی ہو چکی تھی ــ ممکن تھا پانی کا زہر سہانے کے لئے بھی غیر مفید ہوتا ــــ

چاند ریت کے ٹیلوں کے پیچھے چھپنے لگا تو آسمان پر ستارے جھلملانے لگے۔ نیند سارہ سے بھی کوسوں دور تھی۔ وہ آسمان کو تک رہی تھی ــ خیالات کا ہجوم اسے گھیرے ہوئے تھا ــــ وہ اپنی بیتی ہوئی زندگی کے ستائیس سالوں کے متعلق سوچ رہی تھی ــــ بچپن یروشلم کی گلیوں میں گذرا۔ جوانی قاہرہ میں آئی ــــ سوچ بچار کا انداز کیسے اور کن کن مراحل پر بدلا اور اس نے احمد کے متعلق سوچنا شروع کر دیا ــــ اسے احساس ہوا جیسے ہمیشہ سے ہی وہ اس کے متعلق سوچتی رہی ہے ــــ اور اب اس سے کچھ عرصہ جدا رہنے کے اچانک ایک فیصلہ کن مرحلہ پر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی ہے ــــ

صبح ہی ہیلی کوپٹر کے ذریعہ اس کا کرنل بھائی دہیں صحرا میں پہنچ رہا تھا ــــ

طلحہ نے اصرار کیا تھا کہ وہ وہاں موقع پر خود پہنچ کر ان دونوں کی رسم کتخدائی انجام دے۔ یہی بات طلحہ نے اپنے بھائی کو وائرلیس پہ بتائی تھی ــــ بے شک وہ ایک بہت اہم مشن پر صحرا کے اس حصہ میں بھیجا گیا تھا ــــ اسی مشن پر سارہ اور ذکیہ کو بھیجا گیا تھا۔ اس مہم کو ترتیب دیتے وقت طلحہ اور سارہ کے کرنل بھائی نے حکمت عملی سے کام لیا تھا۔ طلحہ اپنے بھائی اور کرنل اپنی بہن کے سلسلے میں اکثر سوچ چکے تھے۔ دونوں کو یہ علم بھی ہو چکا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس موضوع پر گفتگو کرنے کی دونوں میں ہمت نہیں تھی۔

سارہ ابھی تصورات میں کھوئی تھی ــــ صبح کیا ہوگا۔ زرقہ کی طرف گئے ہوئے کئی صحرائی عرب یہاں آجائیں گے ــــ فضا سے ہیلی کوپٹر نیچے اترے گا۔ اس کا بڑا بھائی آئے گا۔ احمد ہوگا اور پھر ایک نئی زندگی کا آغاز ــــ اس نئی زندگی میں کیا ہوگا ــــ اس نے شادی بیاہ کے جسمانی پہلو کی نسبت روحانی پہلو کے متعلق زیادہ سوچا ــــ سوچتے سوچتے جیسے اس کی آنکھ لگ گئی۔

اب اس کی آنکھ کھلی تو ذکیہ اس پر جھکی ہوئی تھی۔

سارہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ جیسے ذکیہ نے اس کی کوئی چوری پکڑ لی ہو۔

ذکیہ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"اٹھو دلہن بی ــــ بہت سے مجاہدین کی طرح آج تمہاری شادی بھی میدان کارزار میں ہو رہی ہے ــــ یہ کتنی خوش نصیبی کی بات ہے!"

واقعی فلسطینی لڑکوں اور لڑکیوں میں ایک دوسرے کو پسند کرنے کا

معیار گذشتہ کئی سالوں سے یہی تھا کہ لڑکا کتنا جانباز ہے اور لڑکی کتنی بہادر۔ نوجوان طبقہ زیادہ تر اپنا ساتھی اس کی قربانیوں کی روشنی میں ہی پسند کرتے ہیں۔ احمد اور سارہ کا جوڑا تو ویسے ہی بڑا مناسب تھا۔ ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ ان کی سوچ کا انداز ایک تھا۔ ان کے خاندان اپنی قربانیوں کی وجہ سے جانے پہچانے تھے۔ اور یہ تنازعہ کہ ناصر واقعی عرب دنیا کا ہیرو ہے یا نہیں، ان کی زندگی میں ایک بحث کا موضوع تھا۔ اس سے ان کی سیاسی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا تھا، اور یہی موضوع ان کو زیادہ قریب تر لایا تھا۔

اختلافات پہ جب تنقیدی نظر ڈالی جائے تو ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع ملتے ہیں۔ ایسے ہی مواقع سے وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوئے تھے۔

تمام عرب عوام کی طرح ان کا مقصد بھی اسرائیل کو ختم کرنا تھا۔ ایسی شادیاں صیہونیت کی موت، استعماری طاقتوں کی شکست اور اسرائیل پر ضرب کاری لگانے کی طرف اقدام تھا۔

ذکیہ نے قہوہ تیار کیا۔ دونوں مل کر پینے لگیں تو انہیں احمد کا خیال آیا، وہ ابھی تک ان کو نظر نہیں آیا تھا۔ ذکیہ نے ادھر ادھر نظر ڈالی وہ اسے پانی کے دوسری طرف جھنڈ میں ٹہلتا نظر آیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتا اپنے گھوڑے کی نعش کے قریب آیا، وہاں سے وہ اس درخت کی طرف بڑھا جہاں اس کی خرجین پڑی تھی، اس نے ایک چھوٹا سا بیلچہ لیا اور واپس جا کر گھوڑے کی نعش پہ

ریت ڈالنے لگا۔ اسے اپنے کام سے فارغ ہونے میں کوئی آدھ گھنٹہ لگ گیا تھا۔
پھر بھی وہ قہوہ کی پیالی پینے کی خاطر کیمپ کی طرف نہیں آیا۔

ذکیہ نے سارہ سے کہا۔

"جاؤ ــ بلا لاؤ نا"

"تم ہی جاؤ"

"ارے ابھی سے ہی فکر کرنے لگو ــ دیکھو تو بے چارے نے کتنا کام کیا ہے"

"ٹھیک ہے ــ مجھے بھی نظر آ رہا ہے ــ لیکن بلا تم ہی لاؤ"

"میں کہتی ہوں بلانے کی بجائے تم خود اس کا ناشتہ وہاں لے جاؤ"

"نا بابا ــ آج تو مجھے شرم آ رہی ہے"

"شام تک یہ رہی سہی بھی اٹھ جائے گی" ذکیہ نے شرارت سے کہا۔

"چل ہٹ ــ کیسی باتیں کرتی ہے ــ" سارہ نے شرما کر کہا۔

"میرا خیال ہے ــ تم سے زیادہ تمہارے دولہا میاں کو شرم آ رہی ہے۔ تبھی تو ادھر نہیں آ رہا"

"ٹھیک ہے شرم آنی چاہیئے ــ تمہارے میاں کی طرح بے شرم تو نہیں"

"اری چل ــ میرا میاں تو بے چارہ ہے ہی لٹھ گنوار جیسا"

"یہ تو میں نہیں مانتی ــ اکیلا ہی اسرائیل میں داخل ہونا بڑے حوصلے کی بات ہے"

"چھوڑو ــــ اپنے میاں کے ذکر سے ذکیہ پسیج سی گئی ــــــ "تم نے خواہ مخواہ اس کی بات چھیڑ دی ــــــ جانے کس حالت میں ہوں گے"۔

"اری فکر نہ کر ــــــ خدا کی قسم اسے تو کسی اسرائیلی لڑکی نے اپنے کمرۂ خاص میں چھپا لیا ہوگا۔ ایسے بانکے اور جوشیلے عرب نوجوان کہیں مات نہیں کھاتے"۔

"تو نے پھر شرارت کی بات کی ہے"۔

"نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں ــــــ اسرائیلی لڑکیاں ایسا کرتی ہیں۔ ــــــ اور جب ایسا کرتی ہیں تو ان کے پیش نظر محض ہوس کاری ہوتی ہے"۔

"خدا وہاب کو محفوظ رکھے"۔

"ہاں بڑا بھولا بھالا ہے"۔ سارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خیر چھوڑو ــــــ وقت کافی گذرتا جارہا ہے ــــــ جاؤ انہیں بلا لاؤ"۔

"بھئی میں تو نہیں جاؤں گی ـــ تمہیں ہی جانا پڑے گا"۔

ذکیہ "اچھا بھئی میں ہاری" کہہ کر اس طرف چلنے لگی جہاں احمد بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھا کہ درخت سے ٹیک لگائے ایک چھوٹا سا آئینہ سامنے رکھے داڑھی اور سر کے بال ٹھیک کر رہا ہے ــــــ اس نے ذکیہ کو آتے نہیں دیکھا۔ ذکیہ نے قریب پہنچ کر کہا۔

"اچھا تو جناب دولہا بننے کی تیاری فرما رہے ہیں"۔

احمد چونک اٹھا ـ لیکن مسکرا کر رہ گیا۔

"میں نے صبح سے تمہارا گھوڑا نہیں دیکھا" احمد نے پوچھا۔

"بھاگ گیا ہوگا زرقہ کی طرف، وہیں کا خمیر ہے" ذکیہ نے کہا۔

احمد سوچنے لگا۔

خمیر کا لگاؤ ہی تو سب کچھ ہے۔

کرنل فواد ہیلی کوپٹر سے اترا تو سارہ دوڑ کر اسے لپٹ گئی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ دیر تک وہ اپنے بھائی کو اپنے بازوؤں میں لئے کھڑی رہی، وہ اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا رہا۔۔۔ ذکیہ نے کرنل کا مختصر سامان اٹھا لیا اور کیمپ کی طرف آگئی، اٹیچی کے اوپر الفتح کا سرکاری خبرنامہ 'الثورۃ الفلسطینہ' پڑا ہوا تھا۔ ذکیہ نے اسے بغل میں دبا لیا۔

ایک امریکی مصنفہ مسز لیونارا سٹرمیل کا بیان لکھا ہوا تھا۔ اس نے مقبوضہ فلسطین میں الفتح کے زیر زمین مرکز کا خفیہ دورہ کیا تھا۔ ذکیہ کو اندازہ تھا کہ وہاب وہیں ہو سکتا ہے۔ لکھا تھا۔

'۔۔۔۔۔۔۔ میں نے کیمپ کمانڈر کے ہمراہ صدر کیمپ کا چکر لگایا۔ کیمپ کے عقب میں ایک پہاڑی سے اتر کر ہم اس جگہ پہنچے، جہاں سامان حرب بہت بھاری مقدار میں نہایت حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور سوچنے لگی، یہ تمام رائفلیں جو نیٹو کے منصوبہ کے لئے تیار کی گئی تھیں

ـــــ یہ تمام چھوٹی مشین گنیں ڈائنا میٹ کے صندوق، ٹینک شکن ہلکی توپیں اور دوسرا غیر محدود سامانِ حرب اسرائیل کو بھاری نقصان پہنچا سکتا تھا۔"

اس بیان سے اسے کوئی ایسی بو نہیں آئی جس سے اسے کوئی ناامیدی ہوتی بلکہ اسے حوصلہ ہوا تھا کہ مجاہدین کی کارروائیاں امریکہ کے غیر جانبدار طبقہ کی نظر میں بڑی وقعت رکھتی ہیں۔ اطمینان کا سانس لے کر اس نے سارہ کو دیکھا وہ بھی اپنے بھائی کے ساتھ کیمپ کی طرف آرہی تھی۔

جلد ہی مقامی لوگ آگئے۔ کرنل کے ساتھ بھی دو آدمی تھے، جو اردن کی باقاعدہ فوج کے افسر تھے۔ احمد سے اکیلے میں کرنل کی بڑی لمبی چوڑی گفتگو ہوئی ـــــ

پھر نکاح ہوا، کھجوریں تقسیم کی گئیں ـــ کچھ اور سامان رسد بھی مہمانوں میں تقسیم کیا گیا۔ کرنل کے ساتھ جو دو افسر تھے ان میں سے ایک طلحہ کی طرف سے بھیجا ہوا تھا اس نے دلہن کو اور کرنل نے خود دولہا کو تحائف دیئے۔ ایک افسر جو فلسطینی تھا، نے الفتح کے سربراہ یاسر عرفات کا پیغام پڑھ کر ان کو سنایا ـــ

"الفتح کے تمام اراکین خواہ وہ کسی منصب پر بھی فائز ہوں، اچھی طرح جانتے ہیں کہ آزادی کی راہ سرفروشوں کی لاشوں پر سے گذرتی ہے ـــ مجھے امید ہے کہ رشتۂ مناکحت آپ کے فرائض کی ادائیگی میں حائل نہیں ہوگا۔ میں آپ کو اس مبارک ساعت پر مبارک باد دینے

کے ساتھ ساتھ یاد دلانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اسرائیل
نے ہمارے وطن پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ مسلمانوں
کا کشت و خون کیا ہے ـــ اور ہم نے ۱۹۵۷ء اور
۱۹۶۷ء کی شکستوں کا بدلہ ابھی اسرائیل سے لینا ہے ـ
یہودی سیاست گری کے پیدا کردہ عالم اسلام کے مسائل
الفتح نے حل کرنے ہیں۔"

الفتح کے مجاہدین کی شادی ایسے ہی سادہ تقریبات میں ہوتی تھی، ایسے خوشی کے موقع پر یاسر عرفات ان کو ان کی اہم ذمہ داریاں ضرور یاد دلاتے تھے، کرنل فواد اگرچہ اردن کی باقاعدہ فوج کا افسر تھا لیکن ان کی نظر میں یاسر عرفات کا مقام بہت بلند تھا یہی وجہ تھی کہ وہ سرکاری ہیلی کوپٹر میں یاسر عرفات کے نمائندے اور طلحہ کے نمائندے کو لے کر آئے تھے۔

طلحہ کا بھائی ہونے کی وجہ سے احمد اور علی محجوب کی بیٹی ہونے کے باعث سارہ ـــ

دونوں کے نکاح کے موقع پر صرف اپنی نیک خواہشات پہنچانے کی بجائے اس نے اپنا نمائندہ بھی بھیجا تھا ـــ

مقامی باشندے دو دنبے ذبح کر کے بھون لائے، اس دعوت سے شادی کاروایتی رنگ بھی پیدا ہو گیا۔ عرب ممالک میں شادی کے مواقع پر خاص خاص دعوتوں کا انتظام کیا جاتا ہے ـــ مختلف روایات کو زندہ رکھنے کے لئے دولہا اور دولہن کو عروسی کا مخصوص لباس پہنایا جاتا ہے ـــــ

دولہا جب دولہن کو اپنے عزیز و اقارب ہیں لے جاتا ہے تو لمبی لمبی رسومات پوری کی جاتی ہیں ـــــ

مجلہ عروسی کا انداز بالکل اسلامی تھا ـــ سادگی کو ملحوظ رکھا گیا تھا ـــ اور اس تقریب کو ختم ہونے میں ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت نہیں لگا۔

تین گھنٹے بعد ہیلی کوپٹر فضاؤں میں گم ہو گیا ـــ مقامی باشندے نرقہ کے کناروں کی طرف چلے گئے ، کھلے آسمان تلے کھجوروں کے پیڑوں کے سایوں میں صرف تین نفوس رہ گئے۔

احمد ـــ سارہ اور ذکیہ ۔

ذکیہ کو سگنل کی آواز سنائی دی ـــ وائرلیس سیٹ کی مخصوص آواز کو وہ ہی بہتر پہچانتی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی اپنے زیر زمین مورچہ کی طرف چلی گئی ـــ

سارہ اور احمد دونوں رہ گئے ۔

احمد نے سارہ کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی ـــ چہرہ پہ سرخی پھیل رہی تھی ـــ

" سارہ " احمد نے اسے بڑے رومانی انداز سے بلایا۔ مگر سارہ نہیں بولی ، اس نے اپنے سر کو اور جھکا لیا۔ احمد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

" سارہ ـــ یہ میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ تم میری زندگی کا سہارا بن گئی ہو ـــ میں اپنے آپ کو کسی اور دنیا میں محسوس کر رہا ہوں ـــ تمہیں

یوں اپنا بنا کر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تمہاری تمام تر صلاحیتیں اب میری ہو گئی ہیں — آج تک تمہارا خیال دامن گیر رہتا ہے اب میں تمہارا دامن اپنے ہاتھ میں تھام کر اپنے آپ کو بہت اونچا انسان محسوس کرنے لگا ہوں، تم نے میری عزت افزائی کی ہے۔"

جانے وہ کیا کیا کہتا رہا۔ سارہ خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ کوئی لفظ نہیں کہہ رہی تھی۔ احمد نے باتوں کے دوران اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اس مرتبہ اس نے اپنا ہاتھ احمد کے ہاتھ سے کھینچا نہیں تھا — احمد نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اوپر اٹھایا اور اپنا سر جھکا کر اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔

سارہ چونکی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچنا چاہا لیکن احمد نے اسے مضبوطی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو سارہ اس کی گود میں گر گئی — احمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو سارہ نے آنکھیں چرائی نہیں — نیلی آنکھوں میں بڑا سپردگی کا انداز تھا — احمد اس کے اور قریب ہوا تو سارہ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا —

"وہ ذکیہ آ رہی ہے!"

احمد نے پیچھے مڑ کر دیکھا — ذکیہ کہیں بھی نہیں تھی۔

سارہ اٹھی اور جب تک احمد اس کی طرف متوجہ ہو وہ کھجوروں کے دوسرے جھنڈ کی طرف بھاگ گئی۔ احمد اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ قہقہوں کا ایک لطیف سا سلسلہ پیچھے چھوڑتی وہ بھاگتی رہی۔ احمد بھی بھاگتا رہا۔ اس نے پانی کے ذخیروں کے گرد چکر لگایا اور واپس کیمپ کی طرف آ گئی — اور تیزی سے زیر زمین ذکیہ کے پاس چلی گئی — احمد جب وہاں پہنچا تو سانس لینے کے لئے

ایک لمحہ رک گیا۔

ذکیہ سامنے تک آئی اور احمد کو اشارہ سے نیچے بلایا۔

سارہ بڑا سنجیدہ چہرہ لئے وائرلیس پر گفتگو کر رہی تھی۔ چند منٹ پہلے جو شوخی اس کے چہرہ پر پھیلی ہوئی تھی وہ اب غائب تھی۔ احمد نے سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"پندرہ کلومیٹر۔ جنوب مغرب کی طرف۔ چھ خیمے۔ شام تک۔ بہت اچھا۔ بہت اچھا۔" اس نے وائرلیس بند کر دیا۔

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ذکیہ اور احمد خاموش کھڑے تھے۔

"ہم خطرہ میں ہیں۔ پندرہ کلومیٹر کے فاصلہ پہ اسرائیلی فوجوں نے چھ خیموں کا ایک کیمپ لگایا ہے اور اپنے ہیلی کوپٹروں کی تلاش کے لئے وہ ٹینکو سمیت ادھر بڑھ رہے ہیں۔ یاسر عرفات چاہتے ہیں کہ کوئی ٹینک اور فوجی واپس نہیں جانا چاہیئے۔"

احمد بھول گیا کہ ابھی چند گھنٹے پیشتر اس کی شادی ہوئی ہے۔ اس نے گھڑی پہ نظر ڈالی ابھی دو بجے تھے۔ صحرا میں شام سات بجے کے قریب ہوتی تھی، اس نے تھوڑی دیر کے لئے سوچا اور کہا۔

"تم دونوں زرقہ کے کیمپ کی طرف چلی جاؤ۔ سیٹ وغیرہ ساتھ لے لو۔ پندرہ کلومیٹر فاصلہ کوئی زیادہ نہیں ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی اگر ٹینک وہاں سے روانہ ہو تو وہ یہاں سے اس فاصلہ پہ آکر رکیں گے جہاں سے وہ آسانی سے گولہ باری کر کے نخلستان کو برباد کر سکیں۔ ہم شام تک اسرائیلی

کیمپ کے قریب کسی گوشہ میں پہنچ جانا چاہتا ہوں ــــ میں کیا کروں گا ــ یہ تم مجھ پر چھوڑ دو ــــ اور ابھی سے چلنے کی تیاری کرو۔"

"ابھی سے ـــ؟" سارہ نے حیران ہوکر کہا۔

"ہاں ابھی سے ـــ تاکہ مجھے اطمینان رہے کہ تم محفوظ ہو۔"

احمد نے صحرا کا نقشہ نکالا اور اسے ریت پر پھیلا دیا۔ قطب نما سے سمت کا تعین کیا ــ اپنی منزل کا اندازہ کرکے اس نے مخصوص ڈھیلا ڈھالا عربی لباس پہنا، پانی، گولہ، بارود اور بارودی سرنگیں ساتھ لیں اور چمکتے ہوئے سورج کی طرف دیکھ کر کچھ اطمینان کیا اور "خدا حافظ" کہہ کر چل دیا۔

جب وہ نخلستان سے نکل رہا تھا تو اسے سارہ کی آواز سنائی دی جو اس کے پیچھے بھاگتی ہوئی آ رہی تھی۔ احمد رک گیا۔ سارہ نے قریب آکر اپنے آپ کو احمد کے بازوؤں میں گرا دیا ــــ احمد نے اسے سنبھالا اور بھینچ کر اپنے سینہ سے لگالیا ــ اسے ایسا محسوس ہوا، جیسے دنیا اس کے بازوؤں میں سمٹ آئی ہے اور اس کے اندر اتنی ہمت پیدا ہوگئی ہے کہ وہ اسرائیلی توپوں کا دھواں تک نکال سکے ــ آہستہ سے اس نے سارہ کو علیحدہ کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تیرتے ہوئے دیکھ کر بولا۔

"یہ کیا ــ تم رو رہی ہو ــــ میری سارہ رو رہی ہے۔"

"نہیں رو نہیں رہی ــــ ایسے ہی یہ پیمانے چھلک آئے ہیں۔" اس نے آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"مگر اس سے تو انسان کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔" احمد نے کہا۔

"مگر الفتح کے مجاہدوں کی ہمت تو کسی طور بھی نہیں ٹوٹ سکتی۔"

"پھر کیا بات ہے ۔ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟"

"نہیں ۔ میں پریشان نہیں ہوں ۔ میں حالات اور فرائض کو سمجھتی ہوں۔ مجھے یہ احساس ہے کہ فلسطین سے ہی ہماری زندگی ہے ۔ بس یوں ہی آپ کے خیال سے پریشان ہو گئی۔"

"اب تو میرا فرض ہے کہ تمہارا خیال رکھوں۔"

"میرا یہ فرض نہیں؟"

"کیوں نہیں، اب ہم ایک دوسرے کا لباس ہیں ۔ ایک دوسرے کے زندگی بھر کے دکھ درد کے ساتھی ہیں۔"

"اس موضوع پر ہم کوئی بات بھی نہیں کر سکے۔ . . . . . لیکن انشاء اللہ ہم جلد ملیں گے۔ اب آپ جائیں میں آپ کو یہاں بیٹھ کر ٹیلہ کی دوسری طرف ڈھلنے تک دیکھتی رہوں گی۔"

فرط جذبات سے احمد نے پھر سارہ کو اپنے سینہ سے چمٹا لیا اور اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرنے لگا۔

سارہ نے محسوس کیا کہ احمد کے زیادہ قریب ہونے سے اس کے خیالات بھٹک رہے ہیں اور اس کے جسم میں ارتعاش سا پیدا ہو رہا ہے ۔

احمد بھی کھو سا گیا۔

اس نے احمد کے بازوؤں سے نکلنے کے لئے جسم کو بل دیا، تو احمد نے اپنی گرفت ڈھیلی کر دی اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سامنے ٹیلے کی طرف چلنے لگا۔

ٹیلے کی دوسری سمت پہنچ کر اس نے پھیلی ہوئی ریت کا جائزہ لیا۔ صاف چٹیل ریت پر کسی قسم کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس نے اپنی کمر پہ لٹکتے ہوئے خورد و نوش کی اشیاء کے تھیلے کو زمین پر رکھ دیا۔ وہ آگے آگے چلتا جاتا۔ اس کے پاؤں سے بننے والے نقش زمین پر گھستا ہوا تھیلہ مٹاتا جاتا اور ایک ہلکی سی کھائی بنتی چلی جاتی، ایک فرلانگ تک اس نے ایسی کھائی بنائی اور پھر واپس اسی مقام پہ پہنچا۔ جہاں سے اس نے کھائی کا نشان بنایا تھا۔ کچھ فاصلے پر اس نے ویسی ہی دوسری کھائی بنائی ان دو کھائیوں سے اسرائیلیوں کو چلتا ہوا راستہ ہونے کا تاثر دینا مقصود تھا ـــــ

فرلانگ کے آخری چند گزوں میں اس نے تھوڑے فاصلے پر تین بارودی سرنگیں بچھا دیں ـــ انہی سرنگوں کے متوازن اس نے تقریباً ایک فرلانگ چوڑائی تک بھی ایسی ہی سرنگیں بچھا دیں، اور پھر چند لمحے نقشہ کو ملاحظہ کرنے کے بعد آگے روانہ ہو گیا ـــ

پسینہ پونچھتا ـــ سورج کا جائزہ لیتا ـــ گھڑی دیکھتا وہ چلتا رہا ـــ ریت کے ٹیلے حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے ـــ ان ٹیلوں پہ پھیلی ہوئی دھوپ نے جلتے ہوئے شعلوں کا روپ دھار رکھا تھا ـــ اسے اپنے سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر ایک پھریرا سا اڑتا ہوا نظر آیا۔ تجسس کے تحت احمد نے اپنا راستہ بدلا اور اس لہراتے ہوئے پھریرے کی طرف ہو لیا۔

قریب پہنچ کر جو کچھ احمد نے دیکھا وہ کافی حوصلہ شکن تھا ـــ ایک فوجی سپاہی ریت میں دبا پڑا تھا اور اس کے بوٹ باہر نظر آ رہے تھے، اس کے قریب

ہی اس کے پھٹے ہوئے خیمے کے کچھ نشانات باقی تھے ـــــ پھریرے کا کپڑا کافی پھٹا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک امریکن رائفل پڑی تھی جو آدھی ریت میں دبی ہوئی تھی امریکن رائفل سے احمد کو یقین ہو گیا کہ مردہ سپاہی یقیناً اسرائیلی ہے۔ احمد نے سوچا کہ شاید اسے یہاں سے کسی قیمتی راز کا پتہ چل سکے۔ اس نے ریت کو الٹ پلٹ کر دیکھا لیکن اسے کچھ نہ ملا۔ لاش کو وہ عریاں نہیں کرنا چاہتا تھا ـــــ جو کچھ اسے نظر آیا تھا اس سے اس نے اندازے لگانے شروع کئے اس نے سوچا ـــــ

یہ اسرائیلی سپاہی ـــــ جس کی بے گوروکفن لاش کو اردن کی ریت نے پناہ دے رکھی ہے ـــــ عربوں کا دشمن ہے ـــــ اس نے عربی مجاہدین کا کھوج لگانے کے لئے دریا کو عبور کیا ہو گا ـــــ بھوک اور فاقوں سے ـــــ یا کسی طوفان سے ـــــ اور یا کسی مجاہد کی گولی سے اپنے انجام کو پہنچا ـــــ لیکن اس کی کوششیں رائیگاں نہیں گئیں ـــــ

آج اس کے ساتھی ٹینک فورس کے ساتھ یہاں پہنچے ہیں'' اور ان کا کیمپ کہیں یہیں ہو گا ـــــ اس نے پھر نقشہ نکالا اور اپنی منزل اور مسافت کا اندازہ کیا۔ اور چل دیا۔

دوربین کی مدد سے اسے کیمپ تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی ـــــ وہ ایک ٹیلے کی اوٹ میں بیٹھ گیا اور غروب آفتاب کا انتظار کرنے لگا ـــــ ابھی پانچ بھی نہیں بجے ہوں گے کہ چھ ٹینک نخلستان کی طرف چل دیئے ـــــ مٹیالے رنگ کے دیوقامت ٹینکوں کی گونج بڑی پر اسرار تھی، وہ کبھی کبھی تو

ایک قطار میں چلتے اور کبھی دو دو ہو جاتے ۔ جب وہ اس کے سامنے سے گذرے، اس وقت وہ پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔

دن ڈھل گیا ۔ تاریکی پھیلنے لگی ۔ سناٹا تو پہلے ہی کافی تھا ۔ لیکن تاریکی نے اس میں اور اضافہ کر دیا ۔ کیمپ میں چند سپاہیوں کے چلنے پھرنے سے احمد نے اندازہ کر لیا تھا کہ ان کی تعداد ایک درجن سے زائد نہیں تھی۔

خیموں کے اندر روشنیاں جل اٹھیں ــــ احمد اپنی کمین گاہ سے نکلا۔ جوں جوں وہ کیمپ کے قریب پہنچتا گیا، اسے کیمپ کے اندر سے آوازیں آتی سنائی دی ــــ یہ آوازیں اس طرح ملی جلی تھیں، کہ کچھ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا ۔ وہ اور قریب ہوتا گیا ۔ قہقہوں کے طوفان میں اس نے ایک نسوانی آواز سنی ۔ جو چیخ چیخ کر ان سپاہیوں کو گالیاں دے رہی تھی ۔ اس نے اونچی آواز سے سپاہیوں کو دھمکی دی کہ وہ کپتان کو سب کچھ بتا دے گی ۔

"کپتان بھی تجھے اس صحرا میں دل بہلانے کے لئے لایا ہے نا" ایک سپاہی نے کہا۔

"ٹھیک ہے دل بہلانے کے لئے لایا ہے ــ یہ میرا فرض ہے کہ میں اس کا دل بہلاؤں ــ میں اسی کے لئے ہوں ــ اس لئے نہیں کہ تم میری بوٹیاں نوچ ڈالو ــ"

سپاہیوں نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

احمد کو اندازہ ہوا کہ سب سپاہی ایک ہی خیمہ میں جمع ہیں اور اپنے کسی

افسر کی داشتہ سے دل بہلانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اس نے سنا۔ ایک سپاہی نے کہا۔

"ہم تمہاری بوٹیاں نہیں نوچتے، تم صرف ہمیں وہ خاص رقص دکھا دو۔"

عورت نرم پڑ گئی۔ اس نے پھر کہا۔

"سور کے بچو۔ مجھے ننگا دیکھ کر تم زیادتی پر اتر آؤ گے۔"

"نہیں ہیکل کی قسم ہم ایسا نہیں کریں گے۔ ہمیں صرف رقص دکھا دو۔"

"بہت اچھا۔ اب مجھے ذرا باہر نکلنے دو۔ میں کپڑے بدل آؤں۔"

"نہیں نہیں کپڑوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم تمہارے جسم کو ہی بل کھاتے اور سمٹتے پھیلتے دیکھ کر محظوظ ہوں گے۔"

"بہتر ہے کہ ہم چاندنی میں چلیں۔ خیمہ کے اندر ٹھیک نہیں۔" کسی ایک سپاہی نے تجویز پیش کی۔

"نہیں چاندنی میں تو رمیکا کا جسم چاندنی میں گھل مل جائے گا اور ہم کچھ نہیں دیکھ سکیں گے۔"

"ہاں، ہاں۔ خیمہ کے اندر ہی ٹھیک ہے۔" زیادہ آوازوں نے تائید کی۔

رمیکا نے پھر کہا۔

"مجھے یہ فوجی وردی اتار لینے دو۔ میں ابھی آتی ہوں۔"

"اچھا جاؤ۔ مگر جلدی آؤ۔ نشہ نہ اتر جائے۔" سپاہیوں کے انچارج نے کہا اور خیمہ کا پردہ اٹھا کر وہ باہر نکل گئی۔

خیمہ کا دروازہ دوسری طرف کھلتا تھا، اس لئے احمد نے عورت کو باہر

جانتے نہیں دیکھا — سپاہی جام کھنکھنانے لگے اور کبھی کبھی قہقہہ لگا دیتے۔

احمد نے موقع کو مناسب خیال کیا اور اس نے اپنی کمر سے ایک گرینیڈ کھول کر خیمہ کے اندر پھینک دیا — ایک دھماکہ ہوا اور پھر سناٹا چھا گیا۔ عورت نے کسی خیمہ میں چیخ ماری — ایک دو سپاہی بھی کراہنے لگے۔

احمد ان سپاہیوں کے قریب پہنچا — وہ قریب المرگ تھے — ظلم کا انجام یہی ہوتا ہے۔ احمد نے سوچا اور خیموں کے اندر جا کر عورت کو تلاش کرنے لگا۔

تیسرے خیمہ میں وہ عورت موجود تھی اور سہمی ہوئی چٹائی پر پڑی تھی — وہ ابھی تک کپڑے بھی نہیں پہن سکی تھی۔ احمد خیمہ سے باہر نکل آیا۔

"اپنے کپڑے درست کر لو خاتون" احمد نے اسے آواز دی۔

خیمہ کے اندر سے کوئی آواز نہیں آئی، البتہ کپڑوں کی سرسراہٹ کی آواز آتی رہی۔ احمد نے پھر کہا۔

"خاتون — کپڑے ایسے پہنو کہ تمہیں صحرا کا سفر بھاری معلوم نہ ہو۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"تمہارا نام ربیکا ہے؟"

"ہوں۔"

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم میرے پیچھے پیچھے چلتی آؤ۔"

"ہوں۔"

"تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں۔"

"نہیں۔"

"تمہارے اور ان فوجیوں کے سوا کوئی اور تو اسرائیلی سپاہی ارد گرد چھپا ہوا تو نہیں۔"

"نہیں۔"

احمد پھر اس خیمہ کی طرف آیا جس کا ابھی ابھی اس نے دھاگہ دھاگہ علیحدہ

کر دیا تھا ــــ اور جہاں اسرائیلی سپاہی مردہ یا زخمی پڑے تھے، اس نے گنے، کل نو تھے۔ جن میں سے دو سپاہی ابھی تک زندہ تھے۔ وہ بری طرح زخمی ہوئے تھے، اس نے رمیکا سے کہا۔

"ان زخمی سپاہیوں کے قریب پانی اور خوراک رکھ دو۔"

رمیکا نے تعمیل کی اور احمد کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

احمد نے تیز نظروں سے پھر رمیکا کی طرف دیکھا۔ وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ مال غنیمت کے طور پر ہاتھ آنے والی یہ یہودی لڑکی اس کے ساتھ کوئی چال تو نہیں ــــ اس نے اچانک اس کے پہلوؤں پہ ہاتھ رکھ کر اطمینان کیا کہ اس نے کوئی ہتھیار تو نہیں پہن رکھا۔ رمیکا نے کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔ تلاشی لینے کے بعد اس نے رمیکا کو کہا۔

"اپنے لئے بھی کچھ پانی اور اشیائے خوردنی اٹھا لو۔"

رمیکا نے تعمیل کی ــ احمد آگے آگے اور رمیکا پیچھے پیچھے چلنے لگی ــــ چاندنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی، احمد خاموش چل رہا تھا۔ رمیکا اس کے پیچھے تھی۔

تین ساڑھے تین کلومیٹر چلنے کے بعد احمد کو سامنے روشنی نظر آئی پھر وہ روشنی گم ہو گئی ــ تھوڑی دیر بعد وہی روشنی پھر نظر آئی اور پھر غائب ہو گئی۔ احمد رک گیا۔ رمیکا بھی رک گئی۔ لیکن احمد سے چند قدم پیچھے تھی ــــ احمد خود پیچھے ہٹ کر رمیکا کے قریب ہو گیا۔

"کیسی روشنی ہے؟"

"ٹینک کی۔"

"لیکن یہ جلتی بجھتی کیوں ہے؟"

"اس لئے کہ جب ٹینک ٹیلے پر چڑھتا ہے تو روشنی نظر آتی ہے اور جب وہ ڈھلوان میں اترتا ہے تو روشنی غائب ہو جاتی ہے۔"

احمد سوچ میں پڑ گیا — تو اس کا مطلب ہے ٹینک واپس آ رہے ہیں۔ بارودی سرنگوں نے کام نہیں کیا۔ پھر اسے اس خیال سے اطمینان ہوا کہ ان ٹینکوں نے گولہ بارود ہی ضائع کیا ہو گا — وہ یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ روشنی پھر نظر آئی — ابھی تک ٹینک کے چلنے کی آواز نہیں آئی تھی — احمد سوچ رہا تھا کہ اب وہ ان ٹینکوں سے کیسے نمٹے — اس نے ربیکا کی طرف دیکھا۔ وہ اداس معلوم ہو رہی تھی۔

راستہ سے ہٹ کر احمد نے ریت میں ایک بڑا سا گڑھا بنایا اور ربیکا کے ساتھ اس گڑھے میں بیٹھ گیا۔ آدھ پون گھنٹہ کے بعد ٹینکوں کے چلنے کی آواز آنے لگی۔ احمد نے غور کیا تو اسے محسوس ہوا کہ آواز صرف ایک ٹینک کی ہے۔ چھ ٹینکوں کی نہیں — اس نے ربیکا سے پوچھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے — کتنے ٹینک واپس آ رہے ہیں۔"

"ایک ہی معلوم ہوتا ہے — اور یہ بھی کمانڈر کا۔" ربیکا نے کہا۔

"کیا تم مجھے کمانڈر کے منصوبہ کے متعلق کچھ بتا سکتی ہو۔" احمد نے کہا۔

"مجھے ایسا کرنے کا کوئی اختیار نہیں — میں اسرائیلی حکومت کی ملازم ہوں —"

احمد چونک پڑا۔ اسے ایسے جواب کی توقع نہیں تھی۔ اب تک تورمیکا اس کے احکام کی ایسے تعمیل کر رہی تھی جیسے وہ احمد کی مشکور ہو کر اس نے اسے یہودی سپاہیوں کی دست برد سے بچا کر اس پر احسان کیا ہو۔ احمد نے اسے کہا۔

"لیکن اب تم میرے قبضے میں ہو ــــ الفتح کے ایک ادنیٰ کارکن کے قبضہ میں ــــ میں تمہیں یہ بتانے پر مجبور بھی کر سکتا ہوں کہ تم لوگوں کے ارادے کیا ہیں ــــ؟"

"ٹھیک ہے تم مجبور کر سکتے ہو، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ میں تمہیں سب کچھ بتا بھی دوں۔"

"چلو نہ بتاؤ ــــ ہم خود معلوم کر لیں گے ــــ ابھی اس ٹینک میں بیٹھا ہوا کمانڈر ہی سب کچھ بتائے گا ــــ دیکھنا میں اسے کس طرح قابو کرتا ہوں۔"

"اس ٹینک میں سوار کمانڈر کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا ــــ اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے چھ چھ نالیاں گولیاں برساتی ہیں ــــ میری ایک چیخ پر گولیوں کی بارش ہونے لگے گی ــــ بے شک میں بھی تمہارے ساتھ ماری جاؤں گی لیکن ہم ایک کمانڈر کو ختم کرنے کے لئے دس بیس جانیں گنوا دینا منافع کا سودا سمجھتے ہیں۔"

"یہ تو یہودی دین کے خلاف ہے ــــ تم ایک پائی کا گھاٹا بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ شائیلاک بھی تو تم میں سے تھا نا ــــ جسے شیکسپیئر نے ننگا کر کے رکھ دیا۔"

"اسے عرب فدائیوں کی قیمت معلوم نہیں تھی۔ دولت کے بعد ہمیں فدائیوں کے مردہ جسموں سے زیادہ پیار ہے۔"

"لعنت ہے تم پر۔"

اپنا جملہ ختم کرنے کے بعد اس نے سر سے اپنا رومال اتارا اور کس کر رمیکا کا منہ باندھ دیا۔ پھر اس نے رسی سے اس کے پشت پر اور پاؤں باندھ دیئے۔ پھر کھڑے ہو کر کہنے لگا۔

"تمہارا منہ اس لئے باندھا ہے کہ تم کوئی آواز نہ نکال سکو ــــ ہاتھ پاؤں اس لئے باندھے ہیں کہ تم دوڑ کر ٹینک کے سامنے نہ آسکو۔ اب دیکھو میں کیا کرتا ہوں ــــ لیکن افسوس ہے کہ تم نہ دیکھ سکو گی۔ ٹینک ذرا دور ہے۔ خیر۔"

وہ اس راستہ کی سمت ہو لیا۔ جہاں سے دن کے وقت ٹینک گئے تھے۔ اس نے ایک گڑھا کھودا اور اس میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ ٹینک کی گھوں گھوں قریب ہوتی گئی۔ روشنی اس کے سر سے گزرنے لگی۔ وہ اور نیچے ہو گیا۔ آواز قریب سے قریب تر ہوتی گئی اور پھر روشنیاں اس سے آگے نکل گئیں۔ وہ اپنی کمین گاہ سے نکلا اور ٹینک کے پیچھے تیزی سے دوڑتا ہوا ٹینک کے قریب پہنچ گیا۔ پھر پہلو سے ہو کر ٹینک کے اوپر چڑھ گیا ــــ اس نے دو دستی بم ڈھکنا کے اوپر رکھے اور کود کر ٹینک سے نیچے اتر گیا۔ ابھی وہ مشکل سے زمین کے متوازی اوندھے منہ لیٹا ہو گا کہ زور کا دھماکا ہوا۔ ٹینک جلنے لگا۔ اس کا رخ بھی تبدیل ہو گیا ــــ احمد انتظار کرتا رہا کہ شاید ٹینک

سے کوئی آواز آئے ۔۔۔ اس کا ڈھکنا کھلے اور ٹینک کے عملہ میں سے کوئی باہر نکلے۔ لیکن کافی دیر تک ایسا نہ ہوا۔ احمد اٹھا اور ٹینک کے قریب پہنچ گیا۔ اسے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آئی۔ صرف شعلے بلند ہوتے رہے چین اور گراریوں کا تیل جل رہا تھا ۔۔۔ احمد چاہتا تھا کہ وہ کسی سپاہی کو اور اگر ہو سکے تو کمانڈر کو زندہ گرفتار کرے لیکن اس کی ایسی کوئی خواہش بھی پوری نہ ہوئی۔ آگ پورے ٹینک پر چھا گئی ۔۔۔ اب خطرہ تھا کہ تیل کی ٹنکی آگ پکڑنے پر پھٹ جائے گی اور اس سے دور دور تک تیل اور آگ کے شعلے اڑ کر جائیں گے۔ اس خطرہ کو بھانپ کر وہ ٹینک سے دور ہٹ گیا۔

اسے رمیکا تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہیں لگا ۔۔۔ وہ جیسے اسے چھوڑ آیا تھا ویسے پڑی تھی ۔۔۔ اس نے پہلے اس کا منہ کھولا اور پھر ہاتھ اور پاؤں ۔۔۔

صحرا میں جلتی ہوئی آگ سے روشنی پھیل گئی تھی۔ وہ رمیکا کو لے کر اس روشنی کے دائرہ سے نکل کر نخلستان کی طرف بڑھنے لگا۔

وہ تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ رمیکا سے باتیں کرے لیکن اب وہ اسے تھکی تھکی نظر آ رہی تھی۔ بے چینی اور اداسی نے اسے مضمحل کر دیا تھا اس نے احمد کو کہا۔

"کمانڈو ۔۔۔ میں تھک گئی ہوں ۔۔۔ اور نہیں چل سکتی"

"تمہیں چلنا ہو گا ۔۔۔ فاصلہ تھوڑا رہ گیا ہے ۔۔۔ اگر میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلا گیا تو صبح تک تم زندہ نہیں رہ سکو گی ۔۔۔ ہاں یہ ہو سکتا

ہے کہ ہم تھوڑی دیر بیٹھ کر ستا لیں۔" احمد نے سوچا کاش ذکیہ کا گھوڑا ہی اس کے پاس ہوتا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے

"تم فدائی بڑے ظالم ہو" ریمکا نے کہا۔

"اسی لئے تم زندہ وسلامت ہو۔" احمد نے جواب دیا۔ اس جواب کا ریمکا کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس کی زندگی بخش دی گئی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ یہ زندگی ظلم کی مثال تو نہیں ہو سکتی تھی۔ اسے بھی خیمے کے اندر ہی دوسرے سپاہیوں کے ساتھ آگ اور بارود کا نوالہ بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن وہ کھلی فضا میں خنک زمین پر بیٹھ کر سانس لے رہی تھی۔ اس نے پانی پیا اور ریت پر لیٹ گئی۔ بسکٹ کھاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تم مصری ہو"

"تمہیں کیسے شبہ ہوا؟" احمد نے جواب دیا۔

"تمہارے اندر فرعونوں جیسی نخوت ہے"

"یہ شبہ بھی کیسے ہوا؟"

"تم نے میرے جسم کی طرف گدھوں کی طرح نہیں دیکھا نا"

"تم ابھی زندہ جو ہو" پھر ذرا رک کر پوچھا۔ "فرعون گدھوں کی طرح دیکھا کرتے تھے؟"

"یہ مجھے علم نہیں۔ لیکن میری جوانی سے کھیلنے کی خاطر ہماری فوج کے

افسروں میں اکثر جھگڑے ہو جاتے ہیں —— میں پہلے جنرل کے پاس تھی —
جنرل نے انعام کے طور پر نزوالو کمانڈر کے سپرد کر دیا تھا۔ نزوالو نے جون
۶۵ء کی جنگ میں جنرل کی جان بچائی تھی۔"

"مگر تم مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہی ہو؟"

"اس لئے کہ تم نے مجھے ایسی نظروں سے نہیں دیکھا جیسے ایک عورت کو
دیکھا جاتا ہے۔"

"تم یقین کرو گی کہ میری شادی صرف چودہ گھنٹے پیشتر ہوئی ہے اور تم
اسرائیلیوں نے میری سہاگ رات برباد کر کے رکھ دی ہے۔ ورنہ اس وقت
میں نخلستان میں سارہ کے پاس ہوتا۔"

"سارہ؟" رمیکا چونکی۔

"ہاں سارہ — میری بیوی کا نام ہے۔"

"تم متضاد خیالات کا مجموعہ معلوم ہوتے ہو۔"

"کیسے؟"

"عورت کا ذکر کرتے ہو اور عورت کو نظر انداز کرتے ہو — ٹینک
اور خیمہ تباہ کر دیتے ہو اور ظالم کہلانا پسند نہیں کرتے۔"

"تم نے مجھے مصری کہا تھا۔" رمیکا کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے
احمد نے کہا۔

"ہاں — لیکن اب میرا خیال بدل گیا ہے تم مصری نہیں ہو سکتے۔"

"میں فلسطینی ہوں — اس فلسطین کا فرزند ہوں جس پہ اسرائیل نے

غاصبانہ قبضہ جما لیا ہے ــــ میں مسلمان ہوں ــــ ساری دنیا کے مسلمان ایک دوسرے سے اخوت کے رشتہ میں بندھے ہوئے ہیں ــــ میں الفتح کا ایک ادنیٰ کارکن ہوں ــــ اور ہمارے قائد کا یہ حکم ہے ــــ حملہ اچانک کرو، دشمن کو ذرا مہلت نہ دو اور ایک ہی بھرپور وار میں کام تمام کر دو۔ ــــ مشن کو انجام دینے سے پہلے آرام کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ۔ آپریشن شروع کرنے سے پہلے دشمن اور اس کے گشتی دستوں کے ساتھ تصادم سے گریز کرو۔ نقل و حرکت انتہائی خفیہ ہونی چاہیئے۔"

"مگر تم یہ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

"اس لئے کہ جب تم واپس جاؤ تو اسرائیلیوں کو بتا سکو کہ الفتح ان کے پیچھے سایہ کی طرح لگی ہوئی ہے ــــ اور الفتح کا بنیادی فلسفہ موت اور زندگی دونوں کو حقیر سمجھنا اور انہیں خاطر میں نہ لانا ہے ــــ ہم کسی کل بھی تم لوگوں کو چین نہ لینے دیں گے۔ تم ان کو یقیناً یہ بھی بتاؤ گی کہ تمہیں ایک ایسا فلسطینی مجاہد ملا تھا جو اپنی نئی نویلی دلہن کو بھی ایک محاذ پر چھوڑ آیا تھا۔"

ربیکا خاموش تھی۔ یہ حقیقت تھی جس کے متعلق ربیکا کو زیادہ بتانا غیر ضروری تھا ــــ وہ سب کچھ دیکھ چکی تھی، جان چکی تھی ــــ اپنے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اس نے کہا۔

"اگر تم چاہتے ہو کہ میں واپس جا کر تمہیں ہیرو کے طور پر اپنے ہم وطنوں میں پیش کروں تو پھر مجھے ادھر کیوں لئے جا رہے ہو؟"

اس نے ہیرو کا لفظ طنز کے طور پر استعمال کیا تھا۔

"نہیں، تم مجھے ہیرو سمجھنے کی غلطی نہ کرو۔ الفتح کے رضاکار بڑے بڑے معرکے سرانجام دے رہے ہیں۔ تم مجھے اگر اپنے لوگوں میں معمولی رضاکار کی حیثیت سے ہی پیش کرو تو زیادہ بہتر ہے۔ باقی میں تمہیں بجائے دریائے اردن کے اس پار جانے دینے کے ادھر اس لئے لئے جا رہا ہوں کہ شاید تمہاری موجودگی میرے اور میرے ساتھیوں کے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکے۔"

"تو کہیں لے جا کر تم مجھ پر تشدد کرنے کا ارادہ رکھتے ہو۔"

"تشدد تو اسرائیلیوں کا ایک ہتھیار ہے جسے وہ فلسطینی عوام کے خلاف اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔ ہم نے ایسے کوئی مراکز تعمیر نہیں کر رکھے۔ تم خود دیکھ لوگی۔"

"میرا جسم، رضاکاروں کے لئے دعوت عام تو نہیں بنا دو گے۔"

"تم کیسی گھٹیا باتیں کرتی ہو۔ الفتح کے جانباز تو ایک طرف کوئی بھی مسلمان نوجوان کسی غیر عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ یہ ہمارا مذہبی تقاضا ہے۔"

"تم مسلمان لوگ ہر بات میں مذہب کو گھسیٹ لاتے ہو۔ وقت کی نبض نہیں ٹٹولتے۔ تم اپنی بیوی سے دور ہو۔ سنسان ریگستان میں ٹھنڈی ٹھنڈی ریت بچھی ہے۔ چاندنی نے الگ خنکی پھیلا رکھی ہے اور ایک دشمن قوم کی عورت تمہارے قریب ہے۔ تم کتنے نادان ہو۔" ریکا نے کہا۔

اس لمحے احمد کو شازیہ یاد آئی۔ جنسی تلذذ میں ڈوبا ہوا رقص یاد آیا۔

اور پھر اسے ابو ظفر یاد آیا۔ جو موت کے منہ سے بچ گیا تھا۔ پھر اُن نادان یہودیوں کی عقل پر قہقہہ لگانے کو جی چاہا جو یہ سمجھتے ہیں کہ اپنی بہو بیٹیوں کی عصمت کی دعوتیں دے کر وہ عربوں کی اس تحریک کو ہی ختم کر دیں گے۔"

"اب تم اپنی انتہائی پستیوں پہ اتر آئی ہو۔ لیکن یہ تمہارا آخری داؤں بھی تمہاری ہار کو جیت میں نہیں بدل سکے گا۔ اٹھو اور میرے پیچھے پیچھے چلتی آؤ۔"

وہ اٹھ کر ریکا کے آگے آگے چلنے لگا۔

ریکا دوڑ کر اس کے پہلو میں آگئی اور کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگی۔ پھر جانے اسے کیا خیال آیا کہ اس نے ایک قدیم عبرانی نغمہ اونچی آواز سے گانا شروع کر دیا۔

ابھی وہ آدھا مصرع ہی گا سکی ہو گی کہ احمد نے اسے سخت لہجے میں خاموش رہنے کو کہا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

چند قدم چلنے کے بعد اس نے پھر پوچھا۔

"جب تم لوگ اپنے آپ کو 'فتح' یا 'الفتح' کے رضاکار کارکن ظاہر کرتے ہو تو اس سے یہ سمجھ نہیں آتی کہ اس تنظیم کا اصل نام کیا ہے ؟"

"تمہاری تعلیم بڑی خام ہے کہ تمہیں یہ بھی نہیں بتایا گیا کہ دراصل "فتح" کیا ہے ؟"

"نہیں ـــ مجھے عربوں کی تمام تحریکوں کے نام یاد ہیں ـــ کم و بیش بارہ نام ـــ لیکن عربی نام سمجھنے میں ذرا دشواری ہوتی ہے ـــ ایک تو تمہاری تنظیم تہتہ التحریر فلسطین یعنی فلسطین لبریشن فرنٹ ہے ـــ دوسری

جبہتہ الشعبیۃ التحریر فلسطین آزادیٔ فلسطین کا عوامی محاذ ہے۔ اسے شام کی اشتراکی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ اور اس تنظیم کے جتنے رضا کار ہم نے گرفتار کئے ہیں وہ چین کے تربیت یافتہ اور چینی اسلحہ سے لیس تھے۔ منظمتہ التحریر کی رہنمائی کا ذمہ دار بھی حبوش ہے ۔ میں اس شخص کو جانتی ہوں یہ بھی شام کی بعث پارٹی کے اشاروں پر کام کرتی ہے ۔ ایک تنظیم الصاعقہ ہے ۔ ایک اور خالد بن ولید کے نام سے مشہور ہے ۔ ایک یہ تمہاری تنظیم ہے جسے فلسطین لبریشن مومنٹ کا نام دیا گیا ہے۔ بعض نے اسے حرکتہ التحریرالفلسطین بھی بتایا ہے ۔ لیکن یہ نام الفتح نیا ہی ہے "

"تم کتنی قابل ہو ۔ لیکن تمہاری ساری صلاحیتیں عرب دشمنی کے لئے استعمال کی جا رہی ہیں ۔ کتنے رنج کی بات ہے ۔ دوسروں کی دنیا بنانے کے لئے تم اپنی آخرت خراب کر رہی ہو "

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں "

" فتح کا لفظ حرکتہ التحریرالفلسطین میں ہی چھپا ہوا ہے ۔ ف فلسطین سے ۔ ت التحریر سے ۔ اور ح حرکتہ سے لیا گیا ہے، یعنی اگر حرکتہ التحرالفلسطین کو الٹا پڑھا جائے تو فتح اس کا مخفف ہے "

"خوب ۔ خوب ۔ بڑی چالاکی سے نام وضع کیا گیا ہے "

"چالاکی سے نہیں ۔ ذہانت سے "

رمیکا خاموش ہو گئی۔

احمد اپنی تنظیم کے متعلق اور اس کی تاریخ کے متعلق سوچنے لگا۔ ۱۹۵۶

میں سویز کے حملے کے بعد فتح کے قیام کا خیال پیدا ہوا۔ دو سال لگ گئے ۱۹۵۹ء میں اس کی عسکری تنظیم قائم ہوئی ـــــ اس کے ارکان کی فوجی تربیت ہوئی اور ۱۹۶۴ء میں چھوٹی سی فوجی تنظیم تیار ہو گئی ـــــ اور جب اسرائیلیوں سے دریائے اردن کا رخ موڑنے کی کوشش کی تو ۱۹۶۵ء میں بحیرہ طبریہ کے قریب پہنچ گیا۔ بیراج پر حملہ کر کے اپنے کام کا آغاز کیا ـــ وغیرہ وغیرہ ـــ چلتے چلتے احمد جانی پہچانی ڈھلوانوں کے قریب پہنچ گیا ـــ اس نے ربیکا کو بالکل خاموش رہنے کو کہا ـــ

چاندنی میں اس نے گھڑی دیکھی ـــ ابھی کافی رات باقی تھی ـــ وہ اس وقت نخلستان کے قریب نہیں جانا چاہتا تھا ـــ اسرائیلی ٹینکوں کا کیا انجام ہوا تھا۔ اس کا اسے علم نہیں تھا۔

وہ ربیکا کو لے کر اپنے راستہ سے کافی دور ہٹ گیا۔ اپنی کمر سے رسی کھولی۔ اپنا اسلحہ وغیرہ ایک طرف رکھ دیا ـــ ایک چوڑا سا کمر بند اپنے سامان سے نکالا ـــ زور سے انگڑائی لی ـــ اور ربیکا سے کہا۔

"خاتون میں لیٹنا چاہتا ہوں"

"تم لیٹ جاؤ ـــ میں نے منع کب کیا ہے؟"

"تمہارے منع کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دراصل میں لیٹنے سے پہلے تمہیں باندھنا چاہتا ہوں، ہو سکتا ہے میری آنکھ لگ جائے"

یہ کہہ کر وہ اس کے قریب ہو گیا۔ اور اس نے کمر بند ربیکا کی کمر میں ڈال دیا۔ اس کے اندر ہی ایک تالا لگا ہوا تھا ـ اسے بند کر کے چابی اپنی

جیب میں ڈال لی۔ پھر کمر بند میں رسی ڈالتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنا اسلحہ دور رکھا ہے کہ تم اسے استعمال نہ کر سکو۔ اور یہ کمر بند اس لئے ڈالا ہے کہ رسی کے دونوں سرے میری کمر میں بندھے رہیں گے" اور تم چھ گز کے اندر گھوم پھر سکو گی۔ چاہو تو فاصلہ پر سو بھی سکتی ہو"

"سونا تو میں بھی چاہتی ہوں مگر فاصلہ پہ نہیں"

"پھر تم نے بیہودیت شروع کی۔ میں اب تمہیں ایسی بات کرنے کی اجازت نہیں دوں گا" احمد نے کچھ ایسے انداز سے کہا کہ وہ سہم گئی۔

احمد ریت پہ لیٹ گیا

چاند اپنے پورے شباب پر تھا۔ احمد نے اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنے سر کے نیچے رکھیں اور چاند کو گھورنے لگا۔

یہی چاند یروشلم پر بھی چمک رہا ہوگا۔ بیت المقدس کے در و بام اس چاندنی میں نہا گئے ہوں گے۔ آج سے بیس برس پیشتر جب میں ایک نوخیز نوجوان تھا، میں یروشلم گیا تھا، وہیں مجھے سارہ ملی تھی۔ اور پھر قاہرہ میں ہمارے دل ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ اور اب وہ میری بیوی ہے۔

"سارہ" سوچتے سوچتے اس نے کروٹ بدلی۔ تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

"موت کیا ہے؟ ۔۔۔ جنت"

"فتح کیا ہے؟ ۔۔۔ مال غنیمت"

"شکست کیا ہے؟ ۔۔۔ جنگ جاری رکھنے کا ایک اور موقع"

اس نے آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قدیم جنگی نعرہ یاد کیا ———
آیۃ الکرسی پڑھ کر سینہ پر پھونکی اور آنکھیں بند کر لیں، ہاتھ سے ٹٹول کر رسی کا
پھندا اپنے بازو تلے دبا لیا۔ مبادا ربیکا اسے کھولنے کی کوشش کرے۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو تین چار گز کے فاصلے پر ربیکا سوئی
ہوئی تھی۔ اس کے لمبے بال ریت پر لوٹ رہے تھے، نائیلون کے باریک
لباس سے اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کی رنگت جھلکی پڑتی تھی۔ سانس
کی آمد و رفت سے اس کا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا، وہ یوں بے خبر سو رہی تھی،
جیسے اسے بالکل احساس نہ ہو کہ وہ کہاں ہے، اور اپنے دشمنوں کے قبضہ میں ہے۔

احمد نے رسی کھینچی تو اس نے اچانک آنکھیں کھول دیں، پھر اس نے
آگے بڑھ کر اس کا کمر بند کھول دیا۔ چند منٹوں کے بعد وہ نخلستان کی طرف
چل رہے تھے۔ مگر اب احتیاط کے طور پر اس نے ربیکا کو اپنے آگے آگے چلنے
کو کہا ——— اس نے ذہن میں پروگرام بنا لیا تھا کہ اگر اسے اسرائیلی سپاہی مل گئے
تو وہ ربیکا کی آڑ لے کر اپنے بچاؤ کی کوشش کرے گا۔ چلتے چلتے ہی اس نے
اپنے تھیلے سے اپنی سٹین گن کو ترتیب دینا شروع کر دیا۔ وہ اس کے پرزے
علیحدہ کر کے اسے تھیلے میں چھپائے ہوئے تھا۔ جب سٹین گن کے سب
جوڑ جوڑ لئے گئے تو اس نے اٹھائیس گولیوں والی میگزین چڑھا لی۔

اب احمد اس جگہ پر پہنچنے والا تھا جہاں ٹینکوں کی موجودگی کا امکان
ہو سکتا تھا ——— اس نے ربیکا کو بتایا کہ سامنے والے ٹیلے کے شروع میں ہی کافی
سرنگیں بچھائی گئی ہیں اس لئے احتیاط سے چلنا ہو گا۔

"مجھے بھک سے اڑ جانے جادو۔"

"نہیں میں تمہیں نخلستان تک زندہ لے جانا چاہتا ہوں۔"

وہ بڑے انداز سے مسکرائی اور سر کو جھٹکا دیا۔

احمد نے کہا۔

"دیکھو سامنے کوئی ٹینک نظر آرہا ہے کہ نہیں۔"

"تم بھی تو میرے ساتھ چل رہے ہو — جب تمہیں نظر آئے گا تو مجھے بھی نظر آجائے گا۔"

وہ چلتے گئے۔

اب کافی روشنی پھیل چکی تھی، ان کی پشت پر آسما[illegible] ہو چکا تھا۔ چند ہی منٹوں میں ہر طرف دھوپ ہی دھوپ پھیل جاتی۔ لیکن [illegible] کی منزل کا فاصلہ بھی بہت کم رہ گیا تھا — بارودی سرنگیں بچھاتے وقت — جو نشانات اس نے لگائے تھے وہ جوں کے توں لگے تھے، صحرائی ہوائیں یا گرد باد وں نے رات کے دوران ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ ڈھلوان کے اوپر چڑھتے ہی ان کو پانچ اسرائیلی ٹینک نظر آنے چاہئیں تھے۔ وہ سانس روک کر چلتا رہا۔ اور جوں ہی ڈھلوان سے اس نے سر بلند کیا۔ اسے چار ٹینک ایسی حالت میں نظر آئے کہ ان سے کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ الٹے پڑے تھے۔ اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بارودی سرنگوں نے اپنا کام کیا ہے — لیکن پانچواں ٹینک کہاں تھا؟ اس نے سوچا۔ سٹین گن کو سنبھالا اور آگے بڑھنے لگا۔ سامنے نخلستان نظر آرہا تھا۔ سورج کی کرنیں پانی اور پتوں پر لچک

رہی تھیں۔ ابھی ان میں کسی قسم کی تمازت نہیں تھی۔ لیکن ٹینک کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

رمیکا کو آگے لگائے وہ جلے ہوئے چاروں ٹینکوں تک پہنچا۔ اسرائیلی سپاہیوں میں سے کوئی بھی نہیں بھاگ سکا تھا۔ پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے چار ٹینکوں کا نوماتک جل گیا تھا ـــــ پانچواں ٹینک ان چار ٹینکوں کے پیچھے تھا۔

رمیکا نے اپنی ناک پر کپڑا رکھتے ہوئے کہا۔

"ظالم ـــ"

احمد نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اس تلاش میں تھا کہ اگر کوئی اسرائیلی سپاہی زندہ ہو تو وہ اس کی ممکن مدد کر سکے۔ لیکن اسے زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔

وہ نخلستان کی طرف آیا ـــ ٹینک کے چین کے نشانات اس کے سامنے تھے۔ ٹینک نخلستان کی طرف گیا تھا ـــ وہ انہی نشانات پر چلنے لگا۔ رمیکا اب بھی آگے تھی۔

وہ چیتے جیسی نظروں سے اس ایک ٹینک کو تلاش کر رہا تھا جو بچ کر ایک خطرہ کی صورت اختیار کئے ہوئے تھا۔ مقامی باشندوں اور الفتح کے چھاپہ ماروں کے لئے بڑا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔

اسے پانی کے قریب ایک سایہ سا گھومتا نظر آیا۔ اس نے رمیکا سے کہا یہ کتنا برا ہو گا کہ تم اسرائیلی سپاہیوں کے ہاتھوں میں ہی ماری جاؤ گی۔

"کیسے ؟" اس نے گھوم کر احمد سے آنکھیں ملاتے ہوئے پوچھا۔

"اس طرح کہ نخلستان میں موجود اسرائیلی سپاہی ہم دونوں کو دیکھتے ہی گولیوں کی بوچھاڑ کر دیں گے۔ اور میرے ساتھ تمہارا بھی وقت آپہنچے گا۔"

"لیکن ابھی موت کا کوئی امکان نہیں ۔ میں نے ابھی ابھی ایک لڑکی کو پانی کے کنارے دیکھا ہے۔"

"لڑکی کا یہاں ہونا عجیب بات ہے ۔ مجھے بھی ابھی ابھی شک گذرا ہے ۔"

بالآخر دونوں کھجور کے پیڑوں کے قریب پہنچ گئے۔ ٹینک کے چین کے نشانات والا راستہ انہوں نے چھوڑ دیا۔

ایک پیڑ کے قریب پہنچ کر احمد نے درختوں کے جھنڈوں اور چوٹیوں کا جائزہ لیا۔ کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پھر اس نے سٹین گن کا رخ آسمان کی طرف کر کے نصف سے زیادہ میگزین خالی کر دیا۔ کئی شاخیں ٹوٹ کر نیچے گریں، اور گولیوں کی آواز سے صحرائی پرندے اپنی اپنی آوازیں نکالتے ہوئے اڑنے لگے۔ رمیکا دبک کر احمد کے پاؤں کے قریب گر پڑی۔

احمد نے دیکھا کہ ایک بڑی سی جھاڑی کے عقب سے ایک عورت دوڑ کر اس جھنڈ کی طرف گئی ہے، جہاں ذکیہ نے زیر زمین اسلحہ آلات کر رکھے تھے۔ احمد کو اس عورت کے پہچاننے میں دیر نہیں لگی ۔ اس کی ہمسفر اور اپنی دمساز سارہ تھی۔

وہ حیران بھی ہوا لیکن سارہ کی وہاں موجودگی سے اسے یہ اطمینان ہو گیا

کہ اسرائیلیوں کا وجود نخلستان میں نہیں ہے۔ لیکن پھر اسے یوں ہی شک گزرا کہ ہو سکتا ہے ان کو بھی یہ معلوم نہ ہو کہ سرنگوں سے بچ کر ایک ٹینک خطرہ کی شکل میں موجود ہے۔ پھر اسے یہ بھی خیال آیا کہ جہاں اس نے سایہ کی صورت میں سارہ کو دیکھا تھا اسی طرف تو ٹینک کے جانے کے نشانات تھے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سارہ کو اس کا علم نہ ہوا ہو۔

درختوں میں سے ہوتے ہوئے وہ اسی جانے پہچانے جھنڈ کے قریب پہنچ گیا اور اونچی آواز سے آواز دی۔

"سارہ"

سارہ احمد کی آواز سنکر درختوں سے نکلی اور دوڑتی ہوئی احمد کی طرف آئی۔ لیکن اجنبی عورت کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گئی، اور اس کے چہرہ پہ حیرت کے آثار پیدا ہوئے۔

احمد نے سارہ کو بتایا۔ ریکا۔ اسرائیلی عورت ہے"

"ریکا" سارہ نے دہرایا اور احمد کا ہاتھ پکڑ کر جھنڈ کے اندر لے گئی۔

"تم یہاں کیوں ہو۔ میں تو تم لوگوں کو یہاں سے چلے جانے کو کہہ گیا تھا" احمد نے پوچھا۔

"ہم چلے گئے تھے۔ پھر آگئے"

"ساتھ کون کون ہے؟"

"صرف ذکیہ ہے"

"کیا عمان رابطہ قائم کیا۔؟"

"ہاں عمان میں طلحہ باجی نے ہمیں مبارک باد دی ہے ۔۔۔ کرامہ سے یاسر عرفات نے بھی ہمیں بہت بہت مبارک باد دی ہے کہ ہمارا مشن کامیاب رہا ہے ۔۔۔ ابھی چند رضا کار یہاں پہنچ رہے ہیں ۔۔۔ ہم نے تین اسرائیلی سپاہیوں کو زندہ گرفتار کیا ہے ۔۔۔ وہ نیچے زیر زمین مورچہ میں ۔۔۔ ذکیہ رائفل لئے ان کی نگرانی کر رہی ہے" سارہ نے سب کچھ ایک ہی سانس میں بتا دیا۔

"چلو دیکھیں ۔"

"میں بھی چلوں ؟" رمیکا نے پوچھا۔

"ہاں کیوں نہیں ؟"

چند گز کا فاصلہ طے کر کے وہ درختوں کے اندر چھپے ہوئے دروازہ کی راہ اس زیر زمین مورچہ میں پہنچے جو اسرائیلیوں کی جملہ کارروائیوں پر نگاہ رکھنے کے کام آرہا تھا۔ اور جس کے طفیل وہ ہیلی کوپٹر اور ٹینک تک تباہ کر دا چکے تھے۔

احمد نے اپنی شہادت کی انگلی اپنی اسٹین گن کے گھوڑے پر رکھی تھی۔

ذکیہ نے احمد کو دیکھ کر سر جھکا کر مسکراتے ہوئے سلام کیا۔

تینوں سپاہی اپنی فوجی وردیوں میں ملبوس تھے ۔۔۔ ذکیہ نے ان کے ہاتھ کھجور کے پتوں سے بنائی ہوئی رسی سے پشت پر باندھ رکھے تھے۔

"یہ سب شیطان ہیں" ذکیہ نے کہا۔ "ہاتھوں کو بل دے دے کر

رسی ڈھیلی کر لیتے ہیں ـــــ اب میں نے ایک ترکیب نکالی ہے ـــــ میں رسی کے ڈھیلی ہونے پر پانی ڈال دیتی ہوں ـــــ وہ پھر سخت ہو جاتی ہے۔"

احمد نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سپاہیوں کے چہروں کو گھورتا رہا۔ پھر اس نے رمیکا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کیا تم ان کا تعارف کروا سکتی ہو؟"

"ہاں۔ ہاں ـــ کیوں نہیں ـــ یہ پھولے ہوئے پیٹ والا ریچھ ہمارے کمانڈر کا خاص دوست ہے ـــ عورتوں کا بڑا شوقین اور شراب کا بڑا رسیا ہے ـــ میں کمانڈر کی خلوت کی شراب سے مدہوش ہو کر گر جاتی تو چیخ اس کے کمرہ سے اٹھتی، لیکن تعجب کی بات ہے کمانڈر سے ہر معاملہ میں حصہ بٹانے والا موت میں اس کا حصہ دار کیوں نہیں بنا ـــ ذلیل ـــ"

رمیکا نے سپاہی کے قریب ہوتے ہوئے دانت چبا کر کہا۔

دوسرے سپاہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہ نوجوان تمہارے کافی کام آسکتا ہے ـــ کیونکہ اسے وہ جملہ اسباب معلوم ہیں جن کی وجہ سے عربوں نے جنگ میں مار کھائی ہے ـــ یہ اسرائیل کی حکومت کا کھاتا ہے لیکن اس کا دل عربوں کے ساتھ ہے ـــ یہ اسرائیل کے جملہ منصوبوں کو غلط اور انسانیت کش کہتا ہے ـــ تم اس سے کافی کچھ حاصل کر سکتے ہو۔"

"اور یہ تیسرے صاحب ـــ تم بے وقوف کیا نام تمہارا؟" اس نے

سپاہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"جوشوا" سپاہی نے جواب دیا۔

"ہاں جوشوا۔ تم تو کہتے تھے کہ عرب تمہارے سامنے بکری بن جاتے ہیں لیکن اب تمہیں ان دو لڑکیوں نے پکڑ کر بھیڑ بنا رکھا ہے ۔۔۔ کمانڈو۔ یہ تیسرا خوشامدی سپاہی ہر غلط بات پہ ہاں کہنے والا اور نیچ قسم کی حرکتیں کرنے والا ہے ۔۔۔ مرے ہوؤں کے کان کترنے والا ۔۔۔ ناک کاٹنے والا ۔۔۔ لاشوں کی جیب سے نقدی اور سگریٹ تلاش کرنے والا"

احمد بڑا حیران تھا کہ ربیکا کیسی سچی سچی باتیں کر رہی ہے۔

تینوں سپاہی سر نیہوڑے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

احمد نے سارہ کو کہا۔

"کوئی قہوہ تیار کرو۔ ان کی تواضع کی جائے"

انگریزی میں موٹے سپاہی کو مخاطب کرتے ہوئے ربیکا نے کہا۔

"تمہارا ٹینک کہاں ہے؟"

یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب احمد کو بھی چاہیئے تھا۔ اس سپاہی نے آنکھیں نیچی کر کے بتایا۔

"اگلے ٹینک کے نیچے بارودی سرنگ پھٹنے سے میرے ٹینک کی بتیاں جواب دی گئیں ۔۔۔ میں تیزی سے گولے برساتا اور مشین گنیں چلاتا آگے بڑھ رہا تھا کہ میرا ٹینک پانی کے اندر گھس گیا"

"تم تینوں نے مشکل سے جان بچائی۔ باقی دو کو ڈوب جانے دیا"

رمیکا نے اس کے منہ سے بات چھین لی۔

موٹا سپاہی خاموش ہو گیا ___

احمد نے رمیکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم چاہو تو ان سپاہیوں کے ساتھ اندر رہ سکتی ہو ___ ہم تو باہر بیٹھیں گے۔"

"تم کیسے توقع کرتے ہو کہ میں ان گھٹیا درجے کے بزدل سپاہیوں میں بیٹھوں گی ___ میرے ساتھ تم نے جو سلوک کرنا ہے کرو ___ لیکن مجھے ان کے پاس مت چھوڑو ___ یقین رکھو میں بھاگوں گی نہیں۔"

احمد نے سر کو مثبت انداز میں جنبش دی اور مورچے سے باہر نکل آیا۔

مورچہ کے دہانہ سے ذرا ہٹ کر وہ بیٹھ گیا۔

رمیکا اس سے کچھ فاصلہ پہ بیٹھ گئی۔

ذکیہ کھجور کے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔

سارہ ذرا فاصلے پر قہوہ تیار کر رہی تھی۔

احمد نے رمیکا کو کہا کہ وہ اپنے سپاہیوں کو قہوہ پلا آئے تو اس نے احتجاج کیا کہ وہ کیوں اسے ذلیل کر رہا ہے۔ مجبوراً اسے یہ فرض خود ادا کرنا پڑا۔

قہوہ کے بعد وہ پھر اپنے جھنڈ میں آکر بیٹھ گیا۔

درختوں کے لمبے سائے اب سکڑنے لگے ___ سورج اوپر ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ریت میں ملی ہوئی معدنیات کے ذرات چمکنے لگے تھے ___ احمد چاہتا تھا کہ

جلدی سے کچھ رضاکاروں کو اسرائیل کے کیمپ کی طرف بھیجے تاکہ جتنا مالِ غنیمت مل سکے وہ لے آئیں لیکن ابھی تک رضاکار وہاں نہیں پہنچے تھے، وہ سپاہیوں اور رمیکا کو بھی تحویل میں دے دینا چاہتا تھا، وہ اپنے پروگراموں کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ سارہ نے رمیکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"رمیکا"

اس نے تیز نظروں سے سارہ کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "کہو"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہوا ہے"

"میرا بھی یہی خیال ہے ـــــ بلکہ تمہارا نام بھی مجھے مانوس معلوم ہوتا ہے"

رمیکا نے کہا۔

"تم یروشلم کی تو رہنے والی نہیں"

"یروشلم ہی میرا وطن تھا۔ مگر اب تل ابیب کے قریب رہتی تھی"

"تم وہاں ہیرو گیٹ کے سیکنڈری سکول میں تو نہیں پڑھتی تھیں"

"ہاں ـــ میں وہیں پڑھتی تھی"

"تم ناچتی اور گاتی بھی تھیں"

"ہاں میں سکول میں ڈراموں کی جان تھی"

"سلیمان کا انصاف ـــ نامی ڈرامہ میں تم نے کام نہیں کیا تھا"

"ہاں میں ملکہ صبا بنی تھی"

"تو میری پیاری صبا ـــ تم نے اپنے سلیمان کو چھوڑ کر موشے دایان سے کیوں محبت بڑھالی۔"

"اب مجھے یاد آیا تم ـــ تم سارہ ـــ تم دسویں جماعت کی طالبہ تھیں ـــ اور تم ڈرامہ میں سلیمان بنی تھیں۔"

"ہاں ہاں۔"

دونوں کے چہرے چمک اٹھے۔ جیسے ان کا سکول کا زمانہ لوٹ آیا ہو ـــ وہ صحرا میں نہ بیٹھی ہوں بلکہ سیکنڈری سکول کے کسی دالان پر بیٹھی ہوں ـــ ان کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہ ہو ـــ اور انہیں یہ احساس تک نہ ہو کہ ایک اسرائیلی خاتون ہے اور دوسری فلسطینی ـــ مسلمان ـــ مہاجر ـــ انہوں نے سکول کی باتیں کیں، اس زمانہ کی شورشوں کا ذکر کیا۔ تقسیم فلسطین اور تشکیل اسرائیل سے لے کر موجودہ صورت حال کا ذکر کیا ـــ لیکن ساتھ ہی اس نے الفتح کو ایک دہشت پسند تحریک قرار دیا ـــ عربوں سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا۔

سارہ اس کے قریب ہو کر بیٹھ گئی

ذکیہ نے بھی ان کی باتوں میں خاصی دلچسپی کا اظہار کیا۔

احمد بالکل الگ ہو گیا تھا ـــ وہ رضا کاروں کی آمد کا منتظر تھا۔

یزد کی طرف سے "یارب" کا ایک نعرہ بلند ہوا۔ احمد اٹھ کر کھڑا ہو گیا ـــ ڈھلوانوں سے چھ سات رضا کار نخلستان کی طرف ڈھلے

احمد ان کے استقبال کے لئے اٹھ کر گیا۔

ایک ایک سے گلے ملا۔ اگرچہ وہ اس سے قبل ایک دوسرے کو

نہیں جانتے تھے لیکن وہ سب جانتے تھے کہ الفتح کے رضا کار آپس میں بھائی بھائی ہیں اور ان کے ایک دوسرے سے تعلقات کی بنیاد ہی الفتح ہے ——— اگر الفتح زندہ ہے تو ان کے رشتوں کے بندھن کبھی بھی نہیں ٹوٹ سکتے تھے۔

احمد ان کو کیمپ میں لے آیا ——— قہوہ سے ان کی تواضع کی گئی ——— چار آدمیوں کی پارٹی کو احمد نے اسرائیلی کیمپ کی طرف روانہ کیا ——— اور دو آدمیوں کو اپنے پاس رکھا ——— دونوں آدمیوں کی ڈیوٹی سارہ اور ذکیہ کی جگہ لگائی اور ان کو آرام کرنے کی غرض سے نخلستان کے اندر بھیج دیا ——— رمیکا بھی ان کے ساتھ تھی

خود احمد ان کے پیچھے پیچھے چلا آیا۔

جب وہ چھاؤں میں چٹائی بچھا کر بیٹھ گئیں تو احمد نے سارہ کو آواز دی۔ جب وہ اس کے قریب آئی تو اس نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"آؤ ذرا اس جگہ تک چلیں، جہاں ٹینک ڈوبا تھا۔"

سارہ اس کے ساتھ چل دی۔

احمد نے پوچھا۔ "تم لوگ واپس کیوں آگئی تھیں؟"

"ہم گئی ہی نہیں تھیں ——— ہم اب ایک فرلانگ ہی طے کر سکی ہوں گی۔ کہ ہمیں ہیڈ کوارٹر سے اطلاع ملی کہ ہم نخلستان خالی کرنے کی بجائے کچھ فاصلہ پہ ہٹ کر واقعات کا جائزہ لیں ——— چنانچہ ہم دونوں اس اونچے ٹیلے کی طرف چلی گئیں ———" سارہ نے ٹیلے کی طرف انگلی اٹھائی جو سب سے

بلند نظر آ رہا تھا۔

"وہاں ہم سو گئیں، تقریباً رات کے دو پہر ہی گذرے ہوں گے کہ ٹینکوں کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی، میں نے ذکیہ کو جگایا۔ اس نے رائفل سنبھالی۔ لیکن چند منٹ بعد ہی دھماکے ہوئے اور ٹینکوں کی آواز آنی بند ہو گئی ـــ تھوڑی دیر بعد پھر آواز آنے لگی ـــ جو آہستہ آہستہ ڈوب گئی ـــ آپ کے آنے سے ایک گھنٹہ پیشتر ہم دونوں یہاں پہنچیں تو یہ تین سپاہی بھیگے ہوئے کپڑے پہنے نخلستان میں گھوم رہے تھے ـــ ذکیہ نے ان کو للکارا تو یہ رائفل دیکھ کر سہم گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کا ٹینک ڈوب گیا ہے اور وہ بے ضرر قسم کے سپاہی ہیں ـــ میں نے ان کی بات کی تصدیق کی، اور پھر ان کو لے جا کر زیر زمین مورچہ میں باندھ دیا۔

ذکیہ اتنی خوش تھی کہ اس نے طلحہ باجی اور صالحہ ناصر کو عمان میں اطلاع دی۔ طلحہ باجی نے یاسر عرفات کو کرامہ میں وائرلیس پر اطلاع دی اور پھر یاسر عرفات نے ہمیں مبارک باد دی اور خبردار کیا کہ کہیں دھوکہ نہ کھا جائیں ـــ"

ٹینک کے مواصلاتی نظام کی جھنڈی پانی سے باہر نظر آ رہی تھی۔

واپس ذکیہ کے پاس آتے ہوئے جب وہ گھیرے سایوں میں سے گذرے تو احمد نے سارہ کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس نے اپنی مہم پہ روانہ ہوتے وقت چمٹایا تھا ـــ بڑی جذباتی سی آواز نکالتے

ہوئے اس نے کہا۔

"تمہاری بھی سہاگ رات کیسی رہی ۔؟"

سارہ شرما گئی ۔ تاہم اس نے کہا۔

" بڑی انوکھی ۔ ایک یادگار رات ۔"

احمد نے اور زور سے سارہ کو بھینچنا چاہا تو وہ سرپنچا کر کے اس کے بازوؤں کے حلقہ سے نکل گئی۔

احمد نے اسے پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن سوائے رسیلے اور میٹھے قہقہوں کے اس کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔

مقامی قبیلے کے لوگ شام تک نخلستان میں لوٹ آئے۔ احمد نے سب کو منع کر دیا کہ کسی قسم کی روشنی نہ کی جائے اور ذخیرہ کا پانی بالکل نہ پیا جائے۔ جس وقت اندھیرا ہو جائے گا اس وقت سب لوگ اکٹھے ہو جائیں، تب تک ہمارے وہ چار دوست جو اسرائیلی کیمپ کی طرف گئے ہیں واپس آجائیں گے اور مال غنیمت جو کچھ ہو گا سب میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

سہ پہر کے قریب زیر زمین مورچہ میں قید تینوں اسرائیلی سپاہیوں کو باہر تازہ ہوا میں نکال کر ان پر پہرہ بٹھا دیا — جو دو رضاکار ان پر پہرہ دے رہے تھے ان کو ذرا آرام دلانے کے لئے خود احمد نے اپنے آپ کو پیش کیا، اس نے تینوں سپاہیوں کو الگ الگ ذرا فاصلے پر بٹھا دیا اور خود اس سپاہی کے قریب جا کر بیٹھ گیا جس کے متعلق ریمکا نے کہا تھا کہ یہ تمہارے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" احمد نے نرمی سے اس سپاہی سے پوچھا۔

"میرا نام ابوالحسن ہے لیکن مجھے اعراقی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"زاقہ کے قریب ایک قصبہ ہے وہاں کا۔"

"کتنی تعلیم ہے تمہاری؟"

"میں بیروت میں تعلیم حاصل کر رہا تھا کہ مجھے حکومت نے واپس بلا لیا۔ میں تدریس کے فن میں ڈگری حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"پھر تم مدرس بنتے بنتے فوجی کیسے بن گئے؟"

"اس لئے کہ میرے وطن کو میری ضرورت تھی ـــــ اور میں نے تقابلی جائزہ سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اسرائیل ایک حقیقت بن چکا ہے، اور ہمیں اس کو زندہ رکھنا ہے۔"

"تم نے ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے اپنی خدو جہد کا آغاز کیا؟" احمد نے طنزیہ کہا۔

"نہیں ـــــ میں معمولی سپاہی نہیں ـــــ اسرائیلی فوج کا کمشنڈ آفیسر ہوں ـــــ یہ دونوں ساتھی بھی کمشنڈ آفیسر ہیں، بلکہ وہ دستہ میں جس کو الفتح نے تباہ کر دیا ہے سب آفیسرز پر مشتمل تھا ـــــ اور ہمارا کمانڈر کرنل تھا۔"

"تمہیں پتہ ہے کہ کرنل کاٹینک کہاں گیا ہے؟"

"بارودی سرنگیں پھٹنے تک وہ ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے بعد کسی کو کسی کا علم نہیں ہو سکا۔"

احمد کو یقین ہو گیا کہ ان سپاہیوں کو اپنے کمانڈر کے انجام کا علم نہیں اس لئے کچھ بتانا بھی مناسب خیال نہ کیا بلکہ اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس نے پوچھا۔

"ویسے تم یہودی ہو؟"

"نہیں ____ میں عیسائی ہوں۔ تثلیث پہ ایمان رکھتا ہوں ____ لیکن سیاسی نظریات میں میں ایشکول حکومت کا حامی ہوں۔ اخلاقی نظریات میں، میں دنیا کے ہر فرد کو آزادانہ زندگی بسر کرنے دینے کے اصول پہ ایمان رکھتا ہوں؟"

"تبھی تم عربوں کو آرام سے زندگی گزارنے کا موقع نہیں دیتے ____ فلسطینی عربوں پہ عرصۂ حیات تنگ کرتے ہو، اور افسروں پر مشتمل چھاپہ مار دستے ٹینکوں کی طاقت کے بھروسے پر بھیجتے ہو؟"

"یہ میرے خیالات نہیں ____ حکومت ایسا چاہتی ہے ____ اور میں سمجھتا ہوں کہ حکومت ایسا کیوں چاہتی ہے ____ اسرائیلی حکومت اپنی سرحدوں کو محفوظ کرنا چاہتی ہے ____ تاکہ عرب ممالک میں موجود مختلف تنظیمیں اسرائیلی حدود کی خلاف ورزی کر کے ہمارے ملک کو میدان کارزار نہ بنائیں۔"

"لیکن ہمارا ایمان یہ ہے کہ ہم اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے۔ فلسطین عربوں کا ہے اور فلسطینی عرب مہاجروں کی صورت میں کس مپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں؟"

"کمانڈو ۔۔۔ ذرا سوچو ۔۔۔ جب آپ لوگ یہ کہتے ہیں آپ اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بوڑھوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کر دو گے، عورتوں کے سہاگ اجاڑ دو گے، ہنستے، کھیلتے بچوں سے زندگی کی بیش بہا نعمت چھین لو گے ۔۔۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کی سرزمین میں خون اور ہڈیوں کی کاشت کرو گے ۔۔۔ اس فصل کے بونے سے سوائے تباہی کے اور کیا اگے گا؟"

احمد ہنسا ۔۔۔۔

"یہ وہ غلط باتیں ہیں جو صیہونی تحریک نے پھیلا رکھی ہیں اور بڑے موثر انداز سے تم نوجوان عیسائیوں کو بھی گمراہ کر رکھا ہے ۔۔۔ سنو اور غور سے سنو ۔۔۔ اور پھر سوچو ۔۔۔ ہم جب اسرائیل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا نعرہ لگاتے ہیں تو ہمارا قطعی یہ مقصد نہیں ہوتا کہ تمام یہودیوں کو ننگا اور بھوکا رکھیں گے ۔۔۔ بیمار یہودیوں کو گولی سے اڑا دیں گے اور ان کی نعشوں پر ٹریکٹر چلا دیں گے ۔۔۔ بوڑھوں کو قتل ۔۔۔ عورتوں کو بانجھ اور معصوم بچوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیں گے ۔۔۔ ہرگز نہیں ۔۔۔ ہرگز نہیں ۔۔۔ اسرائیل کو ختم کرنے سے ہمارا مقصد اس یہودی ذہن، اس صیہونی تنظیم اور اس مملکت کے وجود کو ختم کرنا ہے جس کا مقصد اپنے سوا باقی سب کو جینے کے حق سے محروم کرنا ہے۔"

"آزاد فلسطین میں یہودی، عیسائی، نصرانی اور عرب اسی طرح آزاد اور محفوظ رہیں گے، جس طرح وہ صدیوں سے رہتے آئے ہیں ۔۔۔

عورتوں کی عصمت محفوظ ہو گی ___ بچوں کی مسکراہٹیں قائم رہیں گی۔ اور بوڑھوں کا سایۂ عاطفت اپنے کنبوں پر قائم رہے گا۔"

اعرابی کے چہرہ پہ حیرانی کا عالم پیدا ہوا۔ اس نے کہا۔

"تو تمہارا مقصد ہم سب کی جان لینا نہیں؟"

"تم کیسے فوجی اور پڑھے لکھے آدمی ہو ___ تم اتنا بھی نہیں سوچ سکے ___ نازی بھی کبھی بچوں کی مسکراہٹوں اور عورتوں کی آہ و بکا کے سامنے ہتھیار ڈال دیا کرتے تھے ___ ہم تو مسلمان ہیں ___ اسلام ہمیں یہ نہیں سکھاتا کہ مذہب و ملت کی بنیاد پر ہم کسی قوم پر عرصۂ حیات تنگ کر دیں ___ کسی دور اور کسی سرزمین پر بھی مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔"

اعرابی اور زیادہ حیران ہوا۔ اور بڑی دھیمی آواز میں اس نے کہا۔

"میں تو آج تک یہی سنتا آیا ہوں کہ عرب نازیوں کی طرح یہودیوں کے بچے بچے کو قتل کر ڈالیں گے ___ خون خرابہ ہو گا ___ عورتیں، لونڈیاں بنائی جائیں گی، اور عرب ممالک کے بازاروں میں نیلام ہوتی پھریں گی۔"

وہ پھر اداس ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

"یہ سب کچھ گھناؤنا ہے ___ یہ جنگ کیوں ہوتی ہے کمانڈو۔ کمانڈو مجھے اس سے نفرت ہے ___ مجھے اس ذلیل عورت سے بھی نفرت ہے، جو ابھی تمہارے ساتھ تھی ___ جو اپنے جسم کی عریانی سے سپاہیوں کے شہوانی جذبات بھڑکا کر انہیں تشدد پہ مائل کرتی ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ___ اس کا دل پگھل گیا۔

"نہیں اعرانی ـــــ آنسو دنیا کے ذہن پہ پھیلی ہوئی حرص و آز کی گندگی کو نہیں دھو سکتے ـــــ افراد کے کردار کے پیچھے نظام کا قصور ہوتا ہے ـــــ ہم اس نظام کو تباہ کرنا چاہتے ہیں ـــــ افراد کو نہیں ـــــ اور یہ نظام نوآبادیات کا ـــــ سرمایہ کاری کا ـــــ آمریت کا ہے ـــــ اس کی بنیاد انسان کو انسان سے نفرت کرنا سکھانا ہے ـــــ"

"میں سمجھتا ہوں ـــــ" سسکیاں بھرتے ہوئے اعرانی نے کہا ـــــ "افراد اور اقوام زندہ رہنے کے لئے مختلف ممالک میں برسرپیکار ہیں ـــــ روڈیشیہ، ویت نام میں ویت کانگ اور امریکہ میں سیاہ فام ـــــ ان کا اقدام راستی پہ ہے ـــــ"

"اعرانی یہ بھی کہو ـــــ سابقہ فلسطین میں الفتح کے رضاکار بھی وہی جنگ لڑ رہے ہیں ـــــ اقوام متحدہ اسرائیل کی جارحیت کو ختم کرنے کے لئے کچھ بھی نہ کرسکی۔ عرب شکست کے صدمہ سے سنبھلتے جا رہے ہیں، اور جانتے ہیں ویت نام کی طرح فلسطین کا واحد حل بھی جنگ ہے۔ ہم اسرائیل کو ویت نام میں بدل دیں گے ـــــ"

"یہ نعرہ پہلے بھی موشے دایان سن چکے ہیں ـــــ اور وہ کہہ چکے ہیں کہ اسرائیل ویت نام نہیں اور نہ ہی اسرائیلی فوجیں امریکی فوجیں ہیں ـــــ"

"یہ بھی دایان کی بڑھ ہے اعرانی ـــــ تمہارا دستہ اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے ـــــ امریکی فوجی دستوں سے بھی اس کا انجام زیادہ برا ہوا ہے ـــــ اسی طرح اسرائیل کو ویت نام میں تبدیل کرنا مشکل ہوگا ـــــ

اس کی کچھ اور بھی وجوہات ہیں۔"

"وہ کیا۔؟"

اعرانی رک گیا۔ لیکن احمد کے چہرہ پر سکون اور طمانیت دیکھ کر کہنے لگا۔

"کمانڈو۔۔۔ تم مجھے بڑے اچھے انسان معلوم ہو رہے ہو۔۔۔ میرے خیال میں اپنی رسوائی اور پسپائی کے عرب خود ذمہ دار ہیں۔۔۔ شاہ حسین، ناصر، شاہ حسن اس بات پر متفق ہیں کہ عربوں کو اپنے اختلافات، شامت اعمال اور خدا سے رشتہ توڑنے کی سزا ملی ہے۔"

احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔ واقعی وہ سچ کہہ رہا تھا۔

"ویسے بھی۔۔" اعرانی نے کہا۔۔۔ "عرب ملکوں نے اربوں روپیہ امریکہ و یورپ کے بنکوں میں جمع کر رکھا ہے۔۔۔ اس اندوختہ میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔۔۔ عرب رہنماؤں اور حکمرانوں نے کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ وہ اس روپیہ سے ملک میں صنعتیں قائم کر سکتے ہیں۔ کویت ہی کو لیں جس کا رقبہ چھ ہزار مربع میل سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس میں پچیس ہزار سے زائد ایرکنڈیشنڈ کاریں دوڑتی پھرتی ہیں، مگر عربوں کے دفاع و استحکام کے لئے کوئی سرو سامان نہیں۔۔۔ تیل کی رائلٹی بنک آف انگلینڈ میں جمع ہو رہی ہے، اگر اس کو نکلوا لیا جائے تو ساری دنیا میں اس ملک کی ساکھ گر سکتی ہے۔ باہمی طور پر اقتصادی اشتراک کا کوئی ادارہ عربوں نے قائم نہیں کیا۔۔۔ مربوط ہونے کے باوجود عرب

ریاستیں منقسم رہتی ہیں ___ کوئی اسلحہ ساز فیکٹری نہیں، حالاں کہ عالمی زرمبادلہ کے عرب نصف سے زائد حصہ کے مالک ہیں ___ ان کی دولت عملاً اور معناً سامراجیوں کے تصرف میں ہے

احمد ایک اسرائیلی فوج کے عیسائی سپاہی کی حقیقت پسندانہ گفتگو سنکر پریشان ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جھکے ہوئے انداز میں کہنے لگا ___

"تم ٹھیک کہتے ہو ___ افسوس کہ عرب سرمایہ داروں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ حالاں کہ عرب عوام اس کے متعلق سوچتے ہیں ___ عرب عوام ہی نہیں تمام عالم اسلام کے رہنما سوچتے ہیں۔ تبھی تو جولائی ۱۹۶۵ء میں افریشیائی اتحاد کی طرف توجہ دی گئی تھی ___ الجزائر میں پہلی کانفرنس ہونے کی تاریخ مقرر ہو گئی ___ لیکن کیا ہوا ___ تم جانتے ہی ہو گے۔ بن بیلا کو ختم کیا گیا ___ سوئیکارنو کو سیاستاً مفلوج کر دیا گیا ___ نائیجیریا کے ابوبکر کو جام شہادت نوش کرنا پڑا اور اب جمال عبدالناصر کے ساتھ جو ہوا وہ سب نے دیکھا ___ اردن، شام اور عراق پہ کتنی کاری ضربیں لگائی گئیں ___"

"ہر کسی کو یہ ناگوار گزرا ___ مگر بے فائدہ؟"

"یہ سی، آئی، اے کا کام تھا"

"دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسرائیل کے حواریوں کی کارستانی تھی ___ اور ہمارا یہ ایمان ہے کہ روس اور امریکہ نے مل کر اس

حرامی بچے کو جنم دیا ہے جس کا نام اسرائیل ہے اور ان دونوں طاقتوں کے اندر صیہونی خون گردش کر رہا ہے — اسی لیئے ہم نے — فلسطینی مہاجروں نے — الفتح نے یہ ٹھان لی ہے کہ وہ سوتے ہی بند کر دیئے جائیں جہاں سے ان طاقتوں کا خون پھوٹتا ہے۔"

دونوں رضا کار تھوڑا عرصہ کام کرنے کے بعد قیدی سپاہیوں کے قریب آ گئے — احمد سر جھکائے اپنی سٹین گن سنبھال کر چلنے لگا تو اسی نے پھر اعرابی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یاد رکھو — میرے عیسائی دوست — یہودیت کبھی عیسائیت کی حامی نہیں رہی — تم بھی کسی دن محسوس کر و گے — ہم عرب جان گئے ہیں کہ عرب نیشنلزم طاقت نہیں، طاقت اسلام ہے اور اسلام ہی نام پر آئندہ تمام مصائب سے نپٹا جائے گا — عربوں کو جنگ میں ہار نہیں ہوئی بلکہ وہ جنگ میں رہ گئے ہیں — زخمی ہونے اور مایوس ہونے میں فرق ہے — اچھا پھر ملاقات ہو گی۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وہاں پہنچ گیا جہاں رمیکا، ذکیہ اور سارہ تھیں۔

وہ احمد کو قریب آتا دیکھ کر خاموش ہو گئیں۔

"میں مخل ہوا ہوں" احمد نے کہا۔

"نہیں تو" سارہ نے کہا۔

"دیکھا نا تم میں سچی بات کہنے کی جرأت نہیں" رمیکا جلدی سے

بول پڑی اور احمد کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"یقیناً آپ مخل ہوئے ہیں، ہم کچھ ایسی باتیں کر رہے تھے جن کا تعلق عورتوں سے ہے۔"

سارہ جھینپ گئی۔ نظریں جھکا کر کہنے لگی۔

"آپ چلے جائیں نا ابھی۔"

احمد یونہی ہٹ گیا۔ پانی کے کنارے کنارے ٹہلنے لگا۔ اس نے سوچا۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ یہ رمیکا ان میں کیسے گھل مل گئی ہے، یہ تو مجھے بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ سارہ کی ہم مکتب رہ چکی ہے۔ لیکن اتنی گھل مل کر باتیں کرنا تو خطرناک ہے۔ وہ کچھ بھی ہو، بہرحال اسرائیل کی ملازم ہے۔ مجھے ان کو ایسی باتوں سے منع کرنا چاہیئے۔

یہ سوچ کر وہ چلا تو اس نے دیکھا کہ سارہ اس کے پاس پہنچ گئی ہے۔ سارہ خود ہی کہنے لگی۔

"میں رمیکا اور ذکیہ کو باتوں میں لگا کر آ گئی ہوں۔"

"کیا باتیں تھیں۔ مجھ سے کیا پردہ؟"

"رمیکا ہمیں اپنی زندگی کی کہانی سنا رہی تھی۔ وہ ایک ذہین، محنتی اور تیز طرار لڑکی تھی۔ ۱۹۵۶ء کے معرکہ میں اسے اغوا کر لیا گیا، کیمپوں میں رکھا گیا۔ اس کی عصمت لوٹی گئی۔ اور اس کا ذہن یوں ماؤف کیا گیا کہ وہ اپنی اصل، اپنا گھر، اپنے والدین اور ماضی سب کچھ بھولا ہوا تصور کرتی ہے۔ لیکن اس کے ذہن میں سب کچھ تازہ ہے، گستاپو،

اور نازی طریقوں سے اس پہ پروپیگنڈے کا اتنا اثر ڈالا گیا ہے کہ وہ ہر لمحہ اپنے کپڑے اتارنے، ناچنے اور تیز و تند باتیں کرنے میں اپنی عافیت سمجھتی ہے — ہر بات میں اسرائیل کا نام لیتا اسے اذیت ناک مرحلوں سے گذار کر سکھایا گیا ہے — وہ ایک مریض ہے — دھوئے ہوئے دماغ والی لڑکی ہے ۔"

"جب آپ آئے تھے اس وقت میں نے اس کی شادی کی بات کی تھی — اسے ایک گھر کا تصور دلایا — جس میں اس کا چاہنے والا خاوند اور ہنستے کھیلتے بچے ہوں، تو وہ اس موضوع پر بڑی دلفریب باتیں کر رہی تھی — شادی بیاہ کے جسمانی پہلو سے لے کر روحانی پہلو تک اس کے لاشعور میں کئی روپ موجود ہیں — اگر اس کے ساتھ ہمدردی کی جائے تو وہ سب کچھ بھول کر وہی ذہین، محنتی اور تیز طرار عرب لڑکی بن سکتی ہے جو ہیرو گیٹ کے سیکنڈری سکول میں پڑھتی تھی ۔"

احمد سمجھ گیا — فری میسن لاجوں کے تحت یہودی تحریک در پردہ ذہین و فطین لوگوں کو اکٹھا کر کے بڑے موثر پروپیگنڈہ اور موت کی دہشت سے ایسا طبقہ پیدا کر رہے تھے جو یہودی تو نہ ہو لیکن کام یہودیت کے لئے کرے یہ لاجیں دنیا کے کونہ کونہ میں پھیلی ہوئی ہیں اور کوئی نہیں جانتا کہ بڑے بڑے بند دروازوں کے پیچھے خاموش لمحات میں کیا کچھ ہوتا ہے — انہی لاجوں کے اجتماعات میں ترک نوجوانوں کو جذباتی نعروں سے گرما کر عربوں کے خلاف نفرت کے زہر سے بھر دیا تھا۔ یہ نفرت آگے چل کر آتش فشاں ثابت ہوئی تھی — اسرائیل کے طول و عرض میں سے جذباتی اور قابل نوجوان لڑکوں

لڑکیوں کو بھی لالچ میں گھیرے مقاصد کے لئے استعمال کر رہی تھیں۔"

"آپ نے کچھ غور کیا کہ ہم اس لڑکی کو کیسے راہ راست پر لا سکتے ہیں؟"

"ہاں اسے دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ بتاؤ کہ امریکہ اور روس دونوں ایک ہیں ــــ صیہونیت ایک عذاب ہے ــــ عرب عوام کسی کے دشمن نہیں ہے۔ وہ تو اس سرزمین کو لہکتا مہکتا گلزار بنانا چاہتے ہیں۔ جس میں چالاکی اور عیاری کا گذر بھی نہ ہو گا۔"

سارہ نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس چلی گئی۔

سائے لمبے ہوتے گئے، سورج پہنائیوں کی طرف تیزی سے جانے لگا۔

احمد نے ایک اور دستہ جس میں مقامی باشندے تھے، تباہ شدہ اسرائیلی کیمپ کی طرف بھیجا کیونکہ وہاں سے ابھی تک چاروں رہنما کار واپس نہیں لوٹے تھے ــ قیدی سپاہیوں کو اس نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ ازراہ مروت اس نے انہیں چلنے پھرنے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی اس نے ان کو بتا دیا کہ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو پھر نتائج کی ذمہ داری خود ان پہ ہو گی ــــ مقامی باشندوں میں سے نوجوانوں کو اس نے ان پہ نظر رکھنے کی ہدایت کی ــ باقی دونوں مجاہدوں کو بھی اس نے چند مقامی عرب باشندوں کے ساتھ اسرائیلی کیمپ کی طرف بھیج دیا۔

شام کو کھانے کے بعد دو سپاہیوں کو مقامی باشندوں کی تحویل میں دے کر اعرابی کو ساتھ لے کر وہ زیر زمین مورچہ کے قریب آ گیا۔ وہاں سارہ اور رقیہ کے ساتھ ریکا بھی موجود تھی۔

باتوں باتوں میں پھر سیاست پہ گفتگو ہونے لگی۔ سیاست بھی عرب اقوام کی نہیں، بلکہ یہودیوں کی۔ ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس سے ایک دوسرے کی معلومات میں اضافہ ہوا، بلکہ اگر اسے ریکارڈ کر لیا جاتا تو باقاعدہ بھٹکے ہوئے ذہنوں کے لئے ایک تازیانہ ثابت ہوتا۔ ان کی گفتگو کا طریق، عالمانہ طرز استدلال کچھ اس قسم کا تھا کہ ان پہ سیاسی ہونے کی بجائے عالم ہونے کا گمان غالب آتا تھا۔ انہوں نے جو کچھ کہا وہ نہ صرف حیران کن تھا بلکہ اس پہ یقین کرنا مشکل تھا۔ یہ سب کچھ سن کر نہ صرف رمیکا نے سر تھام لیا بلکہ اعرانی کی زبان پہ تالے لگ گئے۔

سارہ نے بتایا۔

'روس کا صیہونی انقلاب صیہونی تحریک کا منصوبہ تھا۔ اشتراکی نظام کے ذہنی قائدین یہودی تھے۔ انہوں نے نام بدل دیئے۔ کارل مارکس ماں باپ دونوں کی طرف سے یہودی تھا۔ ٹراٹسکی اور لینن خالصتاً یہودی تھے، لینن اور سٹالن کی مائیں اور بیویاں یہودی تھیں۔ انقلاب روس سے پہلے یہودی خاص طور پر سرگرم عمل تھے۔ جنگ عظیم اول کی ابتدا کے بعد لینن اور اس کے دوسو ساتھیوں کو جرمنی سے روس کی سرحد کے اندر دھکیل دیا گیا۔ اس کے ۱۶۵ ساتھیوں کے نام ابھی تک محفوظ ہیں۔ ان میں سے ۱۲۸ یہودی تھے۔ ٹراٹسکی امریکہ سے تین صد یہودی لے کر روس پہنچا۔ اور انقلاب کا سامان پیدا کیا۔ انقلاب کے بعد روسی حکومت کی ۵۵۶ کلیدی آسامیوں میں سے ۴۵۷ پر یہودی نے قبضہ کر لیا۔ الیگزینڈر ٹیل مین نے

اپنی کتاب "یہودی جنگ کے بعد کی دنیا کا سامنا کرتے ہیں" میں روسی انقلاب کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا ہے۔

اگر سرخ فوج نہ ہوتی تو آج یورپ میں، فلسطین میں، افریقہ میں، کہیں کوئی یہودی زندہ نہ ہوتا۔ امریکہ میں ہمارے وجود کی مدت چند دنوں میں ختم ہو جاتی یہ سوویٹ یونین سٹیٹ تھی جس نے یہودیوں کو مٹ جانے سے بچا لیا۔ اس لئے امریکہ کے یہودیوں کو اپنا تاریخی فرض نہیں بھولنا چاہیئے جو ہم نے اپنے نجات دہندگان "سوویٹ یونین" کو ادا کرنا ہے۔"

"علاوہ ازیں"۔۔۔۔ احمد نے بتایا۔۔۔ "روس وہ حکومت ہے جس نے سب سے پہلے اسرائیل کو تسلیم کیا۔۔۔ جون ۱۹۶۷ء کی جنگ۔۔۔ سے قبل اور بعد بھی ہماری آنکھیں روس کی طرف لگی رہیں اور ہمیں تسلیم کرنا پڑا کہ حکومت مصر کے اس دوست نے بھی کوئی وفا نہیں کی۔۔۔ ہماری رسوائی اور پسپائی کے بعد بھی روس ہمیں سبز باغ دکھا رہا ہے اور عربوں کا دوست بنا ہوا ہے۔"

سارہ نے احمد کی بات چھینتے ہوئے کہا۔

"ہمیں دنیا کو یہی بتانا ہے کہ عالمی مسائل جن کو روس اور امریکہ کے زاویہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ دراصل یہودیوں کے ہی پیدا کردہ ہیں۔ یہودی ایک مدت سے تمام غیر یہودی اقوام کو غلام بنا کر پوری دنیا پر حکمرانی کے منصوبے بنا رہے ہیں۔

۱۸۵۷ اور ۱۹۰۵ء کے درمیان یہودیوں کے مفکرین جمع ہوتے

رہے ہیں اور دنیا بھر میں انقلاب بپا کرنے کے لئے پروگرام وضع کرتے رہے۔ برٹش میوزیم لائبریری میں ۱۹۰۵ء کی مطبوعہ ایک کتاب کو دوبارہ پروفیسر نائیس نے شائع کیا ہے جس کا نام "پروٹوکولز آف دی ایلڈرز آف زیون" ہے میں انقلاب روس کا سارا نقشہ موجود ہے ۔ اسی کتاب میں ترکی سے خلافت ختم کرانے کا اور اسرائیل کی تشکیل کا پورا ذکر موجود ہے ۔ کرہ ارض پر قبضہ جمانے کے جملہ اصول اور نکات موجود ہیں "

مختلف سوالات و جوابات دیر تک صحرا میں بیٹھے ہوئے اسی مختصر مجمع میں ہوتے رہے۔ ان کا لب لباب یہ تھا کہ اقوام متحدہ کی تشکیل بھی یہودیوں کے ایما سے ہوئی۔ اس کی تفصیل مشہور عالم یہودی قانون دان ہنری کلین کی کتاب "صیہون دنیا پہ حکمران ہیں" میں ملتی ہے۔ اس نے لکھا کہ یہ وہی بالادست حکومت ہے جس کا ذکر جلیل القدر صیہونی اکابرین کے پیروٹوکول ۱۸۹۷ء سے لے کر ۱۹۰۵ء میں ملتا ہے۔

اس عالمی ادارہ کے علاوہ بے شمار خفیہ تنظیمیں صیہونیت کے لئے کام کر رہی ہیں۔ اور ان کے کام کرنے کا اندازہ اتنا جدید اور منضبط اور سائنٹیفک ہے کہ ہر ملک کے ذہین افراد اس میں شریک ہو جاتے ہیں جن میں سے فری میسن پیش پیش ہیں۔ جین ایزد لیٹ جیوش اسرالائٹ الائینس یونیورسیلے نے ۱۹۳۱ء میں پیرس کے ایک رسالہ "پیرس لائیکٹیل واری میجین" میں لکھا۔ "پچھلی صدی کی تاریخ کا لب لباب یہ ہے کہ آج تین سو یہودی سرمایہ دار جو سب کے سب فری میسن لاج کے اعلیٰ عہدیدار ہیں پوری دنیا پر حکومت کر رہے

ہیں ـــــ

آخر میں اٹھتے وقت احمد نے اعرابی کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"دوست تم عیسائی ہو لیکن کس کلیسا سے تعلق رکھتے ہو؟"

"میں پروٹسٹنٹ ہوں" اعرابی نے جواب دیا۔

"تو میرے خیال میں یہودیت نے کیتھولک چرچ سے معاہدہ کر لیا ہے کہ وہ اب اکٹھے اسلام کے خلاف برسرپیکار رہیں گے۔ ماضی کے تجربات سے یہودیوں نے یہ سیکھا ہے کہ وہ تنہا مسلمانوں کے خلاف موثر کام نہیں کر سکتے ادھر دنیائے مسیحیت مسلمانوں سے صلیبی جنگوں کا انتقام لینے کے لئے مضبوط طاقت کی تلاش میں تھی۔ دونوں نے گٹھ جوڑ کر کے عالم اسلام کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے آس پاس عرب سلطنتیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لئے پہلا ہدف یہی سلطنتیں بنیں۔ یہ متحدہ محاذ عرب اتحاد کبھی نہیں ہونے دے گا۔ بہرصورت ہم دیکھیں گے۔ مستقبل فیصلہ کرے گا۔ وقت فیصلہ کرے گا۔ تم بھی سوچو، ہم بھی سوچتے ہیں؟"

دونوں چلتے چلتے پھیلی ہوئی چاندنی میں شانہ بشانہ چلتے رہے۔ جیسے کچھ سوچ رہے ہوں۔

آہستہ آہستہ صحرا پہ خاموشی چھا گئی۔

سارہ ریکا کے پاس تھی۔ ذرا فاصلہ پر ذکیہ سو رہی تھی۔ ریکا چند لمحے پیشتر ہونے والی باتوں سے بے حد متاثر نظر آ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں مختلف خیالات چکر لگا رہے تھے۔ اچانک اس نے عربوں کا ایک مقبول و معروف گیت گانا شروع کر دیا۔

اے میرے نادان دل، غم نہ کھا۔
ایک دن وہ بھی آنے والا ہے۔
جب گرما کے تیز و تند جھکڑ چلیں گے۔
ریت کے تودوں کا سفر شروع ہو گا۔
پانی کے مشکیزے خشک ہو جائیں گے۔
اس کے قبیلے سمیت سب قبیلے ایک ہی سمت چل دیں گے۔
پانی کی تلاش میں
زندگی کی تلاش میں

ٹھنڈے نخلستان کی تلاش میں

تب میں تم سے کہوں گی

جو تو نے دوری کا غم کھایا تھا وہ تیری نادانی تھی "

رمیکا نے یہ گیت اتنے میٹھے انداز میں اور ِجذباتی انداز سے گایا کہ ذکیہ نے آنکھیں کھول دیں۔ قریب سوئے ہوئے مقامی باشندے بھی اس لے سے اتنے متاثر ہوئے کہ اس کے گرد آکر کھڑے ہو گئے۔ احمد اور اعرانی نے بھی گیت سنا۔ احمد تو اس آواز سے مسحور ہی ہو گیا۔

لیکن اتنے آدمیوں کی موجودگی کے باوجود رمیکا گیت ختم کر کے سسکیاں بھرنے لگی۔ سارہ نے اسے تسلی دی اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا تو وہ اور زیادہ رونے لگی۔ ذکیہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

"کوئی بات بھی ہے نادان نہ بنو" ذکیہ نے کہا۔

بجائے جواب دینے کے رمیکا نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور اوندھے منہ گر کر سسکیاں بھرنے لگی۔

ذکیہ فلسطین کے مہاجرین کا المیہ سریلی آواز میں گانے لگی۔

"سورج آج بھی ویسے ہی طلوع ہوتا ہے۔

مگر

نہ کوئی پردہ ہے نہ چھت

اور گرد و غبار کا طوفان

ہوا کے دوش پر سوار شتر بے مہار کی طرح چلا آتا ہے۔

ہر وقت، ہر لمحہ
اور ان ذروں سے
بچوں کے سینے میں جراثیم بھر گئے ہیں
اور اس طویل رات نے
قسم کھالی ہے کہ وہ اپنی طوالت کم نہ کرے گی۔
اور نہ اس کے طوفان تھمیں گے
اور بھوک
وہ بھوک جو چین نہیں لینے دیتی
اس سے چھوٹے بچے سب بے قرار ہیں
اور روٹی ملتی ہے
مگر قیمت ادا کر کے
—— کہا جاتا ہے
عنقریب حالات پر غور کیا جائے گا۔
مگر کب؟
جب بڑے لوگ، صاحب اقتدار بے فکرے
کاغذات پہ غور کریں گے
اور پھر عنقریب وعدے، دلفریب وعدے کئے جائیں گے
ان سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔
وہ رسیلے عربی لہجہ میں گاتی رہیں۔ اور ساتھ ساتھ ریما کو تھپکی دیتی

گئی۔ رمیکا پڑے پڑے سو گئی۔ جیسے اس کے دل کا بوجھ آنکھوں کی راہ بہہ کر نکل گیا ہو۔ ذکیہ بھی اٹھ کر اپنی چٹائی پر چلی گئی۔ باقی لوگ بھی آہستہ آہستہ اس کے دل کے بوجھ میں کھو گئے۔ احمد بھی آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ اعرابی کروٹیں بدل رہا تھا۔ دوسرے دونوں قیدی مزے سے خراٹے لے رہے تھے

اچانک ٹھنڈی ٹھنڈی صحرائی ہوا میں تیزی کے آثار پیدا ہو گئے۔ دور سے کسی مقامی باشندے نے چلا کر کہا۔

"طو۔۔۔ فا۔۔ن"

طوفان کے لفظ سنتے ہی مقامی باشندوں میں بالخصوص اور دوسرے افراد میں بالعموم بے چینی سی پھیل گئی۔ اچانک آسمان پر کئی ایسے پرندوں کی آوازیں سنائی دیں جو ہوا کے آگے آگے اڑ رہے تھے۔ چاند کے آگے بادل سے آ گئے۔ مقامی باشندوں نے بتایا کہ یہ بادل نہیں بلکہ وہ ریت ہے جو اڑ کر اوپر چلی گئی ہے۔ اور اگر جلدی جلدی ہم نے درختوں کی اوٹ یا اور مناسب جگہوں پر پناہ نہ لی تو خطرناک بات ہو گی۔

احمد نے قیدیوں کو زیر زمین مورچہ میں اتار دیا۔ خواتین کو آواز دی۔ سارہ اور رمیکا کے علاوہ چند مقامی باشندے بھی مورچہ کے اندر آ گئے۔ احمد خود بھی اندر آ گیا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اندر ذکیہ نہیں ہے وہ اسے تلاش کرنے کے لئے باہر نکلا۔ اب ہوا سے کھجوروں کے درخت ایک طرف کو جھکے جا رہے تھے۔ ہوا تیز سیٹیاں بجاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ذخیرہ کا پانی اچھل رہا تھا۔ اور اس کے چھینٹے مورچہ تک آ رہے تھے۔ احمد نے دو چار آوازیں ذکیہ

کہہ کر دیں۔ لیکن کسی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ واپس مورچہ میں آ گیا۔
اسے اطمینان تھا کہ مقامی باشندوں کے ساتھ ذکیہ نے کہیں پناہ لے لی ہوگی۔
مورچہ کے اندر حبس تھا لیکن اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

"ریت اڑ رہی ہے کمانڈو — ہم زندہ دفن ہو جائیں گے۔" موٹے قیدی نے کہا۔

"نہیں نخلستان مدیوں سے آباد ہے۔ یہاں ہواؤں کا رخ خطرناک نہیں ہوتا تم کوئی فکر نہ کرو۔" احمد نے اسے کہا۔

"نہیں تم نے دیکھا نہیں ریت آسمان کی طرف اٹھ گئی ہے۔ ہمیں یوں نہ مارو گولی مار دو۔"

"تمہیں مارنے کا کسی کا کوئی خیال نہیں بلکہ ہم تمہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ تمہارے بدلے ہم اپنے ساتھیوں کی رہائی کا انتظام کریں گے۔ تم بے فکر رہو۔" احمد نے مزید سمجھایا۔

"نہیں میرے ہاتھ کھول دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاگوں گا نہیں — مجھے باہر نکل جانے دو میں اندر گھبرا کر مر جاؤں گا۔"

"فکر نہ کرو، میں دروازہ پر نکل کر پہرہ دیتا ہوں۔ اگر ریت نے یہاں ٹیلہ بنانا شروع کر دیا تو میں تم سب کو نکال دوں گا۔" احمد نے کہا۔

"نہیں نہیں۔" سارہ نے کہا۔ "آپ تھکے ہوئے ہیں، کل رات بھی نہیں سو سکے۔ آپ اس کے ہاتھ کھول دیں۔"

احمد نے ایک لمحہ کے لئے سوچا اور دونوں قیدیوں کے ہاتھ کھول دیئے

وہ ڈھلوان راہ سے جلد جلد باہر نکل گئے۔

"کمانڈر۔ آپ نے غلطی کی ہے۔ یہ بے وقوف یا تو اپنی جان دے دیں گے یا اگر بچ گئے تو مصیبت بن جائیں گے۔" اعرابی نے کہا۔

"نہیں دوست، بعض اوقات جان بوجھ کر غلطیاں کرنی پڑتی ہیں۔ انہیں گھٹن کے احساس کے ساتھ یہ بھی احساس تھا کہ نہ جانے ان کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ وہ اس طوفان کی آڑ میں بچ نکلنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں چھوڑ دیا تاکہ وہ اپنی پھڑ پھڑانے کی حسرت تو پوری کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ نخلستان کی حدود سے باہر نہیں جا سکیں گے۔" احمد نے سمجھایا۔

ایک مقامی عرب بول اٹھا ــــ

"ہم نے ایسے کئی طوفان دیکھیں ہیں۔ ریت کے بادل اسی نخلستان کے گرد اگرد کبھی کبھی برس جاتے ہیں۔ ٹیلے جگہ بدل لیتے ہیں۔ دو تین انچ ریت نخلستان میں بھی چڑھ جاتی ہے جس سے اس کی جگہ اونچی ہو جاتی ہے۔ لیکن پھر کسی وقت دوسری سمت کی ہوا چلتی ہے تو تین انچ کی بجائے چھ انچ ریت یہاں سے اڑ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ مدتوں سے جاری ہے اور یہ نخلستان آباد ہے۔ کئی دفعہ تو ریت کے نیچے سے مٹی نکل آتی ہے اور ہم معمولی کھیتی باڑی بھی کر لیتے ہیں۔"

احمد یہ باتیں سنتا رہا۔ کبھی کبھی وہ دروازہ تک آکر طوفان کا جائزہ لیتا۔ اس کی شدت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ واپس جاتا۔ ہری کین لیمپ کا شعلہ بھڑک اٹھتا اور پھر اطمینان سے جلنے لگتا۔ اس نے ایک دو دفعہ سارہ کی طرف دیکھا وہ بھی اسے دیکھ رہی تھی۔

یہ اس کی شادی کی دوسری رات تھی لیکن یہ دونوں راتیں اسی طرح اداس تھیں جب ان کی شادی نہیں ہوئی تھی اور اسرائیلی طیارے رات کے سناٹوں میں آتے تھے۔

دو ہی سال قبل کی تو بات ہے ۔ وہ اس وقت قاہرہ میں ہی تھا۔ جب جنگ کے منڈلاتے بادل اچانک برس پڑے تھے۔ ہوا کیا تھا۔!

بین الاقوامی قانون کے تحت ہر ملک کے ساحل سے لے کر تین سے دس میل تک جو سمندری پٹی ہو وہ اس ملک کے علاقائی سمندر کی حیثیت رکھتی ہے عقبہ کی پٹی سو میل لمبی ہے لیکن کسی مقام پر اس کی چوڑائی دس بارہ میل سے زیادہ نہیں۔ اس کے دونوں طرف عرب ممالک ہیں۔ عربوں نے اسرائیل سے چپقلش کے پیش نظر خلیج عقبہ کی ناکہ بندی کر دی کہ اسرائیل کا کوئی جہاز اس میں سے نہیں گزر سکتا۔ سامراجی طاقتوں نے اور اسرائیل نے واویلا شروع کر دیا کہ خلیج عقبہ ایک بین الاقوامی شاہراہ ہے۔ اس ناکہ بندی کو ختم کرنے کے لئے امریکہ نے اپنا چھٹا بحری بیڑہ بحیرہ روم میں تعینات کر دیا۔ ایلات کی بندرگاہ کے بند ہو جانے سے اسرائیل کی معاشیات کو دھچکا لگا۔

دھمکیاں شروع ہو گئیں۔ اسرائیل اور اس کے حواریوں نے ناکہ بندی توڑنے کی ٹھان لی۔ وہ عرب ممالک کے کسی بھی حق کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ عرب ممالک بھی ڈٹ گئے۔

۵ ر جون ۱۹۶۷ء کو اردن اور اسرائیل کی فوجوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ عراق کی فوجوں نے اردن کی حمایت میں مورچے سنبھال لئے۔

۶ر جون کو شام، لبنان، عراق، سوڈان، الجزائر، کویت، یمن اور اردن نے باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا۔ یروشلم میں خوفناک جنگ شروع ہو گئی قاہرہ اور عمان پر بمباری ہوئی۔ دمشق، قاہرہ، بیروت اور عمان کے ہوائی اڈے بند کر دیئے گئے۔ اسرائیل کے جنوبی محاذ نے عرب جمہوریہ کی فوجوں پر حملہ کر دیا۔ اسی روز قاہرہ پر زبردست ہوائی حملہ ہوا۔ یہ حملہ امریکی طیاروں کی مدد سے کیا گیا اور اس کے بعد صحرائے سینا میں نخف کے علاقہ میں اسرائیل نے حملہ کیا۔ غزہ میں بھی جنگ شروع ہو گئی۔ شام تک قاہرہ پر اسرائیل نے تین حملے کئے۔ میدانی جنگ میں خان یونس، نکیتلا کے محاذ پر حملے ہوئے۔ شرم الشیخ، اردنی یروشلم اور لبنان پر اسرائیل نے حملے کئے۔

جواب میں تل ابیب، حیفہ پر حملے کئے گئے۔ مصری بحریہ نے تل ابیب پر گولہ باری بھی کی۔ قنطیلہ کے محاذ پر اسرائیل کی پوری ایک بریگیڈ فوج ختم کی گئی۔ اردن نے جبل المکبر کے اہم پہاڑی مورچہ پر قبضہ کر لیا۔ اسرائیل نے دعویٰ کیا کہ اس نے بیت المقدس کے جنوبی علاقہ میں سربہار، الشیخ عزیز، قربطوس اور مالہ ہمشیہ اردنی بستیوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ صحرائے سینا میں العریش اور غزہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔

جنگ کی ان خبروں نے احمد کی راتوں کو اور اداس کر دیا تھا۔ اس نے جنگ کے روزمرہ واقعات کی ڈائری بھی لکھی تھی جو اب عمان میں اس کی ہمشیرہ کے گھر اس کے سامان میں پڑی تھی۔

عالم اسلام میں اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ پاکستان، ایران، ترکی، کویت

صومالی لینڈ اور دیگر انصاف پسند ممالک نے اسرائیل کی جارحیت کی مذمت کی۔

مختلف خبریں آتی رہیں۔ کسی خبر کو سنکر احمد کا دل بیٹھ جاتا اور کسی کو سنکر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگتا۔ باوجود کرفیو اور خطرہ کے وہ اپنے خیالات سے سارہ کو مطلع کرنے کے لئے اس کے پاس جاتا۔ اداسی قائم رہتی کیونکہ خبریں بیشتر منحوس تھیں۔ وہ اس رات کی طرح خبروں پر تبصرہ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو خاموشی سے تکتے اور علیحدہ ہو جاتے۔

جس روز جنگ بند ہوئی اس روز بجائے خوشی کے احمد کے ہاں اداسی زیادہ تھی یہی حال سارہ کا تھا۔ وہ احمد کی مرتب کردہ خبروں کی ڈائری دیکھ رہی تھی۔

۱۰ر جون تک خبریں لکھنے کے بعد اس نے اسرائیلی حکومت کے بیانات کی ایک علیحدہ فہرست بنا رکھی تھی۔ سب سے پہلے موشے دایان کا بیان تھا۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ ہم نہیں چاہتے کہ امریکہ اور برطانیہ کی فوجیں ہماری خاطر لڑیں۔ ہم عربوں سے خود نمٹ لیں گے۔

۶ر جون کو اسرائیل نے طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دی۔

۷ر جون کو اسرائیل نے روس سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا اثر ورسوخ جنگ بند کرنے میں استعمال کرے۔

۸ر اور ۹ر جون کو اسرائیل نے بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد اسے نہ چھوڑنے کا اعلان کیا اور اپنے مقبوضات پر گورنر مقرر کئے۔

۱۰ رجون کو اسرائیل نے جنگ بندی قبول کر لی۔ صدر ناصر کے مستعفی ہونے سے اسرائیل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

آخری سطور پڑھ کر باوجود اداسی کے سارہ مسکرا اٹھی تھی اور احمد نے پوچھا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ بھی نہیں وہ پرانی سیاست گری ہے۔ عرب عوام کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔ صدر ناصر نے شکست کی ذمہ داری قبول کر کے پہلی دفعہ اعتراف گناہ کیا لیکن ساتھ ہی اپنے مقبول ہونے اور تخت حکومت پر قابض رہنے کے لئے اس نے پہلے سے تیار کردہ منصوبہ کے تحت واویلا کرا دیا۔ ذکریا محی الدین نے صدر نہ بننے کا اظہار کر کے اپنی وفاداری پر مہر ثبت کی اور پھر سیاست مصر میں تبدیلی آتی آتی رہ گئی۔"

احمد نے کہا تھا۔

"جانے تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ صدر ناصر کا اس شکست سے کیا تعلق ہے اس کے بیانات تم نے نہیں پڑھے۔ یہ دیکھو۔ میں نے ڈائری میں صدر ناصر کے بیانات بھی تاریخ وار لکھ رکھے ہیں۔ ان میں عربوں سے والہانہ محبت کی بو آتی ہے۔ ملک و ملت سے گہری وابستگی ظاہر ہوتی ہے۔ اس نے کس جذبہ سے کہا تھا کہ ہم چار روز میں اسرائیل کو ختم کر دیں گے۔ ہم جنگ کے شعلوں سے زیادہ گرم ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کی جنگ میں مداخلت کے ہمارے پاس کافی ثبوت ہیں۔"

"یہ بھی تو آپ نے ہی لکھا ہے نا کہ اسرائیلی قبضہ کے بعد خلیج عقبہ میں پہلا روسی جہاز داخل ہوا۔ روس کے رویہ میں تبدیلی آگئی وغیرہ وغیرہ ــ آج کے تاریخی دن میں یہ بات یاد رکھو ــ اگر اس بے رخی کے باوجود صدر ناصر روس سے مراسم نہ رکھے گا تو آپ سچے ــ اور اگر پھر بھی صدر ناصر روس کی بغل میں گئے تو کون سچا؟"

"ــ آپ" احمد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں تم کہئے" سارہ نے جواب دیا۔

"تم" احمد نے آہستہ سے کہا۔

یہ ۱۹۶۷ء کی اس گرم شام کی بات تھی جب عرب اسرائیل جنگ بند ہوئی تھی اور اب وہ رات تھی جوان راتوں میں سے ایک تھی جن میں عرب مجاہدین اپنی بقا کے لئے جد وجہد میں عملی اقدام کرتے تھے۔ لیکن اس کی ذاتی زندگی میں یہ رات گزری ہوئی رات کی طرح بڑے ارمانوں بھری رات تھی۔ ایسی رات جس کی تعریف میں شاعر قلم توڑ دیتے ہیں اور اہل دل اس کی لطافتوں کو تمام زندگی محسوس کرتے ہیں ــ لیکن اس رات آسمان سے ریت برس رہی تھی اور مورچہ میں حبس تھا اور کئی لوگ پناہ گزیں تھے ــ ان میں سے ایک سارہ بھی تھی۔ جو اب اس کی بیوی تھی۔

اس نے سارہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں رمیکا اعرابی کی طرف حیرانگی کی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور اعرابی اپنے خیالات میں مست بیٹھا تھا۔ مورچہ میں ایک سے دوسرے سرے تک اداسی تھی۔

احمد اپنے ان دوستوں کے متعلق بھی سوچ رہا تھا جو اسرائیلی کیمپ کی طرف گئے تھے اور اب تک واپس نہیں لوٹے تھے۔

"جانے اس طوفان میں ان کا کیا بنا ہوگا؟" یہ سوچ کر وہ اداس ہو گیا۔ دل ہی دل میں دعا کی۔" اے اللہ تعالیٰ۔ ان دوستوں کی نگہبانی کیجیو۔"

سارہ اپنی جگہ سے اچانک اٹھی اور دروازہ کی طرف لپکی۔ احمد بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ باہر ابھی تک جھکڑ چل رہے تھے۔ لیکن اس میں اب تندی نہیں رہی تھی۔

احمد نے سارہ کو تھام لیا۔ اور وہ درختوں کے اس جھنڈ کی درمیانی ریت تک پہنچے جہاں ذکیہ بھی موجود تھی۔ لیکن وہاں اب کوئی بھی نہیں تھا۔ ریت کا بادل چاند کے چہرے سے ہٹ گیا تھا اور اب چاندنی میں درختوں کی جھومتی ٹہنیاں نظر آ رہی تھیں۔

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ان جھنڈوں کی طرف گئے جہاں کئی مقامی باشندوں نے اپنے اوپر کینوس کی چادریں تان کر طوفان کو گزارا تھا۔ ذکیہ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ دونوں بے حد پریشان تھے۔ انہوں نے مقامی باشندوں سے پوچھا لیکن کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ وہ پھر مورچہ کی سمت آئے اور انہوں نے مقامی لوگوں سے کہا کہ طوفان ختم ہو چکا ہے اور اب ان کو ان کے ساتھ مل کر ذکیہ کی تلاش کرنی چاہیئے۔ وائرلیس سیٹ بھی ذکیہ کی تحویل میں تھا۔ وہ اسے بھی کہیں نہ پا سکے۔ رات کا بقیہ حصہ بڑی بے چینی میں گزارا۔

صبح ہوئی تو نئے سرے سے ذکیہ کی تلاش شروع ہوئی۔ اعرابی بھی ان کے ساتھ تھا۔ اس نے احمد کو کہا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ آپ نے ان دونوں کو چھوڑ کر سخت غلطی کی ہے۔"

احمد کا ماتھا ٹھنکا۔ سارہ نے بھی محسوس کیا کہ یہ شرارت اس موٹے سپاہی کی ہے۔ اس کی آنکھوں میں شرارت تو سارہ نے ہر لمحہ محسوس کی تھی۔ سب لوگ ادھر ادھر تلاش کرتے رہے۔ لیکن نہ تو ذکیہ کا کوئی پتہ چلا اور نہ ہی دونوں اسرائیلی سپاہیوں کا۔

دن کافی چڑھ آیا۔ کسی نے کچھ کھایا نہ پیا۔ ذکیہ کا یوں غائب ہو جانا اور معہ وائرلیس سیٹ کے ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ ابھی تک اسرائیلی کیمپ کی طرف سے بھی مجاہدین نہیں آئے تھے۔

سہ پہر تک انتہائی تذبذب کا عالم رہا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا ہوا ہے اور وہ تینوں کہاں گئے ہیں۔ ریت کے تودے ادھر ادھر اڑ گئے تھے کل تک صحرا کے سینہ پر جو نشانات تھے معدوم ہو چکے تھے۔ ٹیلوں کے اوپر لہریے بن گئے تھے۔ ان کے کنوار پن پہ فطرت خود نازاں تھی۔

فضا میں ہیلی کوپٹر کی آواز سنائی دی۔ سب لوگ چھپ گئے۔ اعرابی نے اپنے آپ کو پیش کیا کہ اگر طیارہ اسرائیل کا ہوا تو وہ اسے تباہ کرنے کو تیار ہے۔ بشرطیکہ اسے رائفل دے دی جائے۔ احمد رائفل دینے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ سارہ درمیان میں آگئی۔ س نے کہا۔

"ہم پہلے ہی غلطی کر چکے ہیں اب مزید غلطی نہیں کریں گے۔"

احمد ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ وہ سارہ کی بات کا کیا جواب دے کہ اعرابی نے خود کہا۔

" ٹھیک ہے رہنے دیں۔ لیکن بہن میں رات سے اسرائیلی سپاہی نہیں رہا بلکہ الفتح کا مجاہد بن گیا ہوں۔ میں نے بڑا سوچا ہے۔ میں راستی پر نہیں تھا۔"

" رمیکا بھی یہی کہہ رہی ہے لیکن ہم دیکھیں گے۔" سارہ ہی نے جواب دیا۔

اتنے میں ہیلی کوپٹر کھجوروں کے پیڑوں پر منڈلانے لگا۔ کھجوروں کے تنے نیچے کی طرف جھکنے لگے۔ فضا میں ہیلی کوپٹر کے پروں کا شور رہ گیا۔ احمد نے مورچہ کے دروازے سے پہچان لیا کہ ہیلی کوپٹر اسرائیلی نہیں۔ وہ باہر نکل آیا تو اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی آ گئے۔ ہیلی کوپٹر میں پائلٹ کے علاوہ ذکیہ اور موٹا اسرائیلی سپاہی بھی تھا۔ ذکیہ چھلانگ لگا کر اتری تو رمیکا نے سارہ سے بھی پہلے دوڑ کر اسے گلے لگا لیا۔

ذکیہ نے بتایا۔

" میں نے طوفان میں کمی محسوس کی تو کھجوروں کے تنوں سے بنی ہوئی پناہ گاہ سے نکلی اور وائرلیس پر میں نے ہائی کمانڈ سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وائرلیس کی ٹوں ٹاں سے یہ دونوں اسرائیلی سپاہی ادھر آ گئے اور ایک نے میری رائفل اٹھا لی۔ انہوں نے مجھے تل ابیب سے ربط پیدا کرنے کو کہا۔ میں نے انہیں بتایا کہ ٹوں ٹاں کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں آ رہی۔ پھر انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔ رائفل ان کے ہاتھ میں تھی میں چل پڑی۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ یہ مجھے کدھر کو لے گئے۔ بہرصورت ہم ٹیلوں کی درمیانی کھائیوں میں چلتے رہے

طوفان کم ہوتا گیا۔ لیکن کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کسی کھائی میں بگولہ سا اُٹھتا اور ہمیں اٹھا کر پھینک دیتا۔ رائفل بردار سپاہی سے بھی ایسا ہی ہوا۔ قدرت نے ایک بگولہ بھیجا۔ وہ اسے اٹھا کر یا دبا کر جانے کہاں لے گیا۔ اس کی بس ایک چیخ ہی سنائی دی۔

طوفان تھم گیا۔ سورج چڑھ آیا۔ ریت تپنے لگی۔ پیاس سے نڈھال ہو کر یہ موٹا کمانڈر بھی گر پڑا۔ میرا خود بھی برا حال تھا۔ اس لمحے مجھے وائرلیس کا خیال آیا۔ اور میں نے عمان سے رابطہ قائم کر کے ہیلی کوپٹر کی درخواست کی۔ ابھی آدھ گھنٹہ ہا بیشتر ہیلی کوپٹر پہنچا ہے اور اس نے ہماری جان بچائی ہے۔ ہم نے رائفل بردار سپاہی کو بہت تلاش کرنے کی کوشش کی مگر وہ کہیں نہ مل سکا۔"

ذکیہ جب یہ باتیں کر رہی تھیں۔ تو موٹا سپاہی منہ لٹکائے کھڑا تھا لیکن ہیلی کوپٹر چلانے والا پائلٹ بڑے سکون سے اپنی نشست پہ بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ احمد کو اس کی شخصیت بڑی پراسرار دکھائی دی۔ وہ ہیلی کوپٹر کے قریب گیا تو اسے پائلٹ کی شخصیت جانی پہچانی دکھائی دی۔ پھر بھی اس کے ذہن نے ساتھ نہ دیا۔ کہ وہ اسے مکمل طور پر شناخت نہ کر سکتا۔

"بیٹھو" پائلٹ نے کہا۔

"ذکیہ نے مجھے بتایا ہے۔ ہمارے چھ مجاہدین ابھی تک اسرائیلی کیمپ سے نہیں لوٹے"

"ہاں وہ ابھی تک نہیں لوٹے۔ لیکن مجھے قطب نما اور نقشہ لے لینے دو"

"وہ میرے پاس ہے۔ تم بیٹھو"

احمد نے سارہ اور ذکیہ کو چند ہدایات دیں اور ہیلی کوپٹر میں بیٹھ گیا۔ ہیلی کوپٹر فضا میں بلند ہوا۔

احمد ابھی تک پائلٹ کو نہیں پہچان سکا تھا۔ لیکن اس کے چہرہ میں کئی ایسی علامات موجود تھیں جو احمد کی جانی پہچانی تھیں۔ آخر اس نے شکست تسلیم کر کے از خود پوچھا۔

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے؟"

"ضرور دیکھا ہوگا"

"مگر میں آپ کو پہچان نہ سکا"

"پہچان تو تم مجھے اس دن بھی نہیں سکے تھے جب شازیہ کے کہنے پر مجھے قتل کرنے آئے تھے"

"اوہ ۔ سلمان غنی"

"ہاں، ہاں۔ لیکن گلے نہ ملنا۔ ہیلی کوپٹر ڈول جائے گا"

وہ دونوں باہم دلچسپی کے امور پر باتیں کرتے رہے۔ نقشہ اور قطب نما کی مدد سے احمد راستہ کی نشان دہی بھی کرتا جاتا۔ بیس منٹ کی پرواز کے بعد انہیں کیمپ کے بچے کھچے آثار نظر آئے۔ وہاں بھی طوفان نے اپنا رنگ دکھایا تھا۔ لیکن جھاڑیوں کی موجودگی کی وجہ سے وہاں ریت کے ٹیلے زیادہ ادھر ادھر نہیں ہوئے تھے۔ مگر کیمپ میں کافی لوگ موجود تھے اور اسرائیلی سپاہی رائفلیں تانے ہیلی کوپٹر کے استقبال کو تیار کھڑے تھے۔

سلمان غنی ہیلی کوپٹر کو اوپر لے گیا۔

احمد نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کیمپ میں کمک پہنچ گئی ہے اور ہمارے جوان پکڑے گئے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ تبھی وہ لوگ واپس نہیں پہنچے تھے۔"

"اب کیا کرنا چاہیئے۔" احمد نے پوچھا۔

"حملہ یا حکمت عملی۔" سلمان غنی نے کہا۔

"حملہ۔"

"تو اٹھاؤ، اسٹین گن۔ وہ پڑی ہے۔ گرینیڈ مجھے دے دو۔ میں اچانک اس قدر نیچے جاؤں گا کہ وہ یوں سمجھیں کہ ہم گر رہے ہیں۔"

"بہت اچھا۔"

"تیار۔" سلمان غنی نے کہا۔

"تیار۔" احمد نے کہا۔ "لیکن ہمارے مجاہدین کا کیا ہوگا؟"

"تو پھر حملہ نہیں حکمت عملی۔"

"وہ لاؤڈ اسپیکر اٹھاؤ۔"

احمد نے لاؤڈ اسپیکر اٹھایا۔ منہ نیچے کر کے کہا۔

"کمانڈر ٹینک فورس، رمیکا اور دیگر سپاہی نخلستان میں محفوظ ہیں۔ ان مجاہدین کو یہیں چھوڑ کر نخلستان کی طرف مارچ کرو۔ یہ کمانڈر زڈل کا حکم ہے جو ہیلی کو پٹر چلا رہے ہیں اور تمہارے استقبال کو نخلستان میں موجود ہوں گے۔"

یہ پیغام دلوانے کے بعد اسرائیلی فوجی افسروں کی ایک ٹوپی اس نے نیچے پھینکی۔ اسرائیلی فوجی حکمران اپنے خفیہ مشن کی تکمیل سے وابستگی کے لئے ٹوپی کا اشارہ ہی دیتے تھے۔

ہیلی کوپٹر نیچا ہو گیا تو سلمان غنی نے ہاتھ ہلایا اور " مارچ آن " کا اشارہ دیا۔ اسرائیلی سپاہی نخلستان کی طرف چلنے لگے۔ ہیلی کوپٹر پہلے ہی نخلستان پہنچ گیا اور تمام لوگوں کو خبردار کر دیا کہ رات کو یہاں اسرائیلی سپاہی پہنچ رہے ہیں ان کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔ ان کو زندہ گرفتار کرنا ہے۔

ایک گھنٹہ بعد نیچی پرواز سے مشرق کی جانب سے چکر کاٹ کر ہیلی کوپٹر اسرائیلی کیمپ جا کر آرام سے اترا۔ کیمپ میں موجود سپاہی کمانڈوز کی وردی دیکھ کر اپنی اپنی رائفلیں پھینک کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ چھ مجاہدین زندہ وسلامت موجود تھے۔ انہوں نے ان کی رسیاں وغیرہ کھولیں اور ہیلی کوپٹر ان کو لے کر نخلستان پہنچ گیا۔

نخلستان سے قیدیوں اور خواتین کو لے کر ہیلی کوپٹر ان کو دریائے اردن کے کنارے ایک سرسبز مقام پہ چھوڑ آیا۔ پھر مقامی باشندوں کو روات کی طرف روانہ کیا۔ شام کا سناٹا ہونے سے پیشتر ہی صحرا خالی ہو گیا۔ احمد کو ساتھ لیکر سلمان غنی دریائے اردن کے کنارے بنائے گئے کیمپ میں لے آیا۔

نخلستان کا مکمل کنٹرول اپنے چھ مجاہدوں کے ہاتھ میں تھا۔

رات آگئی۔

یہ آنے والی بڑی پرسکون رات تھی۔

اس رات کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔
معمول کے خلاف احمد کی آنکھ اس وقت کھلی جب سارہ نے گیلے
گیلے بالوں سے احمد کی پیشانی کو چھو دیا۔

ھیلی کوپٹر کو نخلستان میں پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ ہیلی کوپٹر کو دیکھتے ہی نیچے سے مجاہدین نے "یارب" کا نعرہ لگایا اور ہاتھ ہلائے۔

رات کو نخلستان میں پہنچنے والے اسرائیلی سپاہی اپنے انجام کو آپ ہی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے ذخیرہ کا وہ زہریلا پانی پی لیا تھا جو ان ہی کے ساتھیوں نے زہر آلود کر دیا تھا۔ ان کی نعشیں پانی سے ذرا فاصلے پر پڑی تھیں۔ مجاہدین نے ان کے سامان کو پہلے ہی اکٹھا کر رکھا تھا۔ وہ تعداد میں چودہ تھے۔

سلمان غنی نے مجاہدین کو ہدایات دی اور کہا کہ اب وہ اس نخلستان میں رہیں گے۔ مزید مجاہدین اور انجینئر پہنچ جائیں گے اور تباہ شدہ ٹینکوں کو ریت سے نکال کر ممکن ہوا تو مرمت کی جائے گی۔ باقی سامان بھی وہیں مناسب مقامات پر بھیجیں گے۔

احمد بڑا پریشان تھا کہ صبح ہی صبح سلمان غنی ہیلی کوپٹر لے کر کہاں چلا گیا ہے ــــ وہ کوئی ہدایات بھی دے کر نہیں گیا ــــ مگر ابھی وہ قہوہ کا گلاس

پی کر اپنی بیوی کے ڈھلے ہوئے چہرہ کو دیکھنے ہی لگا تھا کہ فضا میں ہیلی کوپٹر کے اُڑنے کی آواز بلند ہوئی۔ اس نے تیز آنکھوں سے ٹکٹکی باندھ کر سارہ کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی ـــ وہ ہیلی کوپٹر کو اترتے دیکھ کر اس کے قریب جا پہنچا۔ سارہ قہوہ کا کپ تھامے وہیں آگئی۔ اس نے کپ سلمان غنی کو پیش کیا۔

سلمان غنی نے قہوہ کے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"ہمیں اب یہاں سے چلنا ہوگا۔ ہائی کمانڈ نے فی الحال ہمیں عمان پہنچنے کو کہا ہے ـــ الکرامہ پر اسرائیل شدید حملے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ ویسے بھی بعض عرب حکومتیں اب اپنے اختلافات کی بنا پر الفتح کی کارروائیوں کے خلاف ہو رہی ہیں۔"

"خلاف ہو رہی ہیں؟" احمد نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہاں ـــ کیونکہ ہمارے حملوں سے اسرائیل نقصان اٹھا کر عرب ممالک کے بستے ہوئے شہروں کو نشانہ بنا دیتا ہے۔ وہ انتقام لیتا ہے لیکن غلط انداز سے ـــ اب الکرامہ میں موجود ہمارا مرکز وہاں سے تبدیل ہو چکا ہے۔ لیکن ہماری تازہ ترین اطلاعات کے مطابق اسرائیل وہاں حملہ کرنے کے منصوبہ کو آخری شکل دے چکا ہے۔ ہمیں ایک تو عرب حکومتوں کو یہ بتانا ہوگا کہ الفتح کیا ہے اور الفتح کیا چاہتی ہے ـــ؟ ہم "الثورۃ الفلسطینیہ" کا ایک خاص نمبر شائع کر رہے ہیں جو مسلم ممالک کے چندہ کی رقم سے اتنی تعداد میں تقسیم کیا جائے گا کہ عوام الفتح کی حمایت میں جا بجا مظاہرے کر کے حکومتوں پر واضح کریں کہ الفتح ان کے لئے کیا کر رہی ہے اور میرے خیال سے یاسر عرفات نے

اتفاق کیا ہے کہ اس غیر معمولی شمارہ کو احمد اور سارہ مرتب کریں۔ ساتھ ساتھ ماہ عسل بھی منائیں۔

احمد اور سارہ نے نظریں نیچی کر لیں اور زیر لب مسکرائے۔ سلمان غنی نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"چلو سب کو بلاؤ — ہم چلیں۔"

رمیکا، اعرافی، ذکیہ، سارہ اور احمد سب ہیلی کوپٹر میں بیٹھ گئے اور وہ صحرا کے اوپر اڑنے لگا۔ انہیں عمان پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگا۔

جس جگہ وہ جا کر اترے وہاں کوئی جدید قسم کا ہوائی اڈہ نہ تھا۔ بس یوں ہی چند مکانات تھے جن میں سے ایک میں انہیں تھوڑے عرصے کے لئے رکنا تھا تب وہ اندر داخل ہوئے تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ یاسر عرفات وہاں موجود تھے۔ سب نے بڑے احترام سے ان کو سلام کیا۔

یاسر عرفات مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں کرتے رہے۔ انہیں شادی کی مبارک باد دی۔ ان کو مہمات میں کامیابی حاصل کرنے پر خراج عقیدت پیش کیا۔ رمیکا اور اعرافی کو اپنی بے پناہ چمکتی آنکھوں سے دیکھا اور کہا۔

"تم مجھے عرب لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ تمہارا چہرہ دیکھا ہوا ہے۔ کیا نیبلس میں تم ہمارے ایک مجاہد ابوالاسرار کے ساتھ نہیں رہتی تھیں؟"

رمیکا خاموش رہی۔

"جواب دو رمیکا۔ ہمارے سامنے الفتح کے قائد کھڑے ہیں۔" ذکیہ نے کہا۔

رمیکا نے ہاں میں سر ہلایا۔

"مجھے تمہارا نام بھی یاد ہے۔ شاید رافعہ العریشی تھا۔"

رمیکا نے پھر سر ہلایا۔ وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھی۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ سارہ کو بھی رمیکا کے اصل نام کا علم نہیں تھا۔ اسے سکول میں بھی رمیکا کہا جاتا تھا اور یہی نام زیادہ مشہور تھا۔ یاسر عرفات اس کو جانتے تھے اور انہیں سب کچھ یاد تھا۔

یاسر عرفات نے اعرانی سے بھی باتیں کیں اور جب احمد نے انہیں بتایا کہ اعرانی نے ہمارے درمیان رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو یاسر عرفات نے اعرانی کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور احمد سے کہنے لگے۔

"یہ سچ کہتے ہیں، ان کی آنکھوں میں مکاری کا رنگ نہیں ہے۔"

اور پھر اعرانی کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"الفتح آپ کو یاد رکھے گی۔"

ایک مجاہد نے کھانے کی تیاری کی خبر دی۔ سب کے لئے کھانا آ گیا۔ فرش پر بیٹھ کر یاسر عرفات کے ساتھ ہی سب نے کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران احمد نے اپنی مہمات کی تفصیل بتائی۔ رمیکا کے طرز عمل کو بالتفصیل بیان کیا۔

یاسر عرفات آہستہ آہستہ کھانا کھاتے رہے اور ہوں ہاں میں جواب دیتے رہے۔ پھر انہوں نے رمیکا کو مخاطب کیا۔

"رافعہ العریشی ــــ میں تمہارے لاشعور تک پہنچ گیا ہوں۔ ابوالاسرار نے تم سے دھوکہ نہیں کیا۔ تمہارے اردگرد پھیلے ہوئے یہودی کارکنوں نے تمہیں ابوالاسرار سے بدگمان کر دیا۔ وہ زندہ ہے۔ تمہاری محبت کا دم بھرتا

ہے۔ اور وہ اس وقت خاص مہم پر مقبوضہ علاقہ میں ہے۔ لیکن میں آج ہی اس کی واپسی کی امید رکھتا ہوں۔"

بالکل انجان لڑکیوں کی طرح ابوالاسرار کا نام سن کر رمیکا چونک پڑی یاسر عرفات کی طرف دیکھا اور بلک بلک کر رونے لگی۔

"مجھے اس سے ملا دیجئے۔ خدا کے لئے مجھے اس سے ملا دیجئے۔ میں نے اس سے بچھڑ کر بڑے دکھ سہے ہیں۔" پھر وہ ایک دم خاموش ہو گئی، جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ آہستہ آہستہ کہنے لگی۔

"نہیں۔ نہیں۔ اب اس سے ملنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہ اب مجھے قبول نہیں کرے گا۔ میں بڑی بری عورت بن چکی ہوں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ تسلی رکھو۔ ملاقات نے تمہیں اپنا تابع بنائے رکھا ہے۔ ابوالاسرار اگر آج نہ پہنچا تو میں اسے شام پیغام بھیج دوں گا کہ وہ اپنی مہم ترک کر کے بھی کل پہنچے۔ اسے تمہارے ساتھ کئے ہوئے وعدے پورے کرنے ہوں گے۔ اور تم۔ تم اسے اپنا ماضی صاف صاف بتا دو گی۔ الفتح کے رضاکار کی زندگی میں جھوٹ کا دخل نہیں ہے۔"

اعراقی اور رمیکا یاسر عرفات کے پاس رہ گئے۔ جاتے جاتے ذکیہ نے یاسر عرفات کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھا۔ تو یاسر عرفات اس کی بات بھی سمجھ گئے۔

"وہاب کی تلاش جاری ہے۔ مجتبیٰ حامد اس وقت غزہ میں ہے۔ اسے وہاب کی تلاش کے متعلق سخت احکام دیئے گئے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ

وہ ہیں علبد از جلد ملے گا"

ذکیہ کے چہرے پہ مایوسی کی ایک لہر ابھری۔ لیکن جلد ہی ڈوب گئی۔ اس نے کہا۔

"مجھے اپنے قائد کی زبان پر بڑا اعتماد ہے، میں مایوس نہیں ہوں"

ذکیہ کو شام جانے کے احکام ملے۔ تاکہ وہ وہاں خواتین کی تنظیم کے متعلق معلومات حاصل کرے۔

سارہ اور احمد کو طلحہ کے گھر جانے کی اور وہیں عام شہریوں کی طرح رہ کر کام کرنے کی تاکید کی گئی۔ الثورۃ الفلسطینیہ کی ترتیب و تدوین کے لئے صالحہ ناصر کی امداد لینے کی ہدایت بھی کی گئی۔

بہن کے گھر میں احمد کو ہر طرح کا آرام تھا۔ اس کے دونوں لڑکے بے حد ذہین اور شریف تھے۔ ایک سیکنڈری سکول میں اور دوسرا ہائر سیکنڈری میں پڑھتا تھا۔ دونوں کو حالات کا گہرا علم تھا۔ سارہ اور احمد سے گفتگو کرتے وقت وہ بڑے مؤدب ہو جاتے۔ غور سے ان کی باتیں سنتے انھوں نے اپنا البم بھی احمد کو دکھایا۔ جو اسرائیلی جارحیت کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھا۔ عرب سربراہوں کی تصویریں تھیں۔ عرب ممالک کے نقشے تھے اور تاریخی حیثیت کی حامل تصاویر تھیں۔ بیت اللحم پہ اسرائیلی فوجی قبضہ کے بعد عربوں کو پیٹ رہے تھے۔ بیت المقدس میں گنبد صخرا میں اسرائیلی سپاہی اخبار نویسوں کو اپنی نگرانی میں سیر کروا رہے تھے۔ بیت المقدس کے عرب محافظوں کی لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ اردن کے مہاجرین دریائے

اردن کورسوں کی مدد سے پار کر رہے تھے۔ ابو دینا کا پٹرول کا ذخیرہ جل رہا تھا۔ نیپام بموں سے جلے ہوئے مردوں، عورتوں اور بچوں کی تصاویر تھیں۔ غزہ کے گورنر عبدالمنعم حسین سے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کرائے جا رہے تھے۔ القدس کا ہوائی مستقر ایک مورچہ بنا ہوا تھا۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے طیارے اپنے اڈوں پر ہی نشانہ بنے پڑے تھے۔ سوئز کے کناروں پر تیل کے مصری ذخیرے جل رہے تھے۔ غزہ جانے والی سڑک پر اسرائیلی فوجوں کی لمبی قطاریں چل رہی تھیں۔ صحرائے سینا میں ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں ٹوٹی پڑی تھیں۔ اور فوجی سپاہیوں کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ العریش کے قریب مصری گاڑیوں کے ڈھانچوں میں فوجیوں کی نعشیں بکھری پڑی تھیں۔ اسرائیلی فوج اردن کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ اور ناصر سر نیہوڑے آنکھیں بند کئے ہوئے سوچ رہا تھا۔

اس البم میں جنگ جون ۱۹۶۷ء کے دوران شائع ہونے والے کارٹون بھی تھے۔ احمد ابو سارہ نے ان تصاویر میں سے بہت سی تصاویر کو خاص شمارہ کے لئے چنا۔ مجاہدین کے کارناموں کی فہرستیں اور تفاصیل ان تک پہنچتی رہیں۔ انہیں احساس ہوا کہ الفتح کے دامن میں ایک سے ایک بڑھ کر قیمتی موتی ہے ہر سپاہی ایک نگینہ ہے۔ ان کارناموں کی تفصیل مرتب کرنے سے پہلے انہوں نے الفتح کی مختصر تاریخ، اس کے مقاصد، تنظیم اور مالی وسائل کے بارے میں معلومات اکٹھی کیں انہیں خود کئی باتوں کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے ذیل کا مضمون اداریہ کے طور پر تیار کیا۔

الفتح ـــــــ عرب مجاہدین کی تنظیم ایک چراغ مصطفوی ہے جس سے شرار بولہبی پھر ستیزہ کار ہے۔ اس تنظیم کا مقصد فلسطین کے لئے ایک ایسی انقلابی طاقت فراہم کرنا ہے جو ہر محاذ پہ دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔ الفتح کی ساری تگ و دو کا محور یہی نصب العین ہے اس کے لئے وہ ساری قومی طاقت اور وسائل کو مجتمع کر رہی ہے۔

اس تنظیم سے تعلق رکھنے والے مجاہد یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ انہوں نے ایک طویل جد و جہد کے لئے اپنی زندگی وقف کر دی ہے اور ان کا جذبہ سرفروشی، ان کی مستقل مزاجی، ان کی ایثار اور ان کی قربانیاں ہی آخر ایک دن رنگ لاکر رہیں گی۔ اور سارے عالم عرب کے اندر ایک نیا جذبہ اور ایک نئی روح بیدار کرنے کا سبب بن جائیں گی۔

عسکری اعتبار سے الفتح کا اصل مقصد اسرائیل کی اس ریاست کو جڑ سے اکھاڑ دینا ہے۔ جو محض جبر و استبداد کی بنیاد پر قائم کی گئی ہے اور سیاسی نقطہ نظر سے وہ فلسطین کے اندر ایک ایسی جمہوری ریاست قائم کرنا چاہتی ہے جس کے باشندوں کو تمام قانونی حقوق حاصل ہوں۔

۱ الفتح نے ۱۹۵۹ء میں تنظیم کے اصول اساسی کی تشریح کرتے ہوئے اپنے رسالے "ہمارا فلسطین" کی پہلی اشاعت ہی میں بتا دیا تھا کہ وہ فلسطینیوں کو صرف ایک مقصد کے گرد جمع کرنا چاہتی ہے۔ یعنی "فلسطین کی بازیابی اور اس کی مکمل آزادی" اس موقع پر تمام فلسطینی باشندوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ مختلف عرب تنظیموں اور جماعتوں میں شامل ہو کر اپنی قوت کو ضائع نہ کریں۔

مختلف مقاصد اور مختلف سمتوں میں صرف ہونے والی قوت کو مجتمع کر کے صرف اس ایک مقصد کے لئے اسے استعمال کریں۔ ساتھ ہی اس رسالے نے عرب سربراہوں سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ اپنے آپس کے اختلافات میں فلسطین کے باشندوں کو الجھانے کی کوشش نہ کریں۔ کیونکہ ان کی زندگی کا اصل مقصد فلسطین کو آزاد کرانا ہے۔ اور اس اصل نصب العین سے ہٹانے والی تمام سرگرمیاں ان کے لئے موت کا پیغام ثابت ہوں گی۔

الفتح کا اس زمانے میں بھی یہی خیال تھا کہ فلسطین کو ایک مسلح قومی جدوجہد کے بغیر آزاد نہیں کرایا جا سکتا اور اس نے ابتدا ہی میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ وہ اپنے لئے مسلح جدوجہد کا راستہ منتخب کر چکی ہے۔ آج بھی الفتح اسی راستے پر پورے یقین اور قوت کے ساتھ گامزن ہے۔

آج دنیائے عرب میں بے شمار تنظیمیں قائم ہیں اور متعدد تحریکیں چل رہی ہیں جو اپنے نظریات، مقاصد اور طریقۂ کار کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں جن کا ذکر اکثر اخبارات میں ہوتا رہتا ہے۔ لیکن الفتح نظریاتی و تنظیمی اعتبار سے ان میں کسی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ فلسطینی باشندوں سے اس کی یہی اپیل ہے کہ وہ ہر چیز پر آزادی فلسطین کے مقصد کو مقدم رکھیں اور دوسری عرب تحریکوں اور تنظیموں کا جزو بننے سے پرہیز کریں۔ اپنی ساری صلاحیتوں قوتوں اور وسائل کو ایک مقصد کے لئے وقف کر دیں۔

الفتح کو مقبوضہ اسرائیل کے اطراف بسنے والے تمام عرب عوام کی حمایت حاصل ہے۔ وہ ان مجاہدوں کی مقدور بھر امداد و اعانت کرتے رہے ہیں۔ فلسطین کے

بارے میں انہیں اپنی ذمہ داریوں کا پورا پورا احساس رہا ہے۔ جب بھی ضرورت پڑی ہے ان کے ہاتھ اور ان کے قدم مجاہدین کی امداد و اعانت کے لئے آگے ہی بڑھتے رہے ہیں۔ وہ مجاہدوں کی حمایت کو اپنے ایمان کا عین تقاضا سمجھتے ہیں۔ گزشتہ جون کی جنگ نے الفتح کی سرگرمیوں پر ان کے اعتقاد کو اور بھی راسخ کر دیا ہے۔ اور اب ایسے لوگ بھی اس مسلح تحریک کے حامی بن کر کھڑے ہو گئے ہیں جو پہلے کٹر مخالف تھے یا اپنے آپ کو بالکل بے تعلق ظاہر کرتے تھے ان کو اس بات کا پوری طرح احساس ہو چکا تھا کہ اسرائیل کی بنیادوں پر ایک تیز اور موثر قسم کی چھاپہ مار جنگ ہی کے ذریعے ضرب لگائی جا سکتی ہے اور یہ فلسطینی ہی ہیں جو اس جدوجہد کے ہراول ثابت ہو سکتے ہیں، خاص طور پر نوجوان عرب جن میں عورتیں اور مرد دونوں ہی شامل ہیں بڑی تیزی سے کثیر تعداد میں اس کی صفوں کے اندر شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ الفتح کی اس ہر دلعزیزی سے دشمن سخت فکرمند ہے۔ بڑی طاقتوں کی پشت پناہی اپنی چال بازی اور مکاری سے اس نے کھلے میدان میں تو فتح پالی تھی لیکن اس چھاپہ مار جنگ میں سر سے کفن باندھے ہوئے مجاہدین اور جذبہ شہادت سے سرشار ہو کر آگے بڑھنے والے سرفروشوں کے ساتھ مقابلے میں اسے اپنی ہزیمت صاف نظر آ رہی ہے۔

اسرائیل جان بوجھ کر اس بات کا پروپیگنڈہ کرتا رہتا ہے کہ الفتح کے مراکز اور اس کے عسکری اڈے عرب ممالک کے اندر واقع ہیں۔ وہ محض مکاری کی بنا پر یہ پروپیگنڈہ کرتا ہے تاکہ اپنے ان جارحانہ حملوں کی کوئی توجیہہ

کر سکے جو جنگ بندی کے بعد سے آج تک مسلسل جاری ہیں۔ اسی بات کو بہانہ بنا کر وہ اب تک دریائے اردن کے مغربی ساحل کو اپنے بزدلانہ حملوں کا نشانہ بناتا رہا ہے اور اردن کی بہادر افواج جان پر کھیل کر اس کے جارحانہ اقدام کو پسپا کرتی رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الفتح نے اپنے چھاپہ مار دستے مقبوضہ علاقوں کے اندر ہی قائم کر رکھے ہیں۔ دوسری طرف تنظیم نے ایک ایسی پالیسی کو اپنا رکھا ہے جس کی وجہ سے عرب ممالک کے ساتھ اس کے کسی اختلاف کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ الفتح نے ان ممالک کے داخلی امور اور معاملات میں کبھی دخل دینے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اپنی ساری توجہ آزادیٔ فلسطین کی طرف منعطف کر رکھی ہے۔ جو خود ان عرب ریاستوں اور ان کے عوام کا مقصد ہے۔

الفتح کی اولین خواہش یہ ہے کہ اقوام عالم جتنا بھی جلد ہو سکے اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ دنیا کے اس حصے میں ظلم کا قلع قمع کئے بغیر کبھی امن قائم نہیں ہو سکتا۔ مظلوم فلسطینیوں کے دلوں میں اس ظلم کے خلاف غیظ و غضب کی آگ ایک آتش فشاں کی طرح اندر ہی اندر بھڑکتی رہے گی اور یہ آتش فشاں بار بار پھٹتا رہے گا۔ عدل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ فلسطین ان کے قانونی حقداروں کو واپس لوٹا دیا جائے۔ اور یہودی اس ملک میں رہنا چاہیں تو خوشی کے ساتھ رہیں لیکن ان کی وہی حیثیت ہو گی جو ۱۹۴۸ء کے بعد سے عربوں کو خود اسرائیل نے دے رکھی ہے۔

اسرائیلی اخبارات نے الفتح کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کی ایک

مہم چلا رکھی ہے اور دنیا کے سامنے وہ اس کے چہرے کو مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اسے دہشت پسندوں کی ایک ایسی تنظیم قرار دے رہے ہیں جو یہودیوں کو نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اور فلسطین پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد انہیں ملک سے نکال دینا چاہتی ہے۔ لیکن وہ اپنی ان الزام تراشیوں اور غیر حقیقت پسندانہ رویے سے دنیا کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتے۔ دنیا اس بات کو اچھی طرح سمجھتی ہے کہ فلسطینی اور ان کی قومی تنظیم الفتح صرف اپنے قانونی حق کے لئے جدوجہد کر رہی ہے اور ہر طرف سے مایوس ہو کر جارح اور ظالم اسرائیل کی طاقت کو اپنی مسلح جدوجہد کے دوران اس نے انسانیت اور اخلاق کے دامن کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہے اور نازی ازم کو کبھی اس نے اپنے لئے مثال نہیں بنایا۔ لیکن اس کے برعکس اسرائیلی فوجیں نازیوں کی سی وحشت، دیربریت کا مظاہرہ کرتی رہی ہیں۔

الفتح نے علم جہاد بلند کر رکھا ہے اور اس نے صیہونی سامراج کی اس ریاست کو ختم کر دینے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ اپنے اس مقصد کے لئے وہ مسلح طاقت کو پوری طرح استعمال کرنے کی قائل ہے۔ لیکن اس کا نشانہ براہ راست شہری آبادیاں اور عوام نہیں ہیں، اس کے چھاپہ مار دستے صرف فوجی اہمیت رکھنے والے مقامات پر ضرب لگاتے ہیں اور ان مراکز کو تباہ کرتے ہیں جن کے تباہ کرنے سے دشمن کی اقتصادی حالت کمزور پڑ سکتی ہے۔

الفتح کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ آزادیٔ فلسطین کے لئے کام کرنے والی مسلح و غیر مسلح ساری تنظیمیں متحد اور یک جان ہو کر دشمن کا مقابلہ کریں۔ گزشتہ

جون کی لڑائی نے اس اتحاد کی اہمیت کو اور بھی زیادہ بڑھا دیا اور تمام تنظیمیں یہ محسوس کرنے لگیں کہ ان کا الگ الگ رہ کر کام کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے الفتح نے قاہرہ میں گزشتہ جنوری کے مہینے میں ایک کانفرنس منعقد کی اور فلسطینی مجاہدوں کے تمام بے قاعدہ دستوں کو اس میں شرکت کی دعوت دے دی۔ اس کانفرنس میں آٹھ عسکری تنظیموں نے شرکت کے لئے اپنے نمائندے بھیجے۔ ان نمائندوں نے سر جوڑ کر ان مسائل و معاملات پر غور کیا جو انہیں درپیش تھے۔ بالآخر اپنی کوششوں اور سرگرمیوں کو متحدہ طور پہ جاری رکھنے کے لئے وہ ایک منصوبے پر متفق ہو گئے اب الفتح اس طرح کی ساری تنظیموں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ایک مضبوط اور طاقتور محاذ قائم کرنا چاہتی ہے کیونکہ اس کے خیال میں طاقتور اور مکار دشمن کی فتح کو شکست میں تبدیل کر دینے اور اس کا سر کچلنے کے لئے اتحاد و تنظیم سے زیادہ کوئی ہتھیار موثر نہیں ہو سکتا۔ قاہرہ کی اس کانفرنس میں شریک ہونے والی ان آٹھ جماعتوں نے اپنے تین فوجی دستے تشکیل دیئے اور فدائیان فلسطین کونسل کے نام سے ایک مجلس مشاورت بھی قائم کر دی گئی۔ اس کونسل کا کام تمام بے قاعدہ فوجی دستوں کی سرگرمیوں کے درمیان ہم آہنگی اور ربط پیدا کرنا ہے۔

الفتح کی اس وقت سب سے زیادہ اہم ضرورت روپیہ اور اسلحہ ہیں۔ سرفروشوں کی اس کے پاس کمی نہیں ہے۔ ان کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ نوجوان عورتیں اور مرد مسلسل اس تنظیم میں شریک ہو کر اس کی صفوں کو

زیادہ سے زیادہ مضبوط بناتے جا رہے ہیں۔ عرب چھاپہ ماروں کی ضروریات مختلف وسائل سے پوری ہوتی ہیں۔ اسرائیل کی پشت پناہی پر دنیا کی بڑی بڑی طاقتیں ہیں جو اس کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کر رہی ہیں۔ عرب چھاپہ ماروں کی ضروریات مختلف وسائل سے پوری ہوتی ہیں۔ سب سے بڑا ذریعہ وہ فلسطینی ہیں جو کویت اور سعودی عرب میں کام کر رہے ہیں۔ ۴۰ ہزار فلسطینی مہاجر ان ملکوں میں بڑی بڑی تنخواہیں پا رہے ہیں۔ ہر ملازم اپنی تنخواہ کا ۵ فیصد چندہ دیتا ہے۔ کویت کے شیوخ، سعودی عرب کے شہزادے اور خلیج فارس کی عرب ریاستوں کے حکمران دل کھول کر چندہ دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک فدائی نے "لائف" کے نمائندے کو بتایا کہ حال ہی میں سعودی عرب کے شہزادوں نے تقریباً دس لاکھ ڈالر دیئے ہیں۔ اسی طرح صرف بیروت کے شہزادوں نے اس فنڈ میں پانچ لاکھ ڈالر دیئے۔ ان رقوم سے نہ صرف ہتھیار خریدے جاتے ہیں بلکہ چھاپوں میں جو لوگ شہید ہو جاتے ہیں ان کے کنبوں کی دیکھ بھال بھی ہوتی ہے۔ "فتح" کی سرگرمیوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ فنڈ میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔

ہر روز کوئی نہ کوئی خبر اس نوعیت کی شائع کر دی جاتی ہے کہ فلاں فلاں عرب چھاپہ مار پکڑے گئے اور معمولی سی سختی کرنے پر انہوں نے اپنی تنظیم کے سارے راز اگل دیئے اور اسرائیل کو مجاہدوں کے خفیہ اڈوں کا پتہ چل گیا۔ جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسرائیلی فوج اور پولیس نے عربوں اور فلسطینیوں کی گرفتاریوں کا طویل سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ وہ جس کو بھی چاہتے ہیں پکڑ کر پکڑ لیتے ہیں کہ اس کا تعلق الفتح کے چھاپہ مار دستوں سے ہے اور ... میں اپنے ...

دستم کا نشانہ بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ان سے منسوب کر کے بے سروپا باتیں چھاپنے لگتے ہیں اس طرح وہ ایک طرف الفتح کے مجاہدوں میں بدولی اور ہراس پھیلانا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف وہ دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ مجاہدین کی تربیت و تنظیم تو انتہائی ناکارہ قسم کی ہے، وہ بڑے بزدل اور تھڑوے ہوتے ہیں۔ ذرا سی سختی کرنے پر سارے راز اگل دیتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ الفتح نے جب بھی اسرائیلی اڈوں پر حملہ کیا ہے زیادہ تر دشمن کو ہی نقصان پہنچا ہے اور عرب چھاپہ مار بہت کم ان کے ہاتھ لگے ہیں اور جو لوگ بد قسمتی سے گرفتار ہوئے انہوں نے شدید اذیتوں کے مقابلے میں انتہائی صبر و استقامت سے کام لیا ہے۔ جان پر بن جانے کے باوجود انہوں نے تنظیم کا کوئی راز فاش ہونے نہیں دیا۔ اس کی وجہ الفتح کا اپنا نظام تعلیم و تربیت ہے کسی امیدوار کو تنظیم کا کارکن بنانے سے پہلے اس کے بارے میں اچھی طرح جانچ پڑتال کی جاتی ہے، اس کو خوب ٹھونک بجا کر دیکھا جاتا ہے پھر اسے اس کی اہلیت و صلاحیت کے مطابق سونپا جاتا ہے۔ ان امیدواروں کو ایک عرصے تک نظری اور عملی تربیت دی جاتی ہے۔ اس ابتدائی اور ثانوی تربیتوں کے بعد پھر وہ حقیقی عسکری مہموں میں شرکت کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ ضروری تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنی ملازمتوں اور پیشہ ورانہ کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں لیکن تنظیم سے ان کا ربط برقرار رہتا ہے۔ اور مختصر سی اطلاع پر وہ مرکز پر پہنچنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔

عرب فدائیوں کی جدوجہد اسی طرح پھیلتی رہی تو اندیشہ ہے اس بات کا

کہ اسرائیلی ہر فلسطینی اور ہر عرب کو شک کی نظروں سے دیکھنا شروع کر دے اور بچے کھچے عرب باشندوں کو بھی سرزمین فلسطین سے بے دخل کر دے لیکن اس کی اس حرکت کا فائدہ بھی الفتح کی تحریک آزادی کو پہنچے گا۔ فلسطینیوں اور عربوں کے دلوں میں طلب آزادی کی آگ اور زیادہ بھڑک اٹھے گی۔ ان کی جدوجہد پہلے سے زیادہ تیز ہو جائے گی۔ مکمل فتح کا عزم ان کے اندر اور بھی مستحکم ہو جائے گا۔

الفتح کے رضاکاروں میں ۹۰ فیصد تعداد نوجوان کسان، انجینیروں، ڈاکٹروں اور طالب علموں کی ہے۔ طلبہ کے جوش و خروش کا یہ عالم ہے کہ اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں سے تنظیم میں حصہ لینے کے لئے پہنچ رہے ہیں۔ یہ سب فلسطینی ہیں۔ ان کی غالب اکثریت ان نوجوانوں کی ہے جو کیمپوں میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے۔ ان فلسطینی بھائیوں کی مدد کے لئے بہت سے عرب نوجوان بھی تنظیم میں شامل ہونے کو تیار ہیں۔ لیکن تنظیم اس کے متعلق ابھی سوچ رہی ہے۔

اس اداریہ کو اشاعت سے پہلے ہائی کمانڈ سے منظور کرایا گیا۔

الثورۃ الفلسطینیہ کے شمارہ کو ترتیب دینے میں نہ صرف صحافت کی اعلیٰ اقدار کو مدنظر رکھا گیا بلکہ اسے موثر بنانے کے لئے تصاویر، کارٹون، افسانوں فیچروں اور مقالات سے ایسے مزین کیا گیا کہ ایک طرف تو اسرائیل کی جارحیت سے نفرت کا سیلاب امڈ آیا۔ اور دوسری طرف فلسطینی عربوں کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچا گیا۔ جنگ کی ہولناک تباہیوں، امریکہ، برطانیہ، اور دیگر استعماری طاقتوں کے چہرہ سے نقاب الٹ گیا اور اس کی دوستی کا پردہ چاک ہو گیا۔ مخدوش حالات اور کسمپرسی کے عالم میں الفتح نے جو پروگرام بنائے اور جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا اس کا ذکر تھا۔

الثورۃ الفلسطینیہ کا یہ خاص شمارہ لاکھوں کی تعداد میں چھپا اور مختلف تنظیموں، اداروں، سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں میں تقسیم کیا گیا۔ مشرق وسطیٰ کے عرب ممالک کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی بھیجنے کا اہتمام کیا گیا اور ان ممالک کے اخبارات نے تراجم کر کے عرب اور اسلام دوستی کا پورا

پورا حق ادا کر دیا۔ جلد ہی اس نشر و اشاعت کی مہم کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ مختلف ممالک کی تنظیموں نے چندہ کی صورت میں الفتح کا ساتھ دیا۔ نوجوانوں نے اپنے خون سے لکھی ہوئی درخواستوں کے ذریعہ الفتح کے مجاہد بننے کی پیش کش کی۔

عراق، شام، اردن، لبنان، لیبیا، مصر، الجزائر، سوڈان، یمن اور دیگر ممالک سے نوجوانوں نے اپنی حکومتوں کی مرضی کے خلاف الفتح کے پروگرام میں شامل ہونے کا اعلان کیا۔

ان ممالک میں موجود الفتح کے نمائندوں نے ایسے نوجوانوں کے جذبات کی بڑی تعریف کی۔ ان کے نام رجسٹرات میں لکھ لیے اور انہیں یہی کہا کہ وہ اس وقت تک اپنے بھائیوں کو تکلیف نہیں دیں گے جب تک کہ فلسطینی ماؤں کے جنے ہوئے سرفروش باقی ہیں۔ لیکن اس اخلاقی ہمدردی جس کا اظہار عالم اسلام نے کیا تھا۔ اس سے مجاہدین کو یہ احساس ضرور ہوا کہ وہ اپنی جدوجہد میں اکیلے نہیں ہیں۔ اور وقت پڑنے پر ان کی امداد کو نوجوانانِ عالم اسلام ٹڈی دل کی صورت میں پہنچ جائیں گے۔ فوری طور پر اس کا جو اثر ہوا وہ یہ تھا کہ عرب مجاہدین نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔

طولکرم کے شمال میں ایفان کے پولیس اسٹیشن میں ایک دستی بم گرا اور دھماکہ کے ساتھ ہی عمارت کے پرخچے اڑ گئے۔ وہاں ایک کارڈ پڑا ہوا پایا گیا۔ جس پر لکھا تھا "مسئلہ فلسطین کا واحد حل مسلح جدوجہد ہے۔"

تل ابیب میں وزیر اعظم اشکول اور اسرائیلی وزیر اعظم چیف آف سٹاف

جنرل ابابیان اضحاق کے گھروں میں دھماکے ہوئے۔ درو دیوار کانپ اٹھے اور پھر یہودیوں کے اپنے دلوں کو دھڑکا سا لگا رہنے لگا۔

لیسان کے علاقے میں بیت یوسف کو جانے والی سڑک پر بارودی سرنگ پھٹنے سے ایک جیپ تباہ اور کئی اسرائیلی فوجی ہلاک ہوئے۔ اسی رات وادی عربہ کے شمال میں بسیلون کا بہت بڑا پانی نظام اڑا کے رکھ دیا۔ اسرائیلی فوج کا ایک مسلح دستہ فدائیوں کے ایک گروہ سے الجھ گیا۔ دو گھنٹے کی مڈبھیڑ کے بعد احمد ضریح شہید ہوا۔ اور اسرائیلی زخمیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ جنہیں بعد میں تین ہیلی کوپٹر کے ذریعہ ہسپتال پہنچایا گیا۔

القدس سے پانچ میل دور ایک ریلوے سٹیشن کو تباہ کر دیا۔ ساتھ ہی القدس کی ریلوے لائن کو بیت شمس کے قریب اڑا دیا گیا جس سے آمد و رفت بند ہو گئی۔

اسرائیلی فوج نے ایک صبح بیت خوریک، بیت وحن، عزون اور عقربہ نابلس کی مشرقی بستیوں کو دس ٹینکوں اور چالیس بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ گھیر لیا۔ اسرائیلی ہیلی کوپٹر سروں پر منڈلانے لگے۔ انہیں یہ شک تھا کہ الفتح کے مجاہدین ان بستیوں میں موجود ہیں۔ تلاشی لینے کا کام جاری ہوا۔ مجاہدین بھی حرکت میں آ گئے۔ دشمن نے بھاری توپیں استعمال کیں۔ لیکن مجاہدین ہلکے ہتھیاروں رائفلوں اور دستی بموں سے لڑتے رہے۔ چار فدائی شہید ہوئے لیکن پینتالیس اسرائیلی فوجی نابود ہو گئے۔

لد کے ہوائی اڈے سے ڈیڑھ میل دور تل ابیب کے گرد و نواح میں فوجی دستہ مجاہدین سے بھڑ گیا۔ نتیجہ حسب معمول نکلا۔ مجاہدین کو کسی قسم کی گزند نہ پہنچی۔

ایک رات مجاہدین نے عین عروس کے علاقے میں ایک بجلی گھر تباہ کر کے اسرائیلی معیشت پہ کاری ضرب لگائی۔ ایلات کی بندرگاہ میں جہاں تیل صاف کرنے کے متعدد کارخانوں میں ایک کارخانے کو آگ لگا دی۔ یہ تیل کے کارخانوں پہ اس علاقے میں دوسرا حملہ تھا۔

یہ سرگرمیاں زیادہ شدت پکڑتی گئیں۔ انہی سرگرمیوں کی زد میں آکر موشے دایان زخمی ہوا۔ اور ہسپتال میں پڑا رہا جسے اسرائیلی پریس نے محض اتفاقی حادثہ قرار دیا۔ کہ موشے دایان آثار قدیمہ دیکھنے گئے تھے اور ایک چٹان ان پہ گر پڑی۔ صورت حال یہ تھی کہ وہ دستی بم سے زخمی ہوئے تھے۔

* پے در پے حملوں سے یہودی سرمایہ پرستوں کا امن اور چین تباہ ہو کر رہ گیا۔ کئی پل اور ریلوے لائنیں اڑا دی گئیں۔ بارودی سرنگوں نے اکثر راستے مسدود کر دیئے۔ ہزاروں اسرائیلی فوجی ان چھوٹے چھوٹے حملوں میں کام آئے۔ گاڑیوں ٹینکوں اور ہیلی کوپٹروں کا نقصان الگ رہا۔ اسرائیلی حکومت کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اسرائیل ایک تحریک بغاوت میں گھر گیا ہے۔ اور جس جنگ کا اسے سامنا ہے۔ وہ جون ۱۹۶۷ء سے زیادہ سخت اور صبر آزما ہے۔ یہ سب واقعات جنوری ۶۸ء تک وقوع پذیر ہوئے۔

الفتح کی سرگرمیوں کا ردعمل اسرائیل کی طرف سے یوں ہوا کہ انہوں نے مقبوضہ علاقوں کے عربوں کو روپیہ، خوراک اور زندگی کی دوسری اشیاء دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ جب اس طرح بات نہ بنی تو وہ جبر و تشدد پر اتر آئے۔ وہ الفتح کے مجاہدین کی تلاش کے بہانے گھروں میں گھس جاتے۔ مردوں

کو پکڑ لیتے، عورتوں کی بے عزتی کرتے۔ مکانات اور دوسری املاک کو بارود سے اُڑا دیتے۔ القدس کے قریب دو گاؤں انہوں نے مٹی میں ملا دیئے۔ الخلیل میں ایک پولیس افسر کے قتل کے جرم میں چالیس عربوں کو اذیت ناک سزائیں دی گئیں اور انہیں قیدی بنا لیا گیا۔ نوجوانوں کو فوجی عدالتوں میں پیش کر کے مختلف النوع سزائیں دی گئیں اور انہیں قیدی بنا لیا گیا۔ نوجوانوں کو سزائے موت ایک معمولی سزا ہے۔ غزہ میں بلدیہ کے صدر کے بھائی کو اس الزام میں گرفتار کیا گیا کہ اس نے اسرائیلی فوجیوں پر دستی بم پھینکنے والے مجاہدین کا ساتھ دیا ہے۔

نابلس میں پورے ایک محلہ کو ڈائنامیٹ سے اس لئے اڑا دیا گیا کہ شک تھا وہاں مجاہدین چھپے ہوئے ہوں گے۔ پچاس عرب قیدیوں پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ جاں بحق ہو گئے۔ ایسے ہی وحشیانہ ظلم وستم کا شکار عمر ابو لیلی ہوئے جو مجاہدین میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور اسرائیلیوں نے انہیں ایک جھڑپ کے دوران گرفتار کر لیا تھا۔

اس پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ حکومت کے علاوہ صیہونی تنظیم بھی عرب آبادی کو ظلم وستم کا شکار بنانے لگی۔ یہودی ہجوموں کی صورت میں اکٹھے ہو کر بسوں کو روک لیتے اور عرب مسافروں کو قتل کر ڈالتے۔ عرب باشندوں کے اجتماعات پر بم پھینکتے۔ نماز، جمعہ اور عیدین کی تقاریب پر بھی انہوں نے ایسے مظاہرے کئے۔

یہ سب کچھ اسرائیلی الفتح کی کارروائیوں کے ردعمل کے طور پر کر رہے تھے۔ اب ردعمل در ردعمل شروع ہوا۔ الفتح کی سرگرمیاں اور بڑھ گئیں۔ مجاہدین

کے جذبۂ حریت کا اندازہ اس خط سے کیجیے جو شہید حسن ابوغزالہ نے اپنی والدہ کو شہادت سے چند روز پیشتر لکھا۔

شہید ابوغزالہ متحدہ عرب جمہوریہ کے شبین القم کے صنعتی انسٹی ٹیوٹ میں آخری سال کا طالب علم اور توبان کے علاقہ میں الفتح کا سیاسی نمائندہ تھا۔ اسے اور چند ساتھیوں کو بیسان کے علاقے میں اسرائیلی بستیوں پر حملہ کرنے کا حکم ہوا۔ اس حملہ کے نتیجہ میں دشمن کے کئی کارخانے اور ادارے تباہ ہو گئے اگلے روز اس گروہ نے توبس کے علاقے میں اسرائیل کے گشتی فوجی دستوں پر حملہ کیا۔ اور دشمن کے تیس آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے۔ تیسرے روز دشمن نے اس علاقے میں چھاتہ فوج اتار دی۔ حریت پسندوں کی کل تعداد پندرہ تھی۔ انہوں نے تین دن تک دشمن کا مقابلہ کیا۔ چوتھے روز دشمن چاروں طرف سے ان کی طرف بڑھا۔ حریت پسندوں نے محاصرہ توڑ کر نکل جانے کی کوشش کی۔ ابوغزالہ عقبی دستے میں تھا۔ اس کے ساتھی تو بچ کر نکل گئے۔ مگر اس کی مشین گن کی گولیاں ختم ہو گئیں ۔۔۔ اس کے پاس صرف دو دستی بم رہ گئے تھے۔ دشمن بڑھتے بڑھتے سر پر پہنچ گیا۔ اور ابوغزالہ کے لئے بچ نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہا۔ جوں ہی دشمن قریب پہنچا۔ اس نے برق رفتاری سے دونوں بم پھینک دیئے۔ ہولناک دھماکہ ہوا۔ ابوغزالہ اگرچہ خود شہید ہو گیا۔ لیکن اس نے دشمن کے کئی سپاہی ہلاک کر دیئے۔ اس نے اپنی والدہ کو لکھا تھا۔

پیاری امی ۔۔۔ میں مصر کے کالج میں اپنی مرضی سے نہیں آیا، بلکہ آپ کی

اور پیارے ابا جان کی خاطر آیا..... لیکن حالیہ جنگ نے مجھ پر واضح کر دیا کہ ہمیں جہاد کی راہ اختیار کرنی چاہیئے۔ اس طرح ہم آپ کو اور اپنی قوم کو ابدی مسرت اور خود داری کی زندگی سے ہمکنار کر سکتے ہیں...... میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنے ملک اور اپنی قوم کے لئے سختیاں جھیلوں گا۔ آپ نے میری خاطر جو تکلیفیں برداشت کی ہیں، ان کا صلہ سرفروشی اور جاں نثاری کی صورت میں دوں گا۔ میں بے جان خشک مادہ نہیں۔ انسان ہوں، مجھے اپنے کنبے، اپنے ملک اور اپنی قوم سے گہری محبت ہے۔

"اب وقت آ گیا ہے کہ فلسطین کا ہر فرزند اپنے ملک اور وطن کو آزاد کرانے کے لئے اٹھ کھڑا ہو۔ الجزائر، ویت نام، جنوبی عرب اور بہت سے دوسرے ملکوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔۔۔"

ابو غزالہ کی طرح نہ صرف دوسرے مجاہدین صورت حال کو سمجھتے گئے بلکہ نئے نئے تجربات سے جنگ کے ماہر بنتے گئے۔ وہ حملے سے پہلے بڑی احتیاط سے جزئیات طے کرتے۔ دریائے اردن کو ایسی جگہ سے عبور کیا جاتا جہاں وہ نہ زیادہ گہرا ہے اور نہ چوڑا۔۔۔ دریا کے ساتھ ساتھ اسرائیلی فوج کی دور دور تک پھیلی ہوئی چوکیاں مجاہدوں پر بڑی نظر رکھتیں۔ لیکن مجاہدین کا ایک دستہ جب دریا پار کرتا تو دوسرا کنارے پر دشمن کے حملے کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتا۔ تیسرا دور تک بے مقصد فائرنگ کرتا چلا جاتا۔۔۔ اسرائیلی اس طرف متوجہ ہوتے تو پہلا دستہ اندرون ملک میں گھس کر کم از کم وقت میں اپنا کام سر انجام دیتا۔۔۔ واپسی پر بارودی سرنگیں بچھا دی جاتیں تاکہ دشمن تعاقب نہ کر سکے۔

احمد اور سارہ کو اپنے دوستوں کے کارناموں کی اطلاعات ملتی رہیں اور وہ ایک باقاعدہ قلمی جہاد کے لئے ان کو مرتبہ [illegible] ان میں سے بعض خبریں ایسی بھی ہوتیں جو ان کے لئے دکھ کا باعث ہوتیں۔ لیکن جنگ میں زندگی اور موت تو ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

دو ماہ گزر چکے تھے انہیں ذکیہ کی خبر تو ملتی رہی تھی لیکن اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اعرابی ماضی کے خلاف ایک جانباز مجاہد بن چکا تھا۔ وہ ایک مظلوم سپاہی کی حیثیت سے واپس اسرائیل پہنچا اور بہت سی من گھڑت کہانیاں سنائیں لیکن اب وہ الفتح کے لئے کام کر رہا تھا اور اس کی مہیا کردہ معلومات سے مجاہدین کو خاطر خواہ کامیابیاں بھی ہوئی تھیں۔ اس نے رباب کے متعلق بھی لکھا تھا کہ وہ اسرائیلی فوج کی خفیہ سروس میں قید ہے اور اسے کسی نامعلوم مقام پر نظر بند رکھا گیا ہے۔ تاہم وہ کوشاں ہے کہ اس کا پتہ چلے اور اس کی رہائی کا کوئی سامان ہو سکے۔

یاسر عرفات نے اپنا وعدہ پورا کر دیا تھا۔ ابوالاسرار اسرائیلی علاقہ سے واپس آیا تو اس کا نکاح ربیکا سے کر دیا گیا۔ ربیکا اسے مل کر زار و قطار روئی لیکن اس کے ذہن پہ چھایا ہوا خوف دور نہ ہو سکا تھا۔ پھر بھی وہ کافی سنبھلی ہوئی تھی۔ وہ ابوالاسرار سے کئی مرتبہ کہہ چکی تھی کہ اسے اپنی اس بوڑھی ماں کا فکر ہے جو تل ابیب کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی ہے۔ اسے ضرور اسرائیلی سپاہی تنگ کرتے ہوں گے۔

طلحہ کا گھر ایک ایسا خفیہ مرکز تھا جہاں سے الفتح کے مجاہدین کو ایک طاقتور

ٹرانسمیٹر کے ذریعے پیغامات بھیجے اور سنے جاتے تھے۔ طلحہ یہ خاموش خدمت کئی سالوں سے سرانجام دے رہی تھی اور سوائے چند اراکین کے کسی کو علم نہ تھا۔ فارغ وقت میں طلحہ عینک لگائے گھر کا کام کاج کرتی رہتی۔ بچوں کے تعلیمی کام کی نگرانی کرتی۔ سارہ اور احمد کا اتنا خیال رکھتی جیسے وہ ابھی اس کے لئے بچے ہی ہوں۔ سارہ طلحہ کی اس قدر توجہ سے کبھی کبھی گھبرا جاتی۔ صالحہ ناصر اب بوڑھی ہو چکی تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تنظیم کا کام کر رہی تھی۔ مجتبیٰ حامد گھر آتے تو گھر بھر میں ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ کئی پروگرام بنتے۔ ان پروگراموں میں کھو کر کچھ عرصہ کے لئے غم کے وہ بادل چھٹ جاتے جو تقدیر نے ان پر ہی نہیں سارے عالم عرب پر پھیلا رکھے تھے۔

الکرامہ پر اسرائیل کے مجوزہ حملہ کی جو افواہیں احمد اور سارہ نے سن رکھی تھیں اس کے متعلق واضح اطلاعات آنی شروع ہو گئیں۔ احمد اور سارہ دم بخود طلحہ کے پاس کھڑے تھے جب وہ اپنے نائب کو پیغامات دینے کے لئے کہہ رہی تھیں۔

"نمبر سات۔ پانچ۔ نو۔ دائیں جانب سے ہشیار رہیئے۔"

"صبا کا مرکز خالی کر دو۔"

"الکرامہ سے ملحقہ پہاڑیوں پہ چلے جاؤ۔"

"یاد رکھو۔ ہم نے اس وقت تک جارحیت سے لڑنے کا عہد کیا ہے جب تک اسرائیل کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔"

"جانتے ہو۔ ہم اللہ سے کیا دعا کرتے ہیں۔ اے اللہ ہمیں فلسطین کے لئے شہید ہونے کی ہمت دے تاکہ ہم جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اکٹھے

رہ سکیں۔"

ان پیغامات کے ساتھ یاسر عرفات کے ایما پر طلحہ نے مجاہدین کو ہر مقام پر اسرائیل کے متوقع حملے سے خبردار کر دیا۔

فروری کی ٹھنڈی صبح کو پندرہ ہزار اسرائیلی فوج جس کے پاس سو ٹینک تھے۔ الکرامہ کی سمت روانہ ہوئی۔ ٹھنڈی ریت پر گہری کھائیاں بناتے اسرائیلی دریائے اردن کی طرف بڑھتے رہے۔

وہ کہہ رہے تھے کہ وہ ایک دہشت پسند شخص کو دریائے اردن کے قرب وجوار میں تلاش کرنے جا رہے تھے۔ ایک فرد کی تلاش کے لئے اس فوج اور ٹینکوں کے علاوہ جیٹ طیاروں نے پہلے بمباری کی اور چھاتہ بردار فوج بھی اتاری۔

اسرائیل کی اس جارحیت کا نشانہ اردن کے چار سرحدی شہر تھے۔ بحیرہ مردار کے جنوب میں صافی، فیضا اور داخل پر تو اسرائیل نے بغیر کسی مقابلہ کے قبضہ کر لیا۔ لیکن الکرامہ پر اس کی یہ لشکر کشی اسے مہنگی پڑی۔ اسرائیلی فوج اردن کی سرزمین کے اندر ڈیڑھ میل تک چلی آئی۔

بالآخر اردن کے ٹینکوں نے ان کا راستہ روکا۔ نتیجتاً جنگ چھڑ گئی۔ اسرائیل کی نصف فوج باغات اور فصلوں کو روندتی الکرامہ کی طرف بھاگ نکلی۔ اور الکرامہ میں داخل ہو گئی۔ دو ہزار عرب مجاہدین پہاڑوں پر جا چکے تھے۔ صرف دو سو فدائی شہر کی حفاظت کے لئے باقی تھے۔ انہوں نے اسرائیلی فوج کا گھر گھر میں مقابلہ کیا۔ آخر پسپا ہو کر اسرائیلیوں نے دریائے اردن عبور کر کے جان بچائی۔

پندرہ گھنٹے کی اس تاریخی جنگ میں اسرائیلیوں کو جو زک اٹھانی پڑی اس کا تذکرہ تنظیم کے اخبار نے کم لیکن دنیا بھر کے اخبارات نے بہت زیادہ کیا ہے۔ سو میں سے بیالیس ٹینک تباہ ہوئے۔ تقریباً تین ہزار اسرائیلی سپاہی کھیت رہے۔ اسرائیلی الکرامہ میں ایک سو دس عرب باشندوں کو شہید کرنے اور ایک سو کو قیدی بنا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ یورپی اخبار نویس اس حملہ کے مابعد اثرات دیکھنے کے لئے جوق در جوق الکرامہ پہنچنا شروع ہو گئے۔

ان کی متفقہ رائے ہے کہ جو نقصان اسرائیلی تسلیم کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کا نقصان ہوا ہے۔

الکرامہ کے اس حملہ تک جنگ جون ۱۹۶۷ء کے بعد سے لے کر الفتح ۱۲۸ حملے کر چکی ہے۔ جن میں تقریباً ۱۱۱۱ اسرائیلی ہلاک ہو چکے ہیں۔ دیگر سامان جنگ کے نقصان کا اندازہ بھی اسی نسبت سے کیا جا سکتا ہے۔

اسرائیل کے اس حملہ میں کچھ نقصان الفتح کی بجائے اردن کا ہوا تو شاہ حسین نے کہا۔

"شدت کم ہونے کی بجائے بڑھ گئی ہے۔ نفرت زیادہ ہو گئی ہے۔ اسرائیل کو نہیں بھولنا چاہیئے کہ ہم سب کمانڈوز ہیں"

کئی اخبار نویسوں نے لکھا کہ اس حملہ کے نقصان کے بعد موشے دایان ان کو مایوس نظر آیا۔

الفتح کے ایک مقتدر ممبر نے کہا۔

"اسرائیل کو عمان پر قبضہ کر لینے دو۔ بلکہ دمشق اور قاہرہ پر بھی کیونکہ جتنے عرب ان کے قبضہ میں آئیں گے ان کے لئے جینا اتنا ہی مشکل ہوگا۔"

یہودی سرمایہ کاروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ یورپی اور امریکی پریس الکرامہ پر یہودی جارحیت کی پسپائی سے شرمندہ ہو کر الفتح کے خلاف عرب رہنماؤں کے ناموں سے منسوب بیان چھاپنے لگا۔

اس پروپیگنڈہ کا مقصد دوہرا تھا۔ ایک طرف تو وہ الفتح کے مجاہدین کے ذہنوں میں یہ بٹھانا چاہتے تھے کہ ان کی کارروائیوں کو خود عرب حکومتیں پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھتیں اور دوسرا وہ حکومتوں کو یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ الفتح جیسی کامیاب عسکری نوعیت کی تنظیم عرب سربراہوں کے اپنے وجود کے لئے ایک خطرہ ہے۔ لیکن الفتح عرب سربراہوں یا عرب حکومتوں کے خلاف کارروائیوں کے لئے تشکیل نہیں کی گئی۔ بلکہ اس کا واحد مقصد فلسطین کی آزادی ہے۔ یورپی پریس کے چند آزاد خیال اخبارات نے یہودی پروپیگنڈہ کی تردید میں اداریئے وغیرہ لکھے۔

کرامہ پر اسرائیل کا حملہ ناکارہ رہا۔ عرب چھاپہ ماروں نے اپنے مرکز پر پہنچ کر جشن فتح منایا۔

اسرائیلی کابینہ نے ہنگامی اجلاس بلا کر اپنی ناکامی پر رنج و افسوس کیا۔

الفتح نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ عرب چھاپہ مار تل ابیب میں پہنچ گئے۔ ہولناک دھماکوں سے سارا شہر لرز اٹھا۔ تفریح گاہوں کے نغمے اور ناچ بند ہو گئے۔ کاروں کے پرخچے اڑ گئے۔ بازاروں میں افراتفری

مچ گئی۔

الخلیل دوسرا کرامہ بن گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے مجاہدین سمٹ سمٹا کر یہاں پہنچ گئے ہیں۔ آخر وزیر اعظم اشکول سے نہ رہا گیا۔ اس نے الخلیل کے باشندوں کو دھمکی دی کہ وہ اپنا اسلحہ حکومت کے حوالے کر دیں ورنہ انہیں موت کی سزا دی جائے گی۔

بین الاقوامی یونائٹیڈ پریس کے نامہ نگار نے اپریل میں ایک رپورٹ بھیجی تو اس نے لکھا:

"اس وقت اسرائیل میں خوف و اضطراب کا دور دورہ ہے۔ اسرائیلی تحریک مزاحمت کو کچلنے کے لئے ظلم و ستم سے کام لے رہے ہیں۔ عرب چھاپہ ماروں کو روکنے کے لئے جنگ بندی لائن کے ساتھ ساتھ برقی تار لگا دیئے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود فدائیوں کی سرگرمیوں میں کمی نہیں آئی۔ ہر ہفتے ۱۲۵ اسرائیلی مارے جا رہے ہیں۔ جائداد و مال کا نقصان اس کے علاوہ ہے۔"

وزیر دفاع موشے دایان نے دھمکی دی کہ اگر اسرائیلی مقبوضہ علاقہ پر اردن کی سرزمین سے حملے جاری رہے تو جنگ دریائے اردن کے مغربی کنارے سے مشرقی کنارے پر منتقل ہو جائے گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کرامہ کی جنگ کے بعد آزادی فلسطین کی جدوجہد ایک نئے دور میں داخل ہو گئی ہے۔ فدائی عرب دنیا کے ہیرو بن چکے ہیں۔ ان کی قوت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ الفتح نے عام بھرتی کا اعلان کر دیا ہے۔ نوجوانوں کا ولولہ دیکھ کر مغربی پریس بار بار کہہ رہا ہے کہ فدائی اسرائیل کے لئے بہت بڑا خطرہ

بن چکے ہیں۔ اور ان کا یہ دعویٰ درست معلوم ہونے لگا ہے کہ وہ تین سال کے اندر اندر اسرائیل کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔

یاسر عرفات نے سارہ اور احمد کو الفتح کے نشر و اشاعت کے شعبہ سے مستقل طور پر وابستہ کر دیا۔ اور انہوں نے بیرون شہر ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اپنا گھر بنالیا۔ یہ گھر خفیہ دفتر کا کام بھی دیتا۔

عام خبروں کے ساتھ احمد کو ایک روز یہ خبر ملی کہ دریائے اردن کے مغربی کنارے سے ایک ایسا زخمی ملا ہے جس کے ہونٹ اور آنکھیں سلی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پیچھے کی طرف بندھے ہوئے تھے اور اس کے پاؤں کے انگوٹھوں سے بجلی کے ننگے تار بندھے ہوئے تھے۔ مجاہدین نے دریا کے دوسرے کنارے دو اسرائیلیوں کو اسے پھینکتے دیکھا اور پھر انہیں اس میں زندگی کا احساس بھی ہوا۔ چنانچہ بڑی مشکلوں سے وہ اسے دریا کے مشرقی کنارے پر لے آئے ہیں۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ اس کے کھلے کرتہ کی پشت پر عبرانی میں "غدار کی یہی سزا ہے" لکھا ہوا ہے۔

"یہ غدار کون ہو سکتا ہے؟ اسرائیل کے لئے تو ہر وہ شخص غدار ہے جو عربوں سے ہمدردی رکھتا ہے۔ الفتح کے تمام ہمدردوں کو اسرائیل غدار ہی سمجھتے ہیں۔" احمد نے سوچا۔

سارہ نے جب یہ خبر پڑھی تو اس نے کہا۔

"یہ وہ سزائیں ہیں جو اسرائیلیوں کو ان کے آبا سے ورثہ میں ملی ہیں۔"

"لیکن یہ کوئی غیر معمولی مجاہد ہے جس کے ساتھ اسرائیلیوں نے ایسا سلوک کیا ہے؟"

"ہمیں طلحہ باجی کو بتانا چاہیئے تاکہ اسے الفتح کے ہسپتال میں منتقل کرایا جا سکے۔"

"ہاں یہ بہت ضروری ہے۔ کیمپ میں تو اسے پوری طبی امداد ملنا مشکل ہے۔" احمد نے سارہ کی تجویز سے اتفاق کیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ طلحہ کے پاس پہنچ گئے۔ علیک سلیک کے بعد انہوں نے اس غیر معمولی خبر کے متعلق بتایا تو طلحہ نے اسی لمحہ کیمپ کے خفیہ نمبر سے رابطہ قائم کرنے کے بعد ان کو ہدایت کی وہ اسے الفتح کے مرکزی ہسپتال منتقل کریں۔ کیمپ والوں نے بتایا کہ باوجود ٹانکے کھولنے کے اسے ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔

اچانک مجتبٰی حامد گھر آ گئے۔ انہوں نے عینک اتارتے ہوئے سارہ سے کہا۔

"کیا حال ہے؟"

"خوب ہے، آپ کی دعائیں ہیں۔"

"کوئی خاص بلیٹن۔"

"ہاں، خاص ہے۔ اسی وجہ سے آنا پڑا۔"

پھر سارہ نے ساری خبر سنائی۔ طلحہ اتنے میں ان کے لئے قہوہ لے آئی۔

قہوہ پیتے پیتے مجتبیٰ حامد نے طلحہ سے کہا۔
"تم ذرا پھر کیمپ شیخ سعد سے رابطہ قائم کرو اور ان سے کہو کر بے ہوش آدمی کے کانوں کو ذرا غور سے دیکھیں اور اگر ان کے اندر سفید سفید گولیاں نظر آئیں تو ان کو نکال دیں وہ ہوش میں آجائے گا۔ پھر اس کو مناسب خوراک دیں وہ وہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ مرکزی ہسپتال ہر وقت خطرہ میں ہے اس لئے وہاں کسی بھی مریض کو منتقل کرنا مناسب نہیں۔ اگر ہسپتال منتقل کرنا ہی ہو تو الصلت بھیج دیں۔"

طلحہ بغیر کسی مزید گفتگو کے اٹھ کر اوپر چلی گئی تاکہ وہ اپنے شوہر کی ہدایت پر عمل کر سکے۔ وہ زندگی بھر ہی مجتبیٰ حامد کے احکام کی یوں ہی تعمیل کرتی چلی آئی تھی۔ اس نے کبھی اپنے خاوند سے دلیل بازی نہیں کی۔ وہ اسے شوہر سے زیادہ اپنا رہنما بھی سمجھتی تھی۔ احمد اور سارہ پوچھے بغیر نہ رہ سکے کہ کانوں میں گولیاں ڈالنے کی یہ بات آپ نے کیا کہی ہے؟"

"حیفہ کے ایک ڈاکٹر نے ایسی گولیاں ایجاد کی ہیں جنہیں اگر کانوں میں ڈال دیا جائے تو دماغ ماؤف ہو جاتا ہے۔ اور اگر ان کو بہتر گھنٹے کانوں میں ہی رہنے دیا جائے تو انسان اپنی یادداشت کھو دیتا ہے۔ ان گولیوں میں ایسے الیکٹرون استعمال کئے گئے ہیں کہ وہ منتشر ہو کر دماغ کی لکیروں کو بدل دیتے ہیں۔ یہودی ذہن صاف کرنے کے لئے ان گولیوں سے کام لے رہے ہیں۔"

احمد اور سارہ یہ سنکر حیران رہ گئے۔ انہوں نے آئندہ بلیٹن میں الفتح کے مجاہدین کو اس عہد بد قسم کی سزا سے خبردار کرنے کے لئے بھی ایک خبر تیار کی

تاکہ اگر بے ہوش مجاہدین ملیں تو فوراً ان کے کانوں کو صاف کیا جا سکے۔

اتنے میں طلحہ نہ صرف پیغام دے کر بلکہ جواب لے کر آ گئی کہ مجاہد کے کانوں میں واقعی گولیاں تھیں اور انہیں نکال دیا گیا ہے لیکن وہ ابھی تک بے ہوش ہے اور اسے الصلت کے شفا خانہ میں منتقل کیا جا رہا ہے۔ جہاں الجزائری رضا کار ڈاکٹر اس کا طبی معائنہ کریں گے۔

بہن کے گھر سے واپس آ کر احمد اور سارہ ریبکا سے ملنے کے لئے اس کے گھر گئے۔ ریبکا اور ابوالاسرار دونوں گھر پہ تھے۔ ریبکا اب کافی سنبھلی ہوئی تھی۔ اس کی تمام تر یادیں لوٹ آئی تھیں اور جبر و تشدد کے جن مراحل سے گزر کر وہ ایک صیہونی کارکن بن چکی تھی۔ ان کے بتدریج ارتقاء کی جملہ واردات اس کے ذہن میں ابھر رہی تھیں۔

وہ یروشلم میں گزارے ہوئے ایام کو یاد کرتی تھی اور پھر اس کی یادوں میں وہ تلخ ایام ابھر آتے جن کے دوران آہستہ آہستہ میٹھے زہر کی طرح اسرائیلی پروپیگنڈے نے اس پہ غلبہ پا لیا۔ وہ کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ وہ خود بڑی حیران تھی کہ وہ گھناؤنے گھناؤنے افعال کیسے سرانجام دیتی رہی تھی۔

ابوالاسرار اسے نابلس میں ملا تھا۔ اور اسے بے حد چاہنے لگی تھی۔ لیکن اس کے اچانک گم ہو جانے سے ٹھہرے ہوئے جذبات کا رخ جو بدلا تو یہودیوں کے ہاتھ لگ گئی۔ انہوں نے اس کی ابوالاسرار سے وابستگی کے افسانے ایسے ایسے رنگ میں تراشے اور ایک ایسا بھیانک پہلو اس کے سامنے پیش کیا کہ محبت کی انتہا نفرت کے جذبہ میں بدل گئی۔ اسی نفرت میں شدید

محبت کا ردعمل تھا۔

ایک ابوالاسرار کیا وہ ابوالاسرار قسم کے جملہ مجاہدین سے انتقام لینے پر اتر آئی اور جب احمد نے اسرائیلی کیمپ سے اسے گرفتار کیا اس وقت وہ اس ریمکا کی ضد تھی جو ابوالاسرار سے محبت کرتی تھی اور یروشلم کے سکول میں پڑھنے کے بعد تل ابیب کے قریب واقع قصبہ میں آگئی تھی۔ جہاں صرف اس کی ماں تھی اور باپ الفتح سے ہمدردی رکھنے کے الزام میں لاپتہ کر دیا گیا تھا۔ باپ کے یوں کھو جانے سے بھی صیہونی کارپردازلڑکیوں نے اس کی ہمدردیاں حاصل کی تھیں۔ اسے یہ سب کچھ یاد تھا اور وہ ان جملہ واقعات کو ایک کتابی صورت میں مرتب کر رہی تھی۔

رسمی بات چیت کے بعد سارہ اور احمد کو اس نے اپنی یادداشتوں کا مسودہ دکھایا۔ سرورق پر اس نے اپنا اصل نام رافعہ العریشی لکھ رکھا تھا۔

ابوالاسرار ایک لمبا تڑنگا جوان تھا۔ اسے لمبے چوڑے فلسفہ وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ لکھنے پڑھنے کی باتوں سے بھی اسے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ اسے صرف الفتح کا بنیادی سبق یاد تھا کہ اسرائیل سے ہم نے کسی بھی قیمت پر اپنا پیارا فلسطین واپس لینا ہے اور مختلف ممالک میں پڑے ہوئے عرب مہاجرین کو واپس ان کے آبائی گھروں میں آباد کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کی قیمت جان ہے اور وہ اللہ کی امانت ہے۔ اسے آج بالکل لوٹانا ہے۔

احمد اور سارہ سے گفتگو کے دوران اس نے انہی خیالات کا اظہار کیا۔ ریمکا کی انہوں نے بڑی ہمت بندھائی کہ وہ اپنی یادداشتوں کو محفوظ کرے

مناسب کانٹ چھانٹ کے بعد اسے صیہونیت کے رخ سے پردہ الٹنے کے لئے شائع کیا جائے گا۔

جب وہ دونوں گھر پہنچے تو اعرانی کو اپنے گھر کے بیرونی صحن میں موجود پا کر بے حد حیران ہوئے۔ اعرانی انہیں بڑے تپاک سے ملا۔ وہ اسے اپنے گھر کے اندر لے آئے۔ پھل وغیرہ سے اس کی تواضع کی۔ اعرانی خاموش تھا۔ سارہ اس سے باتیں کئے جا رہی تھی۔ مختلف مہموں کے متعلق — اسرائیل کی پریشانیوں کے متعلق — اور پھر خود اعرانی کے متعلق — سارہ نے اسے "الفتح" کا سچا کارکن پایا۔ اور کہا۔

"اعرانی بھائی — تم الفتح کے لئے کتنا کام کر رہے ہو — تمہارے جذبۂ حریت کی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ میں ایک بات کہوں — تم برا تو نہیں مانو گے"؟

"کیوں برا مانوں گا۔ کوئی بہن کی بات کا برا مان سکتا ہے"؟

"تو تم مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے"؟

اعرانی کے چہرہ پر اس جملہ سے مختلف النوع تاثرات ابھرے۔ سر نیچا کر کے اس نے چند منٹ سوچا اور پھر کہا۔

"بہن — تمہیں شاہ حبشہ نجاشی کا" واقعہ یاد ہے نا جب اس نے عرب مہاجرین کے قائد جعفرؓ سے حضرت رسول مقبول صلعم کے متعلق سوالات کئے تھے اور جواب سن کر ان کے نبی آخر الزماںؐ ہونے کی تصدیق کی تھی لیکن جب اسے اسلام لانے کی دعوت دی گئی تھی تو اس نے مجبوریوں کی بنا پر

انکار کر دیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے لیکن اس کی مجبوریاں امور سلطنت سے متعلق تھیں اور وہ تاج و تخت کو خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔"

"ٹھیک ہے، میری مجبوری مختلف ہے ـــــ میں نے ابھی تک مذاہب کا تقابلی مطالعہ نہیں کیا۔ میں نے اپنا مذہب انسانیت تجویز کر رکھا ہے اور میں یہی دیکھوں گا کہ کون سا مذہب زیادہ سے زیادہ انسانیت نواز ہے ۔ وہی میرا مذہب ہو گا۔"

"تو پھر یقیناً تم اسلام کی آغوش میں ہی پناہ لو گے۔"

"یہ تو وقت آنے پر دیکھا جائے گا اور میں اب اس کی طرف جلد ہی توجہ دوں گا۔" اعرافی نے بڑے وثوق سے کہا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور احمد کسی سے باتیں کرنے لگا۔ جب وہ ٹیلیفون بند کر کے واپس آیا تو سارہ نے سوالیہ نگاہوں سے احمد کی طرف دیکھا۔

"بھائی جان تھے۔"

"کیا کہتے تھے؟"

"ایک جگہ چھاپہ مارنا ہے۔ چند اچھے اچھے نوجوانوں کے نام پوچھتے تھے۔ قیادت کے لئے انہوں نے ابوالاسرار کا نام تجویز کیا ہے۔"

"پھر؟"

"ابھی سوچ کر انہیں ٹیلیفون کروں گا۔ اعرافی صاحب سے تو بات چیت ہی نہیں ہو سکی۔"

اعرابی دھیرے سے مسکرایا اور اس نے کہا۔

"باجی آپ کو یاد ہوگا کہ آپ کے ساتھ صحرا میں ایک اور لڑکی بھی تھی۔"

"یاد ہوگا کیا بات ہوئی۔ ذکیہ کو تو میں کسی لمحہ بھی نہیں بھول سکتی۔"

"وہ آج کل کہاں ہے؟"

"وہ شام میں تھی۔ وہاں اس نے خواتین کی تنظیموں کا جائزہ لیا ہے۔ اس کا خط مجھے کل ہی ملا تھا۔"

"کیا لکھا ہے اس نے۔ مجھے تو تم نے بتایا ہی نہیں۔" احمد نے پوچھا۔

"اتفاق کی بات ہے کہ میں بتا نہیں سکی۔ اسے تو شمارہ میں شامل کرنا ہے۔" سارہ نے جواب دیا اور میز پر پڑے ہوئے اپنے ہینڈ بیگ سے خط نکال کر احمد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اس خط کے ساتھ ہی صدر انجمن خواتین شام کی صدر مس سعد عبداللہ دنیا بھر کی بہنوں کے نام پیغام بھی ہے۔ اور میرے خیال میں ذکیہ کے مشاہدات کی بجائے اس کو شائع کرنا زیادہ ضروری ہے۔"

"دیکھتے ہیں۔" احمد نے خط لیتے ہوئے کہا۔

"باقی آپ نے کہا تھا وہ شام میں تھی۔ اب کہاں ہے؟"

"اب اسرائیل میں ہے۔ حیفہ میں ــــ وہ وہاب کی تلاش میں وہاں پہنچ چکی ہے۔"

"میں نے یاسر عرفات اور مجیبے حامد کے کہنے پر وہاب کی بڑی تلاش کی اور مجھے اس کا سراغ بھی مل گیا تھا۔ ہمارا یہ اندازہ کہ وہ غزہ میں تھا غلط نکلا۔"

"کہاں ہے وہ ؟" سارہ نے اشتیاق سے پوچھا۔
احمد بھی خط چھوڑ کر اعرابی کی طرف متوجہ ہوا۔

"وہ اسرائیلیوں کی خفیہ اطلاعات کی سروس میں تھا اور وہاں سے وہ اسرائیلی افواج کی نقل و حرکت کی خبریں بحیرہ روم کے کنارے واقع ایک مرکز کو دیتا تھا۔ میں خود اسی مرکز میں تھا۔ وہاں صرف ایک رضاکار جانتا تھا کہ خفیہ اطلاعات کی سروس کے ڈائریکٹر کا ذاتی اسسٹنٹ دراصل الفتح کا رضاکار وہاب ہے۔ الخلیل پر حملہ کے منصوبہ کے متعلق وہ جو ڈاک مرکز میں بھیج رہا تھا وہ خدا جانے کس طرح پکڑی گئی۔ اسے شک کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔ ضروری اطلاعات بروقت نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے الخلیل پر اسرائیلی حملہ ہو گیا۔ اگر وہ گرفتار نہ ہوتا تو الخلیل پر اسرائیلیوں کو زیادہ زک اٹھانی پڑتی۔ آہستہ آہستہ فوجی افسروں کا شک یقین میں بدل گیا اور اسے انہوں نے خاص سزا کا مستوجب قرار دیکر اللید بھیج دیا۔ مجھے ایک سپاہی نے بتایا کہ وہاب کی لاش کو اردن میں کسی شہر کے اندر پھینکا جائے گا۔ تاکہ دوسرے عرب سپاہی عبرت پکڑیں۔"

"وہ خاص سزا کیا ہوتی ہے ؟"

"اسے اسرائیلی غدار کی سزا کہتے ہیں۔ ناک، منہ اور آنکھیں سی دیتے ہیں اور کانوں میں بے ہوش کرنے کی دوا ڈال کر ہوائی جہاز سے گرا دیتے ہیں۔ اس کی موت کا سنکر آپ کی سہیلی کو بہت دکھ ہو گا۔ لیکن ہمیں اپنے مراکز کو مطلع کر دینا چاہیئے کہ اگر کوئی اسرائیلی ہیلی کوپٹر اردن کی سرزمین میں داخل ہو تو اسے نیچے اتارنے کی کوشش کی جائے۔"

"یہ تو ناممکن ہے۔ وہ سرحد کے اندر داخل ہوتے ہی اپنی کارروائی کر جائے گا۔" احمد نے کہا۔

"مگر ان کا منصوبہ اسے کسی شہر میں پھینکنے کا تھا"

"یہ منصوبہ کب بنایا گیا تھا؟" سارہ نے پوچھا۔

"کل ہی کی بات ہے۔ مجھے یہاں پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگی۔ مجھے خود اسرائیلی فوج سرحد تک چھوڑ گئی تھی۔ مجھے اسرائیلی جاسوس ہونے کا شرف جو حاصل ہے۔"

اعرافی مسکرا دیا۔ اسرائیلی فوج اسے ابھی تک اپنا کارکن سمجھتی ہے۔"

"تو پھر ــــ تو پھر" سارہ نے احمد کی طرف دیکھ کر پریشانی کے عالم میں کہا۔ "کہیں وہ مریض ــــ وہ مجاہد جو ہمیں اسرائیل کے علاقہ سے ہی ملا ہے ــــ دہاب ہی تو نہیں۔"

"ہاں ہو سکتا ہے۔" احمد نے کہا اور جلدی جلدی ٹیلیفون پر طلحہ سے بات کرنے کے لئے اٹھ گیا۔ اس نے طلحہ کو کہا۔

"بھائی جان کو کہہ کر کیمپ میں خاص ہدایات بھیجی جائیں۔ بہت ممکن تھا کہ اسرائیلی کسی وجہ سے اسے ہیلی کوپٹر سے ہمارے علاقہ میں نہ گرا سکے ہوں اور کسی نیک دل یا الفتح سے ہمدردی رکھنے والے سپاہی کے مشورہ سے اسے دوسرے کنارہ پر چھوڑ گئے ہوں۔"

ٹیلیفون سے فارغ ہو کر احمد نے اعرافی کو بتایا کہ کس طرح ان کو ایک ایسا ہی مجاہد ملا ہے جیسے خاص سزا دی گئی ہے۔ ہمارا شک ہے کہ وہ دہاب ہی ہو گا۔

"آج ملا ہے؟" اعرافی نے پوچھا۔
"ہاں آج صبح ہی" احمد نے بتایا۔
"تو پھر ممکن ہے وہی ہو۔ کیونکہ ایسی سزائیں بہت کم لوگوں کو دی جاتی ہیں۔"

سارہ کو تو جیسے یقین سا ہو گیا کہ وہ وہاب ہی ہے۔ وہاب جو ذکیہ کا شوہر تھا اور جس نے بڑے ارمانوں سے ذکیہ جیسی ذہین اور مجاہدہ لڑکی سے شادی کی تھی۔ فرعونوں کی وادی میں رہنے والا وہاب مفتی اعظم کا بڑا معتقد تھا اور دشمن کے خلاف مسلح اقدامات کا حامی۔

جنوری ۶۵ء کے بعد فلسطین کی تحریک آزادی نے العاصفہ کے نام سے اپنا عسکری خاکہ مرتب کیا تو وہاب نے اس کی پر زور حمایت کی۔ دوستوں سے مل کر عربوں کے دلوں سے یہ خیال مٹانے کی کوشش کی کہ عرب گوریلا طرز جنگ میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس نے تاریخی حوالوں سے ثابت کیا کہ دو ہزار سال قبل بھی جب عربوں پر روم و نارمن کی حکومتیں مسلط کی گئی تھیں تو ایسے ہی طرز جنگ سے عربوں نے ان کو اتنا تنگ کیا کہ انہیں اپنے علاقوں میں عرب ریاستیں قائم کرنی پڑیں۔ فارس نے عراق میں بنو لخم اور روم نے جنوبی شام میں قبیلہ غسان کی حکومت قائم کی۔ اسی طریق سے ایرانی تاجدار خسرو پرویز کو شکست دی — طرابلس میں اطالوی حکومت کا اسی طریق سے خاتمہ کیا۔ اور آج ہی کے دور میں الجزائر نے فرانس جیسی حکومت کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

وہاب اپنے مقصد میں کامیاب ہوا۔

الفتح کی چھاپہ مار تنظیمیں مختلف ہیں۔ ان کے ذمہ مختلف کام ہیں۔ ان مختلف تنظیموں یعنی فلسطین کی محاذ آزادی، نوجوانان فلسطین کی انقلابی تنظیم، انقلابیوں کا ادارہ عالیہ، العاصفہ، الصاعقہ اور خالد بن ولید۔

وہاب نے ان میں سے اپنے جوہر دکھانے کے لئے العاصفہ جیسی عسکری شاخ کو منتخب کیا۔ اس کے علاوہ خواتین تنظیم کے مختلف شعبوں میں کام کر رہی ہیں۔ میڈیکل سروس، اسرائیل کے خلاف پروپیگنڈہ اور میدان کارزار ــــ اور ذکیہ نے اپنے لئے میدان کارزار کو منتخب کیا تھا۔

تعجب کی بات ہے کہ زیادہ سے زیادہ خواتین مردوں کے دوش بدوش میدان کارزار کو ترجیح دے رہی ہیں۔ ان خواتین میں فاطمہ برناوی کا نام بڑا مشہور ہے۔ اسے اسرائیلی ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے جرم میں اسرائیلی سپاہ نے گرفتار کر لیا اور اس پر جو مظالم ڈھائے وہ الجزائر کی مجاہدہ جمیلہ بوپاشا سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔ لیکن اس نے العاصفہ کے چھپے ہوئے مجاہدین کا پتہ اسرائیلی فوج کو نہیں بتایا۔

ذکیہ ایسی خاتون کے ایثار سے بڑی متاثر تھی۔ اس کے اپنے گاؤں کی ایک معمر خاتون طیبۃ الفخرہ کا واقعہ اسے کبھی نہیں بھولا تھا۔ اسرائیلی فوجی سپاہی ایک عرب مجاہد کا تعاقب کر رہے تھے۔ وہ بھاگتا ہوا گاؤں کی ایک گلی میں داخل ہوا۔ طیبہ نے دروازہ کھولا اور اسے اندر چھپا لیا۔ جب اسرائیلی سپاہ وہاں پہنچے تو اس نے اپنے لخت جگر کو اس کی جگہ گرفتار کرا دیا۔ بیٹے نے بھی کمال سعادت مندی سے اقبال جرم کر لیا۔

ذکیہ نے طیبہ کے گھر میں داخل ہو کر مجاہد کو بنظر غائر دیکھا اور اسے کہا۔

"تم نے بزدلی دکھائی ہے"

"ٹھیک ہے۔ لیکن میری بزدلی کا سبب یہ معمر خاتون ہے۔ اسی نے مجھے ان کا مقابلہ نہیں کرنے دیا۔ میرے ذہن پر ایک بھاری پتھر رکھ دیا ہے۔ لیکن اے بیسویں صدی کی خنساء میں تیرے بیٹے کو شہید نہیں ہونے دوں گا"

اسی شام نہ صرف طیبہ کا لڑکا اس مجاہد نے رہا کرا لیا۔ بلکہ چھ یہودی ہلاک اور ان کا کیمپ ڈائنامیٹ سے تباہ کر دیا۔ ایثار پسند عرب ماں کے فرمانبردار بیٹے کو جب وہ واپس لے کر آیا تو ذکیہ اب بھی اس کے گھر موجود تھی۔

یہ پناہ لینے والا مجاہد اور بھرپور حملہ سے کامیابی حاصل کرنے والا مجاہد وہاب تھا۔

وہاب ذکیہ کا شوہر ــــ جو خاص سزا کی وجہ سے بے ہوش پڑا تھا۔

ذکیہ وہاب کی بیوی ــــ اپنے خاوند کی تلاش میں شام سے اسرائیل پہنچ چکی تھی۔

سارہ نے احمد سے کہا۔

"اعرابی ہمارے ہاں ٹھہرتے ہیں۔ ہم کیمپ میں چلیں۔ میں وہاب کو پہچان سکوں گی۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ وہاب ہے۔ آپ ہیلی کوپٹر کا انتظام کریں ــــ طلحہ باجی کو کہیں یا سر عرفات سے رابطہ قائم کریں۔ اگر وہاب کو کچھ ہو گیا تو ذکیہ جیتے جی مر جائے گی" سارہ پریشان ہو گئی۔

"ہاں، ہاں ۔ میرا بھی یہی خیال ہے ۔ میں سب کچھ کرتا ہوں۔ تم اپنے حواس درست رکھو ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چلو ہم خود طلحہ باجی کے ہاں چلتے ہیں۔"

اعرابی کو اپنے گھر پہ چھوڑ کر دونوں میاں بیوی طلحہ کے ہاں چلے گئے۔

اعرابی کے سامنے شام کی انجمن خواتین کی صدر مس سعدیہ عبداللہ کا پیغام پڑا تھا۔ وہ کرسی پہ بیٹھا اسے پڑھنے لگا۔

پیغام کے ابتدائی حصہ میں مس سعدیہ نے سامراجی ہتھکنڈوں اور اسرائیلی منصوبوں کا ذکر تفصیل سے کیا تھا۔ عرب ممالک کی اندرونی سیاست میں جس طرح چپکے چپکے سے سامراجیوں نے دخل حاصل کر لیا تھا اس کا ذکر تھا۔ عرب تیل پر غاصبانہ قبضہ جاری رکھنے کے لئے حکومتوں کے خلاف سامراجی سازشوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ ان واقعات کا جائزہ لیا گیا تھا جن کی روشنی میں یہ ثابت کرنا مشکل نہیں کہ اسرائیلی افواج کے دوش بدوش امریکہ اور برطانیہ کی افواج عربوں کے خلاف لڑیں اور پھر کس طرح نیپام بموں سے شہری آبادیوں کو نشانہ بنایا۔

دمشق میں پناہ گزینوں کے مراکز کو دشمن کی بدترین جارحیت اور سفاکی کا آئینہ دار ثابت کرنے کے بعد ذیل کی اپیل پر پیغام کو ختم کیا تھا۔

ہماری عالمی خواتین انجمنوں میں شریک بہنو!

ہم شامی خواتین جنہوں نے حالیہ جنگ میں اپنی بہادر فوجوں کے دوش بدوش اسرائیلی جارحیت کا مقابلہ کیا ہے اور جو تہیہ کر چکی ہیں کہ عرب موقف

کے حصول میں اپنی تمام تر ذمہ داریوں کو خندہ پیشانی سے قبول کریں گی۔ اب آپ سے لاکھوں عرب بہنوں، ماؤں اور بچیوں کے نام پر درخواست کرتی ہیں کہ آپ اس جارحیت کے خلاف آواز بلند کریں۔ ہم آپ کو اس عورت ذات کا واسطہ دیتی ہیں جو ہمیشہ سے انسانی حقوق اور ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ باطل کے خلاف ہر زمانہ میں نبرد آزما ہونے کی جس کی اپنی تاریخ ہے اور جو اس بات کی صلاحیت رکھتی ہے کہ دنیا کی رائے عامہ کو ہموار کر سکے۔

ساری دنیا کی خواتین!

ہم آپ سے اپیل کرتی ہیں کہ آپ اس سازش کے خلاف آواز بلند کریں جو سامراجیوں اور صیہونیوں نے عرب سرزمین پر پھیلا رکھی ہے۔ ہم یہ اپیل اس یقین کے ساتھ کر رہی ہیں کہ ساری دنیا کی انصاف پسند قوتیں اور روشن خیال اور ایمان دار خواتین ہمارے ساتھ ہیں اور وہ ہمارے ان مطالبات کا کھل کر ساتھ دیں گی جو حسب ذیل حقائق پر مبنی ہیں۔

عرب سرزمین پر اسرائیلیوں کے مکارانہ حملوں کی مذمت کی جائے اسرائیل کے مجرمانہ افعال کو قابل ملامت تصور کیا جائے جن کی وجہ سے لاکھوں پر امن خاندانوں کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا ہے۔ اس مسئلہ میں ہم کسی بھی ایسے حل کو قابل قبول نہ سمجھیں گے جس کا دائرۂ عمل محض ان لاکھوں عرب مہاجرین کو خوراک پہنچانے اور ان کے سر چھپانے کے عارضی انتظام تک محدود ہو اور نہ ہی ہم اس سلسلے میں ان سامراجیوں کی مداخلت برداشت

کریں گے جو دراصل ہم پر آفتیں اور تباہیاں لانے کے ذمہ دار ہیں۔

اعرابی کو یہ اپیل تشنہ سی محسوس ہوئی ــــ اس میں وہ جان نہیں تھی جو شامی خواتین کے حملوں میں تھی۔

یہ اپیل مصلحت کوشی پر محمول کی جاسکتی تھی۔ اس سے وہ عزم اور وہ ولولہ نہیں ٹپکتا تھا جو الفتح جیسی تحریک کی جان ہے۔ پھر دوسرے ہی لمحہ اس نے سوچا۔

"مگر یہ شامی خواتین میں سے ایک خاتون کے خیالات ہو سکتے ہیں۔ پھر اگر سب کے بھی ہوں ــــ حکومت کے بھی ہوں، تو کیا ہے، فلسطین تو ہمارا ــــ ہم عربوں کا وطن ہے ــــ اس کی آزادی ضروری ہے ــــ کیا ہوا جو میں عیسائی گھرانے میں پیدا ہوا ــــ فلسطین میرا بھی تو گھر ہے۔ الفتح اسی کے لئے لڑ رہی ہے ــــ میں الفتح کا ایک سپاہی رہوں گا۔ اور اگر خدانخواستہ وہاب کو کچھ ہو گیا تو میں العاصفہ نامی شاخ میں شامل ہو کر وہاب کی جگہ کام کروں گا۔ صیہونیت تو اسلام ہی نہیں دنیا کے جملہ مذاہب کے لئے ایک زبردست خطرہ ہے۔ میں اس خطرہ کو ٹالنے کے لئے سب کچھ کروں گا۔"

وہ کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

پھر اسے ذکیہ کا خیال آیا اور اس نے صدق دل سے وہاب کی زندگی کے لئے دعا کی۔

خدا سے دعا کرتے وقت اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرہ کو ڈھانپ

لیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔

جب اس نے چہرہ سے ہاتھ اٹھایا تو اس کے سامنے ایک چھوٹا سا دس برس کی عمر کا بچہ کھڑا تھا اور غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

بچے نے پوچھا۔

"باجی سارہ گھر پر ہیں؟"

اعرانی نے نفی میں سر ہلایا تو بچہ اسے حیران نظروں سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔

سارہ نے وہاب کو پہلی ہی نظر میں پہچان لیا۔ وہ واقعی وہاب تھا۔ اس کے ہونٹوں، آنکھوں اور سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ لباس کو ابھی ابھی تبدیل کیا گیا تھا لیکن وہ بے ہوش تھا۔ ابھی تک کیمپ کا ڈاکٹر اسے ہوش میں نہیں لا سکا تھا۔ تاہم ڈاکٹر نے اسے یقین دلایا تھا کہ نبض اور خون کے دباؤ سے خطرہ کی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی۔

الفتح کا یہ کیمپ وادیٔ اردن کے ان پہاڑوں کے قریب تھا جو دریائے اردن کے مشرقی کنارے پر شمالاً جنوباً پھیلتی چلی گئی ہیں۔ اس کیمپ میں کوئی ایک صد کے قریب فدائی موجود تھے۔ کیمپ اس قدر محفوظ تھا کہ اسرائیلی جہاز اس کے اوپر اڑتے ہوئے گھبراتے تھے۔ چٹانوں کی اوٹ میں ایسے مورچے تھے کہ ایک مجاہد کئی سو اسرائیلیوں کا راستہ روک سکتا تھا۔ مجال نہیں تھی کہ وہاں کوئی چڑیا بھی پھٹک سکے۔ اسرائیلی ہیلی کوپٹروں نے تو کبھی ادھر کا رخ بھی نہیں کیا تھا۔

سارہ ہیلی کوپٹر میں بیٹھے ہوئے نیچے گہری گہری کھڈوں کو دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔ لیکن مسکراتا ہوا العاصفہ کا پائلٹ کہہ رہا تھا۔

"خطرہ کی کوئی بات نہیں، میں ایک ایک چٹان کو پہچانتا ہوں۔ یہ تو دن ہے اگر رات بھی ہو تو میں انشاءاللہ آپ کو کیمپ تک لے جا سکتا ہوں۔" واقعی اس نے سچ کہا تھا۔ اکثر اوقات تو تنگ کھائیوں کے درمیان پرواز کرنا پڑی تھی کیونکہ اس مقام پر دور تک اسرائیلی فوج ناجائز طور پر اردنی علاقہ پر قبضہ کئے بیٹھی تھی۔ اور ان کی شیطنت کا خیال رکھنا ازبس ضروری تھا۔

وہاب کو ہیلی کوپٹر میں نیم درازی کی حالت میں لٹا دیا گیا۔ اور ہیلی کوپٹر ایک بار پھر واپس عمان کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن احمد نے عمان کی بجائے السلت کو ترجیح دی۔ وہاں وہ اسے اپنے ایک خاص دوست کی تحویل میں دے سکتا تھا اور ایک آدھ مرتبہ پہلے بھی السلت جا چکا تھا۔ لیکن سارہ کو ابھی وہاں جانے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ شہر سے باہر ہیلی کوپٹر کو اتارا گیا اور احمد قریب کے پٹرول پمپ پر ٹیلیفون کرنے کے لئے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہاں ایک نیلے رنگ کی بس نما گاڑی آتی دکھائی دی۔ احمد نے گاڑی کا بار بار بجتا ہوا ہارن سنکر ہاتھ دیا۔ بس ان کے قریب آکر رک گئی۔

ڈرائیور اتر کر بڑی گرم جوشی سے ملا۔ سارہ کو دیکھ کر اس نے کہا۔

"آہا، تو یہ ہیں ہماری بھابی"

سارہ جھینپ گئی۔

"ہاں یہی ہیں" احمد نے جواب دیا۔ اور پھر سارہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نے ذوالقرنین کو نہیں پہچانا"

سارہ کی آنکھوں میں نہیں کا تاثر تھا ــــ آنکھوں میں دیکھ کر ہی احمد نے کہہ دیا۔

"ہاں تم جان بھی نہیں سکتیں۔ یہ میرے ساتھ اس حملہ میں شریک تھا جب میں پہلی دفعہ اسرائیل کی سرزمین میں داخل ہوا تھا۔ اور واپسی پہ پہلی دفعہ یروشلم کا سفر کیا تھا اور تمہارے ہاں جا کر ٹھہرا تھا ــــ یہ یاسر عرفات کا دایاں ہاتھ ہے"

"الفتح کا ہر سپاہی یاسر عرفات کا دایاں ہاتھ ہے" ذوالقرنین نے وضاحت کی ــــ

اس رسمی گفتگو کے بعد وہاب کو گاڑی میں سوار کرایا گیا اور وہاں سے فارغ ہو کر احمد اور سارہ ہیلی کوپٹر کے ذریعہ عمان پہنچ گئے۔ جس وقت وہ اپنے گھر پہنچے شام ہو چکی تھی۔ اعرابی ایک کرسی پہ بیٹھے اور دوسری پہ پاؤں رکھے اونگھ رہا تھا۔ آہٹ پا کر اس نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جب وہ اپنی آنکھیں بار بار جھپک رہا تھا تو احمد اور سارہ زیر لب مسکرا رہے تھے۔ آخر سارہ نے کہا۔

"آج اعرابی بھائی کے ساتھ خوب سلوک کیا"

"میری کوئی بات نہیں آپ اس کی سنایئے" اعرابی نے جواب دیا۔

"وہ واقعی وہاب تھا۔ اسرائیلی پروگرام کے مطابق اسے ٹھکانے نہیں لگا سکے۔" احمد نے جواب دیا۔ اور سارہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کچھ کھانے پینے کا انتظام کرو۔ آج تو سارہ دن ایسے ہی گزر گیا ہے۔"

"آپ نے بھی کچھ کھایا پیا۔" سارہ نے اعرابی سے پوچھا۔

"ہاں آپ کے نعمت خانہ سے مجھے شہد اور نان مل گیا تھا۔"

"چلو اچھا ہوا۔ میں نے دو ایک مرتبہ سوچا بھی تھا کہ میں اعرابی بھائی کے کھانے کے لئے کوئی انتظام کر کے نہیں آئی۔" سارہ اتنا کہہ کر باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔

احمد نے تفصیل سے اپنے دن بھر کے سفر کی روداد اعرابی کو سنائی۔ اس نے وہاب کی حالت کے متعلق بھی بتایا کہ کیمپ کا ڈاکٹر بڑا پرامید ہے اور میں اسے اپنے ایک دیرینہ دوست کے حوالے کر آیا ہوں۔ جو الصلت میں الفتح کا سیاسی نمائندہ ہے۔ وہ ہمیں صبح و شام اس کی حالت کے متعلق اطلاع دے گا۔ لیکن ذکیہ نے شام سے اسرائیل جا کر ہمیں اور پریشان کر دیا ہے۔"

"جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ وہاب اللید سے بچ نکلا ہے۔ وہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔"

"تمہیں اللید کے متعلق کچھ معلوم ہے؟"

"کیوں نہیں ــــ یہ وہ کیمپ ہے جہاں ارجنٹائن سے اغوا کرنے کے بعد ایشمین کو رکھا گیا تھا۔ اور دردناک سزائیں دے کر اسے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

"مجھے اس کیمپ کے متعلق تفصیل سے بتاؤ۔"

"آپ نے نازی کیمپوں کے متعلق تو سن ہی رکھا ہے۔ جہاں ہٹلر نے یہودیوں کو ان کے انجام تک پہنچایا تھا۔"

"ہاں — ہاں — میں نے ایسے بہت سے کیمپوں کے متعلق پڑھا ہے۔ لیکن اعرابی ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ ہٹلر نے یہودیوں کو یوں کیوں دبایا تھا۔" احمد نے ایک سوال کر دیا۔

"یہ تو بڑی عام فہم بات ہے — سارہ بہن نے اس کے متعلق پہلے بھی ایک مرتبہ بات کی تھی۔ یہودی سرمایہ کار جرمنی کے اندر سامراجیوں سے ساز باز کر رہے تھے — روس اور امریکہ کے ایک ہونے کا اور ان کی باگ ڈور یہودیوں کے ہاتھ ہونے کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے دوسری عالمگیر جنگ میں جرمنی کے خلاف متحدہ محاذ قائم کیا تھا۔ لیکن فاتح قوم جو چاہے کرتی رہتی ہے — اس میں پروپیگنڈہ زیادہ ہے حقیقت کم — کہ ہٹلر نے اتنے لاکھ یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔"

"ہاں یہ تو میں سمجھتا ہوں کہ پروپیگنڈہ زیادہ ہے اور حقیقت کم — انہوں نے ہٹلر کو ایسے رنگ میں پیش کیا ہے کہ خود جرمن قوم اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔" احمد نے کہا۔

"وہ اس بات میں کامیاب نہیں ہو سکے۔" اعرابی نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا — "اب دنیا میں حقیقت کی نظر سے حالات کو جانچنے کا زیادہ رجحان پیدا ہو چکا ہے۔"

"خیر یہ الگ بحث ہے ۔ ہم موضوع سے ہٹ جائیں گے۔ مجھے اللید کے متعلق بتاؤ" احمد نے کہا۔

"ہاں! تو کیمپ کی حالت نازی کیمپوں سے ملتی جلتی ہے۔ لیکن سزائیں دینے کا انداز زیادہ ترقی پسندانہ ہے"۔

قید خانہ "اللید" کی دیواروں پر بجلی کے تاروں کا جال بچھا دیا گیا ہے۔ اور جگہ جگہ برج کھڑے کر دیئے گئے ہیں، جہاں سے کیمپ کی حالت کا جائزہ لیا جاتا رہتا ہے۔ ان برجوں پر اسرائیلی سپاہی طرح طرح کے ہتھیاروں سے لیس ہو کر موجود رہتے ہیں۔ ان کو یہ ڈر ہے کہ فدائی کسی وقت بھی اس کیمپ پر اچانک حملہ کر دیں گے اور اپنے نظر بند بھائیوں کو رہا کرا کے لے جائیں گے۔ انہیں یہ بھی ڈر ہے کہ فدائی کسی وقت بھی اس کیمپ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسرائیل کو یہ یقین ہے کہ فدائی اسرائیل کی مقبوضہ سرزمین کے چپہ چپہ پر انہیں زبردست نقصان پہنچا سکتے ہیں اور اسی لئے وہ ہر قیمت پر فدائیوں کی کمر توڑ دینا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تشدد کے استعمال سے فدائیوں سے ان کے خفیہ راز معلوم کریں۔ لیکن فدائی ان کی پیش نہیں جانے دیتے۔ وہ ان پر اور ظلم کرتے ہیں ۔

قیدیوں کے جسم سے عملاً ان کا خون چوس لیا جاتا ہے۔ جن قیدیوں کو اس بدسلوکی کا نشانہ بنایا جاتا ہے انہیں یہ لوگ پہلے الگ بند کمروں میں لے جاتے ہیں اور ان کے ذہن پر یہ خیال طاری کر دیتے ہیں کہ ان کا باہر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور اب وہ اپنے ستانے والوں کے رحم و کرم پر

ہیں. خوف و دہشت کے اس عالم میں بھوک اور چوٹوں کی تکلیف دے کر اسرائیلی اپنی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کرتے ہیں. خون چوسنا، انگلیوں کے ناخن الگ کر دینا، کوڑے لگانا اور بجلی کے جھٹکوں سے نشانہ بنانا قیدیوں کے لئے معمولات بن چکے ہیں۔ اپنے اس قومی فریضہ کو پورا کرنے کے لئے اسرائیلی جدید سائنسی طریقے استعمال کر کے دماغ کی دھلائی کا کام انجام دیتے ہیں۔ اسرائیل نے اپنی اس ظالمانہ حرکت کو چار مرحلوں پر تقسیم کر رکھا ہے۔

۱۔ قیدیوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور ان میں سے اسرائیلی اپنا وہ شکار چن لیتے ہیں جن سے وہ کوئی راز اگلوانا چاہتے ہیں۔

۲۔ جن قیدیوں کو جدا کر دیا جاتا ہے انہیں اپنے گروہ کے باقی ماندہ لوگوں سے ملنے نہیں دیا جاتا۔

۳۔ تیسرے مرحلے میں قیدیوں کی اعصابی حالت کو بگاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مثلاً انہیں سونے نہیں دیا جاتا۔ انہیں ایسی آوازیں سنانے کا اہتمام کیا جاتا ہے جن میں ان کے مظلوم اور ستم رسیدہ بھائیوں کی آہیں اور کراہیں ہوتی ہیں۔ تنہائی کے عالم میں لاؤڈ سپیکر کے ذریعے فدائیوں کو یہ آوازیں سنانے کے بعد انہیں سزا کے کمروں میں بھیج دیا جاتا ہے اور کچھ دیر وہاں رکھ کر واپس دوسرے کمروں میں لے جایا جاتا ہے۔

۴۔ اسرائیلی اپنے قیدیوں کو اعصابی سزاؤں کے بعد افہام و تفہیم کے مرحلے سے گزارتے ہیں اس موقع پر سیاست تاریخ اور نفسیات کے پروفیسر کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں جو اسرائیلی حکام اور فوجی عملے کے ساتھ

مجاہد قیدیوں کو سمجھاتے ہیں۔ سب کی گفتگو کا محور صرف یہ ہوتا ہے کہ آخر ان کو اپنی جان جوکھوں میں ڈالنے کا کیا فائدہ وہ کس لیئے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔؟

• نفسیات کے ماہر فلسطینی مجاہدوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ " الفتح " دراصل فلسطین کی وفادار نہیں بلکہ مایوس اور آوارہ گرد افراد کی ایک انجمن ہے۔

• اس کے سیاستداں یہ سمجھاتے ہیں کہ مسلح جدوجہد سے مسئلہ فلسطین کو نقصان پہنچے گا اور وہ دنیا والوں کی ہمدردیاں کھو دیں گے۔

• اسی کے ساتھ تاریخ داں اپنے دلائل لے کر آموجود ہوتے ہیں۔ اور فلپائن، ملائی، کانگو اور دوسرے مقامات کی ناکام بغاوتوں اور تحریکات آزادی کا حوالہ دے کر یہ باور کراتے ہیں کہ اسی طرح حریت فلسطینی کی تحریک بھی ناکام ہو کر رہے گی۔

• دماغ کی دھلائی کا یہ کام ابھی ختم نہیں ہو جاتا، ابھی اس میں فوجیوں اور خفیہ پولیس کے کارکنوں کا کردار باقی ہے۔ اسرائیلی فوجی آکر فدائیوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ فلسطین، ویت نام اور الجیریا میں فرق ہے۔ فلسطین میں جنگل یا پہاڑ نہیں ہیں۔ یہاں اسرائیلیوں کی تعداد تم سے ہے۔ اور ہماری قوت عربوں کی مشترکہ فوجوں سے کہیں زیادہ ہے۔ اس لئے تمہیں بھاگنے کی بھی کوئی جگہ نہیں ہے۔ پھر ہم ٹیکنالوجی، تہذیب اور تمدن کے میدانوں میں تم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ ان سب باتوں کے بعد آخری مرحلے میں اسرائیل کی

خفیہ پولیس اس شکار کو اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ وہ کہتے ہیں ہمیں تمہارے تمام لیڈروں کا علم ہے۔ ہم ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھتے ہیں اور ہم جب چاہیں ان سب پر فتح پا سکتے ہیں۔ اس لیے ... یہ یاد نہ کرو تم نوجوان ہو فدائیوں کا ساتھ چھوڑ دو۔ اپنے گھروں میں واپس چلے جاؤ۔ یونیورسٹی میں داخلہ لے لو اور اطمینان کی زندگی بسر کرو اور جب وہاب جیسا قوم پرست ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے اور اس پر کسی قسم کی تبلیغ اثر نہیں کرتی تو وہ اسے اپنے راستہ کا پتھر سمجھ کر خاص سزا دے کر عبرت کا سامان بناتے ہیں۔

احمد ہمہ تن گوش سن رہا تھا۔ اتنے میں سارہ نے آکر کھانے کی اطلاع دی اور وہ اٹھ کر ایک اور کمرہ میں چلے گئے۔ سارہ نے کھانا لگا دیا تو احمد نے اعراقی کو ایک غیر ملکی اخبار نویس کے مضمون کے متعلق بتایا۔

اس نے لکھا تھا۔

"فدائیوں" کے کارناموں نے عرب باشندوں میں انسانی عظمت کا چراغ روشن کر دیا ہے۔ اور ان کی انقلابی روح بیدار ہو گئی ہے۔ اسرائیل چاہتا ہے کہ ان کیمپوں میں جو قیدی اس کے ہاتھ لگ گئے ہیں انہیں اس روح سے محروم کر دے لیکن وہ اس کوشش میں ناکام رہے ہیں جس کی کئی وجوہات ہیں۔

۵ رجون ۱۹۶۷ء کے بعد اسرائیلیوں میں یہ احساس اجاگر ہونے لگا ہے اور یہ پریشانی پھیلنا شروع ہو گئی ہے کہ ان کا مستقبل تاریک ہے۔ ان کے بہت سے لوگ مایوس ہو ہو کر اپنے قدیم ملکوں میں واپس جانے لگے ہیں اور بہت سے لوگ فدائیوں سے لرزہ براندام ہیں۔ حکومت خود مایوسی

کا شکار ہے۔

اعرافی نے احمد کی بات کاٹتے ہوئے بتایا کہ اس نے اللید کے قیدی سے جو سزاؤں کے مختلف مراحل سے گذر چکا تھا یہ سوال کیا گیا کہ اگر تمہیں آزاد کر دیا جائے تو کیا تم اپنے رشتہ داروں سے واپس جاؤ گے ؛ اس نے کہا یقیناً میں جیل سے نکل کر اپنے کنبے میں جاؤں گا اور اپنے چھوٹے بھائیوں کو کہوں گا کہ وہ ہتھیار اٹھا کر میرے ساتھ چلیں تا کہ ہم سب اپنی اس مقدس سرزمین کو دشمن کے قبضہ سے نکال سکیں۔

"یہ ہے بھی ٹھیک " سارہ نے کہا " جوں جوں وقت گزر رہا ہے۔ توں توں اسرائیلیوں کی چیرہ دستیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ اور ہم اسرائیل سے بے پناہ نفرت کرنے لگے ہیں "

دروازہ پہ دستک ہوئی۔

سارہ یہ کہتے ہوئے فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ " عبدی آیا ہے "

سارہ کی آمد تک احمد نے سوالیہ انداز میں اٹھی ہوئی اعرافی کی نگاہوں کو جھکا دیا تھا۔ اس نے بتایا کہ الکرامہ میں شہید ہونے والوں میں عبدی اور امتہ الحبیب کے ماں باپ اور بہن بھائی تھے ـــــ سارہ سے ان کی ملاقاتیں اس محلہ میں آنے کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن ننھا عبدی جب تک سارہ کو نہ مل لے چین نہیں لیتا۔

"ہاں ـــ ہاں " اعرافی نے کہا " دوپہر بھی ایک لڑکا آیا اور مجھے سارہ باجی کا پوچھ کر بھاگ گیا تھا۔

"وہی ہوگا۔ اس کے سوا ہمارے ہاں اور کسی کا آنا جانا بھی نہیں،" احمد نے بتایا۔

اتنے میں سارہ عبدی کو اپنی انگلی تھمائے لے آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی بہن بھی تھی۔ اعراف نے غور سے پہلے لڑکے کو اور پھر امتہ الحبیب کو دیکھا۔ عبدی کے چہرہ پر ایک خوبصورت سی مسکراہٹ تھی۔ اس کے رخسار گلابی ہو رہے تھے اور اٹھتے ہوئے قدموں کا انداز فاتحانہ تھا۔ اس کے مقابلہ میں امتہ الحبیب ایک اجنبی کو دیکھ کر شرما رہی تھی۔ اس کی بھاری بھاری پلکوں تلے بڑی بڑی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ سر پر بندھے ہو ئے رومال سے بالوں کی سیاہ لٹیں، گورے ماتھے پر جھوم رہی تھیں اور ڈھیلے ڈھالے عربی لباس میں اس کا مستور جسم اس کی بھرپور جوانی کی غمازی کر رہا تھا۔ سارہ نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا تو اس نے مدھم اور سریلی آواز میں جواب دیا۔

"میں ادھر دوسرے کمرہ میں بیٹھتی ہوں۔ یہ اپنی اداسی دور کر لے۔"

اس نے عبدی کی طرف نظروں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

امتہ الحبیب چلی گئی۔ عبدی کو سارہ نے کھانے کی دعوت دی۔ وہ کھا کم رہا تھا۔ سارہ کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ زیادہ رہا تھا۔ باری باری سب اس سے باتیں کر رہے تھے۔ وہ اپنی ذہانت اور عمر کے مطابق ان کی باتوں کا جواب دیتا جاتا۔ جلد ہی وہ سب کھانے سے فارغ ہو گئے اور اسی کمرہ میں آ گئے جہاں امتہ الحبیب بیٹھی تھی اور ایک رسالہ کی ورق گردانی کر رہی تھی اور ساتھ ہی ریڈیو عرب سے خبریں سن رہی تھی۔ جوں ہی سارہ کمرہ

میں داخل ہوئی وہ کھڑی ہو گئی۔ پھر سب کی موجودگی میں وہ نظریں چرائے بیٹھی رہی سارہ نے محسوس کیا کہ امتہ الحبیب کی پریشانی کا سبب اعرافی کی موجودگی ہے۔

"دیکھو حبیبہ — یہ ہمارے ساتھی ہیں — پہلے یہ اسرائیل فوج کے ملازم تھے لیکن اب الفتح کے جانباز بن گئے ہیں" سارہ نے اعرافی کا تعارف حبیبہ سے کراتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے باجی" امتہ الحبیب نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوب — کیا آپ اسرائیلیوں سے لڑنے جائیں گے" عبدی بول اٹھا۔

"ہاں کیوں نہیں۔" اعرافی نے عبدی کو جواب دیا۔

"مجھے بھی ساتھ لے چلیں — میں رائفل چلا سکتا ہوں" عبدی نے ملتجی نگاہوں سے اعرافی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی آپ کو ہم پر اعتماد نہیں۔ ہم نے جو کہا ہے کہ تم ابتدائی سکول کی تعلیم مکمل کر لو پھر ہم لے چلیں گے۔ اب تم اعرافی سے دوستانہ گانٹھ رہے ہو" احمد نے اعرافی کی بجائے عبدی کو جواب دیا۔

عبدی نے چند ماہ پیشتر ہی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو گولیوں کا نشانہ بنتے دیکھا تھا۔ اس کے ذہن میں جب اس واقعہ کی یاد تازہ ہوتی تو وہ بے چین ہو اٹھتا۔ شروع شروع میں تو اس کے ذہن پر بڑا بوجھ تھا۔ اسی بوجھ کے درد سے بلبلا کر وہ ایک دن گلی میں شور مچاتا روتا ہوا بھاگ نکلا تھا۔ اور اس کے پیچھے امتہ الحبیب دوڑ رہی تھی۔ سارہ کے گھر کے قریب آکر وہ رک گیا۔

سارہ باہر نکلی اور تب اس نے ایسی محبت اور شفقت سے عبدی کے سر پہ ہاتھ پھیرا کہ اس کے ذہن سے بوجھ اترنے لگا۔ سارہ نے نہ صرف عبدی کا دکھ ہی بانٹ لیا تھا بلکہ امۃ الحبیب کے ذہن سے بھی کئی بوجھ اتار دیے تھے۔

مجتبیٰ حامد کی مدد سے الفتح ان کو گزر اوقات اور تعلیم کے لئے وظیفہ دے رہی تھی اور اخلاقی طور پر ہر ممکن مدد سارہ اپنے طور پر بھی کر رہی تھی۔

جب امۃ الحبیب جانے لگی تو عبدی کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھتے ہوئے اعرافی نے غور سے امۃ الحبیب کے سراپا کا جائزہ لیا اور پھر منہ دوسری طرف پھیر دیا۔

اعراقی پھر اسرائیل میں داخل ہو چکا تھا۔ اب اس کے ذمہ دو کام تھے۔ ایک ذکیہ کی تلاش اور دوسرے رافعہ العریشی کی ماں کو اسرائیل کی حدود سے نکال کر اردن کی سرزمین پہ لانا تھا۔

ان دو کام کے علاوہ اس کا خاص فرض یہی تھا کہ وہ اسرائیل کی ان دکھتی رگوں کی نشاندہی کرے جہاں عرب مجاہدین آسانی سے زیادہ سے زیادہ موثر چھاپہ مار سکیں۔ اعراقی کی منزل حیفہ تھی اور پھر وہاں سے اسے تل ابیب پہنچنا تھا۔ وہ ذکیہ کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کتنی بہادر اور جانباز خاتون ہے کہ اپنے خاوند کی تلاش کے لئے شام سے اسرائیل میں داخل ہو گئی ہے۔ حالانکہ شام میں بعث پارٹی کی حکومت ہے۔ جس کے دست و بازو نصیری اور عیسائی ہیں اور جس ملک کے اندر عالم عرب کی بجائے اپنی بقا کی خواہش پیدا ہو چکی ہے۔

شام کی حکومت کے متعلق سوچتے سوچتے اسے اردن اور اردن کی حکومت کے گرد پھیلائے جانے والے استعماری جالوں کا خیال آیا جن کا

رنگ وروپ اب بدل گیا ہے۔ اقوام متحدہ اور اسرائیل سے آنے والی خبروں اور سیاست دانوں کی آراء کے مطابق اسرائیل اس بات پر آمادہ ہے کہ وہ اپنے ملک میں مستقل امن قائم کرنے کے لئے اردن اور دیگر عرب ممالک سے بالا بالا معاہدہ کرلے۔ وہ نہ صرف اردن کا علاقہ خالی کر دینے کو تیار ہے بلکہ وہ بیت المقدس کے دروازے بھی اردن کے لئے کھول دے گا۔ اور اگر اردن چاہے تو اسے غزہ وغیرہ کا علاقہ بھی سیاسی رشوت کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ اردن کا فائدہ ہوتے ہوئے بھی شاہ حسین دوسرے عرب ممالک سے غداری کرنے پر تیار نہیں۔ انہوں نے ایسی تمام پیشکشوں کو ٹھکرا دیا ہے۔ ان کی نیک نیتی اور صدق دلی کی وجہ سے سعودی عرب، لیبیا اور الجزائر ان کو ہر قسم کے تعاون کا یقین دلا رہے ہیں۔ خلوص کے اس سرچشمے سے جس کا نام شاہ حسین ہے عرب عوام کے دلوں کی دھڑکنیں سیراب ہو رہی ہیں اور وہ لوگ جن کی آستینوں میں لات ومنات ہیں شرمندہ ہیں۔

ملکی معاملات پر سوچتے سوچتے اس کے خیالات تنظیموں کی طرف پلٹ آئے اور تنظیموں سے افراد کی طرف۔ اور ان افراد میں سے اس کے خیالات امنۃ الحبیب پر آکر رک گئے۔ سوچ کا دھارا کسی اور طرف پلٹ گیا۔ اسے کتنا عرصہ ہو گیا تھا یوں ہی جگہ جگہ گھومتے ۔۔۔ اسے بھی اپنا گھر بسانا چاہیئے تھا ۔۔۔ اور گھر کے خیالات کے ساتھ اس کی نظروں میں وہ فلسطینی بے گھر دیہاتی گھوم گئے جن کا کوئی گھر نہیں تھا۔ اکیس برس سے وہ کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی ایک نسل اسی خانہ بدوشی کی کیفیت میں پروان چڑھی تھی۔ ایک

تاریک ماضی اور حال ان کی آہوں اور سسکیوں سے بھرا پڑا تھا۔ مستقبل ایک لمبی جد و جہد تھا۔ جس کے اس پار ایک منزل تو ہے لیکن وہاں تک پہنچنا بڑا مشکل ہے۔ ایک خون کا دریا بہانا پڑے گا۔ وہ کچھ بھی سوچتا۔ گھوم پھر کر اس کے خیالات فلسطینی عرب مہاجرین کی سسکتی، کلبلاتی، غیر مطمئن زندگیوں کی طرف پلٹ جاتی۔

حیفہ کا شہر اس کا جانا پہچانا تھا۔ یہاں اس کے جاننے والے بھی کافی تھے۔ لیکن اس نے اپنے عیسائی دوست ڈیوڈ کا گھر رہنے کے لئے چنا۔ اس کا یہ دوست اگرچہ عیسائی تھا لیکن وہ الفتح کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں سے بڑا محظوظ ہوتا۔ اور بڑے فخریہ لہجہ میں اسرائیلیوں کے درمیان پھیلی ہوئی سراسیمگی کا ذکر کرتا۔ اس کی دلی ہمدردیاں فدائیوں کے ساتھ تھیں مگر اس کے باوجود اعرابی نے اسے یہ کبھی نہیں بتایا تھا کہ مفراق کے صحرا میں ایک نخلستان میں قیدی کی حیثیت سے گزاری ہوئی رات نے اس کی زندگی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ وہ الفتح کا ہمدرد نہیں بلکہ اسرائیلی خفیہ فوجی سروس میں ہونے کے باوجود وہ الفتح کا وفادار کارکن ہے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد قہوہ کی پیالی پیتے ہوئے اعرابی نے کہا۔

"سناؤ ڈیوڈ۔ آج کل تمہارے مجاہدین کیا کر رہے ہیں ؟"

"تم خفیہ فوجی سروس کے آدمی ہو تمہیں معلوم نہیں۔ یہودیوں نے جب سے ناصر کو گرفتار کیا ہے تب سے بڑی ڈھینگیں مار رہے ہیں۔"

"کس ناصر کو ؟"

"عرب فدائی کو ۔۔ واہ کیسا اکیس بائیس برس کا نوجوان ہے ۔۔ مجھے ایک دوست نے بتایا ہے کہ اسے بھی سخت سزائیں دی جا رہی ہیں لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کا کوئی اتہ پتہ نہیں بتایا۔ بڑا جی دار نوجوان ہے" ڈیوڈ نے بتایا۔

"آج کل وہ کہاں ہے؟" اعرابی نے پوچھا۔

"اسے حیفہ جیل میں رکھا گیا ہے۔ اسے شہد کی مکھیوں سے کٹوایا گیا۔ الٹا لٹکایا گیا۔ مگر اس نے یہودیوں کی ایک نہیں چلنے دی۔"

"چھوڑ یار۔ میں نے بڑے بڑے دیکھے ہیں۔ ذرا دھمکاؤ سب کچھ بتا دیتے ہیں۔" اعرابی نے ڈیوڈ کی ہاں میں ہاں نہ ملا کر اسے ذرا تیز کر دیا۔

"تم فوجی آدمی تو یہی کہتے رہتے ہو۔ یہ کل کا اخبار پڑھو ۔۔ میں ہمیشہ یہ بیروت کا اخبار" لسان الحال" پڑھتا ہوں۔ مجھے یہ بندرگاہ سے مل جاتا ہے۔"

اعرابی اخبار لے کر پڑھنے لگا۔ یہ ابوالعز کی سرکردگی میں کئے جانے والے حملہ کی تفصیل تھی۔ جس کے نوجوان اور ادھیڑ عمر کے ساتھی ایک قہوہ خانہ میں منتظر تھے۔ خواب آلودہ فضا میں کمانڈوز کی وردی پہنے وہ کسی اور دنیا کے باشندے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ترو تازگی تھی۔ باہر تند و تیز، یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ انہیں اس پرخطر سفر کا احساس تھا جس پر انہوں نے روانہ ہونا تھا۔

ابوالعز ایک لمبا تڑنگا فلسطینی نوجوان تھا۔ وہ قہوہ خانہ میں داخل ہوا۔ اس نے تیکھی اور محبت بھری آواز میں منتظر کمانڈوز کو فوجی نوعیت کی ہدایات دیں۔ نوجوان اٹھے اور باہر کھڑی منتظر گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ دو گھنٹے تک وہ چلتے

رہے۔ کبھی مشرق کی سمت مڑ جاتے اور کبھی شمال کی جانب۔ پھر دریائے اردن کے کنارے پہنچ گئے۔ سخت اندھیرا تھا۔ اسی تاریکی میں وہ دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک ٹولی دریا کے کنارے پر چاق و چوبند کھڑی ہو گئی۔ دوسری دریا میں بٹ گئے۔ تیز بہاؤ کے باوجود ایک دوسرے کو تھامتے ہوئے وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر بعد باقی مجاہدین بھی گئے۔

موسم اگرچہ موافق تھا۔ بارش نے اسرائیلیوں کو کمروں اور خیموں میں بند ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ برف ایسی ٹھنڈی رات میں مجاہدین کا حوصلہ ہی تھا کہ وہ دلدل اور پھسلن میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ان کے پاس ہلکی توپیں، مارٹر، ... دستی بم، گولہ بارود، رائفلیں، سرنگیں بچھانے کا سامان وغیرہ بھی تھا۔ ... مادی اشیاء کے علاوہ ان مجاہدین کے پاس ایمان کی دولت اور گرانقدر غصہ تھا۔

سردی کے خلاف وہ قوت ارادی سے جنگ کرتے خاموش بڑھتے چلے گئے۔ آدھی رات سے قبل انہیں اپنی مہم سر کر کے صبح تک دریا کو عبور کرنا تھا۔ وہ کیچڑ کے لمبے سفر سے نکل آئے۔ ایک نوجوان نے دائی پکار اٹھا۔

"یارب۔ یارب۔ اللہ کی نصرت سے ہی یہ معرکہ سر ہو سکتا ہے۔"

اسرائیلی کیمپ تقریباً دو سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ موسم کی وجہ سے کیمپ کی روشنیاں دھندلا گئی تھیں۔ خاردار تار کی باڑ کے نزدیک کوئی سپاہی نہیں تھا۔ ابوالعز نے گھڑی دیکھی۔ گیارہ بج کر چالیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ رائفلوں کی آواز گونجی۔ آر۔ پی۔ جی توپ گولے اگلنے لگی۔ دو دستی بم پھٹے

اندر کیمپ میں افراتفری مچ گئی۔ چند لمحے دشمن پر بدحواسی کا عالم رہا۔ پھر وہ سنبھلا اور گولیوں کی بارش ہونے لگی۔ ابوالعز نے پندرہ گز کے فاصلے سے ایک بارک پر دستی بم پھینکا۔ اس سے ایک دھماکہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی کیمپ سے قیامت کا شور اٹھا۔ ہلکی توپ سے دشمن بھی گولے برسانے لگا۔ ایک مجاہد ایک دستی بم عمارت کے اندر پھینک چکا تھا۔ یہودی کیمپ سے بھاگ نکلے تھے! اور مجاہدین خاردار تار پھاند کر کیمپ کے اندر داخل ہو چکے تھے۔

بجلی پیدا کرنے والے تمام نظام کو ایک دستی بم نے اڑا کر رکھ دیا۔ ہر طرف تاریکی پھیل گئی تھی۔ مجاہدین نے چند سرنگیں اس راستہ پر بچھائیں جہاں سے اسرائیلی سنبھل کر واپس آسکتے تھے۔ ایسا ہی ہوا۔ کیمپ سے ذرا فاصلہ پر کھڑی ہوئی چند بکتر بند گاڑیاں لے کر وہ کیمپ کی سمت بڑھے۔ سرنگوں نے اپنا کام کیا اور پورا کیمپ دھوئیں کی لپیٹ میں آگیا۔ بائیس منٹ کی اس لڑائی میں بے شمار یہودی کام آئے۔ مخصوص اشارے پر مجاہدین یہودیوں کو اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے چھوڑ کر وقت مقررہ پر اپنی مہم کی تکمیل کر کے کامیاب و کامران لوٹے۔

جب اعرابی اس واقعہ کو پڑھ رہا تھا تب بھی ڈیوڈ الفتح کے مجاہدین کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ اعرابی نے اس کی باتیں سنیں پھر بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ وہ ہمہ تن گوش ہے۔ وہ گاہے گاہے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھ لیتا۔ اب اس نے اپنی نظریں ایک خوبصورت کیلنڈر پر گاڑ دیں اور ڈیوڈ سے پوچھا۔

"یہ کیلنڈر بھی پورٹ سے ملا ہوگا؟"

"ہاں ۔ یہ بھی بیروت کا چھپا ہوا ہے ۔ یہ لبنانی رقاصہ عوامی رقص پیش کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی" اس نے کیلنڈر پر چھپے ہوئے نسوانی چہرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں ۔ میں جانتا ہوں ۔ مگر وہ ہماری بہن کہاں ہے؟ نظر نہیں آتی"

ڈیوڈ اعرافی کے اس سوال سے ایک دم پژمردہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں گہرے رنج و غم کے جذبات پھیل گئے۔ اس نے آنکھیں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"اعرافی مجھے تمہاری دوستی پر بڑا ناز ہے لیکن تم خفیہ سروس والے جو کام کرتے ہو اس کے پیش نظر مجھے تم سے نفرت ہو گئی ہے ۔ مری شمامہ خوبصورت تھی ۔ تم جانتے ہو اس کا قد و قامت غضب کا تھا۔ آواز میں شیرینی تھی اور اس کا جسم پارے کی طرح تھرکتا ہوا ایک شفاف مجسمہ تھا۔ ایسا مجسمہ جسے خود فطرت نے تراشا ہو ۔ وہ پورٹ پر مجھے ملنے آئی اور اسے اسرائیلی فوج کے ایک افسر نے دیکھ لیا اور پھر اسے فوجی مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے لئے مجھ سے چھین لیا گیا۔ مجھ سے میرے اسی دوست نے بتایا ہے کہ اس پر بھی کافی تشدد کیا گیا ہے اور اس کا ذہن دھو ڈالا گیا ہے ۔ اب تو میں بھی اس کے سامنے جاؤں تو وہ مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دے گی"

اعرافی بھی دکھی ہو گیا۔ اسے ربیکا کی یاد آئی ۔ اسے اس کی ماں کی تلاش بھی کرنا تھی ۔ ربیکا کو بھی ایسے ہی مقاصد کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اور خدا جانے کتنی لڑکیاں یوں ہی ملک گیری اور سرمایہ کاری کی قربان گاہ پر قربان کی جا رہی تھیں

یہودیوں کو روپیہ کے علاوہ کسی اور چیز سے کم ہی محبت ہوتی ہے۔

"تم نے شمامہ کو واپس حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟" اعرابی نے پوچھا۔

"کیا کرتا؟ تم ہی بتاؤ۔"

"تم باتیں کرنے کی بجائے عمل سے کام لیتے تو شاید یہ اتنا مشکل نہ ہوتا۔ میں نے ایک لڑکی کو دیکھا ہے جسے مجاہدین ایک اسرائیلی کیمپ سے اٹھا لے گئے تھے۔ شروع میں تو اسے اپنا نام بھی یاد نہیں آ رہا تھا۔ لیکن اب وہ ایک اچھی بیوی کی طرح وقت گزار رہی ہے — اسے بھی افواج نے اپنے مقصد کے لئے تیار کیا تھا۔"

"تم اسے کیسے جانتے ہو؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"بس یوں ہی — میری ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ میں اسے واپس اسرائیل لاؤں۔"

اعرابی نے جھوٹ بولا۔ وہ ڈیوڈ کا ردعمل معلوم کرنا چاہتا تھا۔

"خدا کے لئے ایسا نہ کرنا۔ تمہیں پاک مریم کی قسم — خداوند یسوع تمہیں کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اگر وہ اس عذاب سے بچ نکلی ہے جس میں شمامہ گرفتار ہے تو اسے کبھی واپس نہ لانا۔ تم عیسائی ہو — یہودی قصاب نہیں — ہماری حالت یہاں اقلیت کی ہے۔ ہمیں بھی یہودی نگل جائیں گے۔ تاریخ اس کی گواہ ہے — سارا نظام عالم ان کی ریشہ دوانیوں کا شکار ہے اور رہے گا۔"

"میری بہن مجھے ملے نہ ملے — تم اس کا سکون نہ چھیننا" ڈیوڈ سراپا التجا بن کر رہ گیا۔

"صبر کرو دوست — میں بے شک فوجی ملازم ہوں لیکن پہلے تمہارا دوست

ہوں۔ میں شامہ کو واپس لانے کی کوشش کروں گا۔ تم بھی کوشش کرو۔ انشاءاللہ ہماری کوششیں کامیاب ہوں گی۔"

دونوں دوست بستروں میں گھس گئے اور دیر تک شامہ کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ اعرابی نے ڈیوڈ کو بھی نصیحت کی کہ وہ کسی نہ کسی طرح مجاہدین سے مل جائے۔ وہ اس کا راز افشا نہیں ہونے دے گا۔

چونکہ اعرابی نے ڈیوڈ کو یہ مشورہ خلوص دل سے دیا تھا اس لئے اس نے رات کے دوران کافی غور و خوض کیا اور صبح جب اعرابی اس سے رخصت ہونے لگا تو اس نے کہا۔

"تو میں اعتماد کروں کہ میرا دوست اعرابی مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔"

"یقیناً دھوکہ نہیں دے گا۔ کیونکہ تمہارا دوست بھی تمہاری طرح دل سے الفتح والوں کا قائل ہے ۔۔ اچھا خدا حافظ" اعرابی نے ہاتھ بڑھایا۔ ڈیوڈ نے اس کا ہاتھ گرمجوشی سے تھام لیا۔

حیفہ میں مختلف مقامات پر وہ الفتح کے ان سربراہوں سے ملا جو خفیہ کارروائیاں کر رہے تھے اور جنہیں وہ اب جان چکا تھا۔ اس نے انہیں ذکیہ کی مختصر سوانح کے بعد حلیہ بتایا کہ اسے تلاش کیا جائے۔ اس نے انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے وہاں سے اللید پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ اس لئے اللید کے قریب الفتح کے کارکنوں کو بھی مطلع کر دیا جائے۔ خود وہ تل ابیب کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاکہ رافعہ العریشی کی ماں کو تلاش کر سکے۔

تل ابیب میں وہ فوجی ہیڈ کوارٹر گیا۔ اور اسرائیلی فوجی افسروں سے ملا ۔۔

انہیں اپنی کارروائیوں کی ایک فرضی رپورٹ دی۔ آئندہ کے لئے اس نے بتایا کہ وہ اردن اور لیبیا جانے کا پروگرام رکھتا ہے۔ جہاں مختلف مقامات پر الفتح اپنے رضا کاروں کو عسکری نوعیت کی تربیت دے رہی ہے۔ ایسے مراکز پر کاری ضرب لگانے کے لئے ان کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ کمانڈنگ آفیسر نے اس کا کندھا تھپ تھپایا۔ اور اسے بہت سی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ اس نے پچھلے چند ماہ کی تنخواہ لی اور رمیکا کے گاؤں کی طرف چل دیا۔

رمیکا کے گاؤں پہنچ کر اسے بڑی حیرت ہوئی۔ گاؤں کا گاؤں ملبہ کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ قریب ہی پیڑوں تلے کافی لوگ بیٹھے تھے۔ ان میں مرد اور عورتیں تھیں۔ بوڑھے اور بچے تھے۔ انہوں نے فوجی وردی میں ملبوس اعرافی کو متجسس پاکر ایک قہقہہ لگایا۔ دو بوڑھے لاٹھی ٹیکتے اس گے قریب آگئے۔

"کچھ ملا؟" ایک بوڑھے نے کڑوی زبان سے کہا۔

اعرافی اسے گھورنے لگا۔

"اٹھاؤ یہ مٹی کے ڈھیر — چلاؤ اور گولیاں — برساؤ اور بم" دوسرے بوڑھے نے کہا۔

اعرافی کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ رمیکا کے اس گاؤں کو بھی یہودیوں نے محض اس لئے پامال کیا ہے کہ انہیں یہاں بھی عرب مجاہدین کی موجودگی کا شک ہوگا — حالانکہ یہ گاؤں اسرائیلی دارالحکومت کے بالکل قریب تھا اور مکمل طور پر یہودی تسلط میں تھا۔

"نہیں بڑے میاں ـــ میں تو یہاں ایک بوڑھی عورت کو تلاش کرتے آیا ہوں۔" اعرانی نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"تو ادھر آؤ ـــ پیڑوں تلے بوڑھی عورت کو تلاش کیا ـــ جوان ملے تو اسے بھگا لے جاؤ ـــ یہاں مٹی اور اینٹوں کے ڈھیروں تلے تمہیں بچوں اور دودھوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

سر نیچا کئے اعرانی لاٹھی ٹیکتے چلتے بوڑھوں کے پیچھے ہو لیا۔ ایک بوڑھے نے چلتے چلتے پوچھا۔

"کون تھی وہ بوڑھی عورت؟"

"میری ماں تھی۔" قدرے توقف کے بعد اعرانی نے کہا۔

"یہودی افسروں کی بھی مائیں ہوتی ہیں؟" دوسرے بوڑھے نے پوچھا۔

اعرانی جانتا تھا کہ بوڑھے نے ایسا کیوں کہا ہے؛ اس کے اندر اس کی بیچارگی اور کمزوری بول رہی تھی۔ اعرانی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بوڑھا خود ہی کہنے لگا۔

"جس کی ماں ہوتی ہے، اسے بیٹیوں اور بہنوں کا بھی احساس ہوتا ہے اسے بچوں کی معصومیت پر بھی ترس آتا ہے۔ مگر تم یہودی ..." بوڑھے کی آواز بھر آگئی۔

"میں یہودی نہیں ہوں بابا۔" اعرانی نے صفائی پیش کی۔

"تو اور برا ہے ـــ ان کے آلہ کار تو ہو ـــ تمہاری وردی دیکھ کر ہمیں تم پر تھوکنے کی خواہش ہو رہی ہے۔" ایک بوڑھے نے کہا۔

"نہیں بڑے میاں ــ وہ دن دور نہیں جب ایک خوشگوار صبح طلوع ہوگی اور ہم ایسے محسوس کریں گے جیسے ہم حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے فلسطین میں رہ رہے ہیں۔"

"تم کیسی باتیں کرتے ہو ــ چلو ادھر آؤ دیکھو۔ ان بوڑھی عورتوں میں تمہاری ماں کون سی ہے؟"

"دراصل وہ میری ماں نہیں۔ شاید تم جانتے ہوگے رافعہ العریشی نامی لڑکی تھی اس کی ماں کی مجھے تلاش ہے۔"

"رافعہ العریشی ــ رافعہ ــ وہ نیلیس سے آئی تھی اسے یہودی فوجی سپاہی لے گئے تھے ــ ہمیں اس کی ماں نے بتایا تھا ــ العریش والوں کا محلہ وہ ہے جدھر ملبہ کے اونچے اونچے ڈھیر ہیں ــ اسی ملبہ تلے بوڑھی العریش کی لاش ہے۔ چلو مل کر نکالیں ــ" بوڑھے نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ خاموش ہوگیا تو اعرانی نے بوڑھے کی لاٹھی تھام لی اور پیڑوں کی سمت چلنے لگا۔

بچے اسے دیکھ کر ماؤں کی گودیوں میں جا چھپے۔ جوان ماؤں نے اپنے چہرے سر کے رومالوں سے چھپالئے۔ بوڑھی عورتوں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اعرانی کو یہ سب کچھ دیکھ کر اپنی وردی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اپنی تنخواہ کے نوٹ نکالے اور بوڑھوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں بھی تمہاری طرح عرب ہوں۔ میں اس ظلم کا بدلہ لوں گا۔ یہ نوٹ شاید تمہارے کام آسکیں"۔

بوڑھے حیرت سے اعرابی کے چہرہ کو تکنے لگے۔ بوڑھی عورتوں نے سرگوشیوں میں کچھ کہا۔ نوجوان ماؤں کی گودیوں سے بچے اچھل کر نکلے اور رومالوں سے چھپے ہوئے چہروں کی سفیدی، سرخی پیڑوں سے چھنتی ہوئی دھوپ میں پھیل گئی۔ ایک بوڑھے نے جھجکتے جھجکتے نوٹ تھام لئے۔ واقعی ان کو روپے کی ضرورت تھی۔

اب بوڑھی عورتیں بھی اس سے باتیں کرنے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح یہودی فوجیوں نے ان کو چند منٹ کے اندر گاؤں خالی کرنے کے احکامات دیئے اور پھر مزید موقع دیئے بغیر ہیلی کوپٹروں نے آگ کی بارش شروع کر دی۔ انہیں اطلاع دی گئی تھی کہ العریش کے محلہ میں عرب چھاپہ مار چھپے ہوئے ہیں۔ بوڑھی العریش جس کے متعلق تم پوچھتے ہو اپنی لڑکی کو یاد کر کے اکثر رویا کرتی تھی۔ اور اس روز جب وہ گلی میں نکل کر گاؤں سے باہر آرہی تھی تو اوپر سے ایک گولی اس کی کھوپڑی میں لگی۔ وہ گر گئی اور پھر گلی کے دونوں طرف کے مکانات اس کے اوپر آگرے۔ وہ اکیلی نہیں مری اس کے ساتھ گاؤں کی نصف آبادی ختم ہو چکی ہے"۔

اعرابی یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے گرم گرم آنسو اس کے رخساروں پہ بہہ نکلے تھے ـــــ ان آنسوؤں کو ایک معمر عورت نے اپنے رومال سے پونچھ ڈالا۔ اعرابی بوڑھی عورت کا خلوص دیکھ کر سسکیاں

بھرنے لگا۔ بوڑھی عورت اسے دلاسا دیتی رہی۔

تھوڑے وقت کے بعد جب وہ واپس جانے لگا تو سب کے سب اسے عقیدت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور ایک بوڑھا اپنے سر کو یوں ہلا رہا تھا جیسے وہ اعرابی کو نہ سمجھ سکا ہو۔

عرب چھاپہ ماروں کی کارروائیاں بڑھتی جارہی تھیں۔ جس کی خاص وجہ یہ تھی کہ الفتح کا خفیہ محکمہ بے حد واضح اطلاعات پہنچا رہا تھا یہی وجہ تھی کہ اسرائیل کی ای۔ ایل ایئر لائنز کا مسافر بردار بوئنگ ۷۰۷ طیارہ عرب چھاپہ ماروں نے فضا میں ہی اپنے قبضہ میں لے کر اسے بجائے تل ابیب کے ہوائی اڈے کے الجزائر کے ہوائی مستقر پر اتار لیا۔ اس طیارہ میں سوار کچھ اسرائیلی افسران کے پاس مفید معلومات تھیں جو آزادیٔ فلسطین کے لئے مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔ یہ طیارہ روم سے آرہا تھا۔ غیر ملکی پریس اسرائیل کی حمایت میں بلبلا اٹھا لیکن فرانس سے آزادی کی طویل جنگ جیتنے والوں نے عرب چھاپہ ماروں کے اس اقدام کی تعریف کی۔ اور سرکاری طور پر اعلان کیا کہ اسرائیلی طیارہ واپس نہیں کیا جائے گا۔ جب کہ اس میں سوار غیر ملکی مسافروں اور چند اسرائیلی مسافروں کو الجزائر نے اپنے خرچ پر ان کی منزلِ مقصود پر پہنچا دیا۔ الجزائر نے اسرائیل کے خلاف گذشتہ سال جو جنگ شروع کی تھی۔

اسے ابھی تک ختم کرنے کا اعلان نہیں کیا۔

اسرائیل میں شور و غوغا کے علاوہ سب سے زیادہ جس خبر کو اچھالا گیا وہ موشے دایان کی بیٹی کا وہ بیان تھا جس میں اس نے الفتح کے کارناموں کو سراہا تھا اور برملا کہا تھا کہ ہم بے شک کہتے رہیں اور عرب سربراہوں کے نام سے یہ غلط بیان چھپواتے رہیں کہ گوریلا جنگ ریتیلے میدانی علاقوں میں نہیں لڑی جا سکتی۔ یہ ویٹ نام اور الجزائر نہیں ہے۔ لیکن عرب چھاپہ مار اندرون ملک کے علاوہ ہمارے سمندروں اور فضا پر بھی چھائے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں جنگ سے نہیں باہم گفت و شنید سے اس خطرہ کا علاج کرنا چاہیئے اسرائیلی اخباروں نے اس خبر کو موشے دایان کی غیر ذمہ دارانہ گفتگو کا نتیجہ قرار دیا تھا لیکن موشے دایان نے اس خبر پر صرف اتنا ہی تبصرہ کیا۔

"ژیلؔ محض عربوں کے ظاہری دبدبہ سے مرعوب ہو گئی ہے اور اس کے بیان کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں ہے"

لیکن بیروت کے اخبار "السید" نے لکھا کہ ژیل کا بیان ان طویل مباحثوں کا نتیجہ ہیں جو وزیر دفاع موشے دایان کے گھر میں ہوتے رہتے ہیں۔

اعراقی نے تل ابیب سے غزہ کا عزم سفر کیا۔ لیکن اسے اس کی ہائی کمان نے بتایا کہ الصلت پر حملہ کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ لہٰذا تم الصلت پہنچو۔ اسرائیلی جہاز کے اغوا سے پہلے ہی وہ الصلت پہنچ چکا تھا۔ یہاں اس کی حیثیت اسرائیل کے ایک خفیہ ایجنٹ کی تھی۔

لیکن احمد نے اسے ذوالقرنین کے بارے میں بتا رکھا تھا۔ ذوالقرنین

کے پاس جب وہ پہنچا تو اسے وہاں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا ملا۔ سفید براق ڈاڑھی مونچھوں اور بھنوؤں کے نیچے اس کی تیز تیز آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ایک اجنبی کو دیکھ کر عجیب قسم کے تاثرات پیدا ہوئے۔ ذوالقرنین کو اپنا تعارف وہ دروازہ پر ہی کرا چکا تھا۔ اس لئے ذوالقرنین نے بوڑھے آدمی کو بتایا۔

"دوست ہے"۔ ذوالقرنین نے شاید بوڑھے کی نظریں پڑھ لی تھیں۔

اعرافی ابھی تک خاموش تھا۔ وہ بھی بوڑھے کی موجودگی میں کوئی بات کرنے سے جھینپ رہا تھا۔ آخر ذوالقرنین کو کہنا پڑا۔

"یہاں کوئی غیر نہیں۔ بے شک کھل کر بات کریں"۔

"پھر بھی کچھ تعارف تو ہونا چاہیئے"۔ اعرافی نے کہا۔

"یہ بوڑھے حضرت"۔ اس نے بوڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "الفتح کے بڑے مشہور و معروف کارکن ہیں۔ ان کو ایک وقت مل کر جب دوسرے وقت ملا جائے تو ان کو پہچاننا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ان کا نام سلمان غنی ہے اور ابھی ابھی قاہرہ سے آئے ہیں۔ انہیں خفیہ طور پر اطلاع ملی ہے کہ اسرائیلی الکرامہ کے بعد اب دوسرا بڑا حملہ الصلفت پر کر رہے ہیں۔ مناسب انتظامات کے لئے ہائی کمان نے ان کو یہاں بھیجا ہے"۔

اعرافی اٹھ بیٹھا۔ صحن میں ٹہلنے لگا۔

"پھر مناسب انتظامات ہو چکے ہیں"؟

"ہاں۔ لیکن حملہ کا دن اور وقت نہیں معلوم ہو سکا"۔ ذوالقرنین نے بتایا۔

"یہی معلوم کرنے کے لئے میں نے یہ بھیس بدلا ہے" سلمان غنی بولے۔

"تو آپ بے شک یہ بھیس بھی بدل ڈالیں۔ حملہ کی تاریخ میں نے مقرر کی ہے جس اسرائیلی فوج کی طرف سے پیش بینی کے لئے یہاں بھیجا گیا ہوں"

"تم بھیجے گئے ہو؟" سلمان غنی نے حیرانگی سے کہا۔

"ہاں مجھے بھیجا گیا ہے۔ میرے پاس اسرائیلی ہائی کمان کے احکام ہیں۔" اعرافی نے بتایا۔

"لیکن میری اطلاع جو خاص تل ابیب کے فوجی مرکز سے موصول ہوئی ہے بتاتی ہے کہ کافی عرصہ پہلے سے یہاں بہت سے فوجی افسر بھیس بدل کر پہنچ چکے ہیں اور ان میں سے ایک ہم گرفتار بھی کر چکے ہیں"

"ہاں۔ یہ ٹھیک کہتے ہیں" ذوالقرنین نے بتایا۔ "وہ ہماری تنظیم ... ہسپتال میں مرہم پٹی کا کام کرتا تھا۔ ہمارے کئی مجاہدین اس کی عیاری کا شکار ہو چکے ہیں۔ یہ تو ہماری خوش قسمتی تھی کہ وہاب نے ہوش میں آتے ہی اسے پہچان لیا۔ وہ ظالم اللید کا جلاد اور ناظم تھا"

اعرافی کو یاد آیا کہ الصلت میں احمد اور سارہ وہاب کو چھوڑ گئے تھے۔ اور وہ یہاں زیر علاج تھا۔ اس نے وہاب کو ابھی تک دیکھا نہیں تھا۔ اس کے متعلق سنا ہی تھا۔ ذکیہ کو وہ مفرافی صحرا میں دیکھ چکا تھا۔ اسے ذکیہ کا خیال آیا اور پھر اس کے خیالات، امنہ الحبیب پر آ کر ٹھہر گئے۔ اس نے گرفتار شدہ اسرائیلی فوجی افسر کو دیکھنے کی خواہش نہیں کی۔ مبادا وہ اسے پہچان لیتا اور اس کا کام مشکل ہو جاتا۔ اسرائیل کے متوقع حملہ کی جزئیات اس نے سلمان غنی کو بتائیں۔ سلمان غنی اٹھ کر

اندر چلے گئے۔ جب وہ واپس ہوئے تو وہ ادھیڑ عمر کے ایک معزز شہری نظر آ رہے تھے۔ وہ بالوں کی سفیدی غائب تھی۔ لیکن اصل بالوں میں بھی چاندی سی جھلک رہی تھی۔ آنکھوں میں ذہانت اب بڑی نمایاں تھی۔

اسی شام السلت سے دس میل کے فاصلہ پر اعرافی وہاب سے ملا۔ وہاب کے علاوہ السلت کی ساری آبادی وہاں پہنچ چکی تھی، جس میں عورتوں اور بچوں کی تعداد زیادہ تھی۔ وہاب بڑا سنبھلا ہوا تھا۔ اس کے زخم مندمل ہو رہے تھے اور یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اسرائیلی جلاد کے ہاتھ نہیں چڑھا تھا۔

اعرافی کو ثابت ہو گیا کہ اسرائیلی حکام نے اس کے علاوہ بھی خفیہ اطلاعات سے متعلق فوجی افسر السلت میں متعین کر رکھے تھے۔ ابھی وہ کسی قسم کی رپورٹ بھی تل ابیب نہیں بھیج سکا تھا کہ السلت پر حملہ ہو گیا۔ اسرائیلی طیاروں نے "الفتح" کے ٹھکانوں کو تہس نہس کرنے کا بہانہ بنا کر ایک اور جارحیت اردن کی سرزمین پر کی۔ دریائے اردن کے اس پار السلت کے تین میل جنوب اور دو میل مغرب میں دو ٹھکانوں پر ہوائی حملے کئے اور دعویٰ کیا کہ انہوں نے الفتح کے فوجی تربیت کے مراکز کو نشانہ بنا لیا ہے اور اس کے طیارے تین گھنٹے کی بمباری کے بعد بحفاظت اسرائیل پہنچ گئے ہیں۔ اسرائیل کے بیان کے مطابق ان مراکز پر چار سو فدائی موجود تھے جن کو نقصان پہنچایا گیا۔ اسرائیل نے یہ بھی کہا کہ الفتح کے زیر استعمال گاڑیوں پر اردن کی بجائے "ف" لکھا ہوا تھا اور وہی نشانہ بنائی گئی ہیں۔

اعرافی نے اب صورت حال کو خود دیکھا تھا۔ اسے السلت کی حالت

اور حملہ کی ساری تفصیلات کا علم تھا۔ لیکن اسرائیلی پروپیگنڈے نے جو ادھم مچایا تو اعرافی پریشان ہوگیا۔ اس نے اس جھوٹ کے متعلق باتیں کرتے ہوئے سلمان غنی سے کہا۔

"اس قسم کا جھوٹ اور جھوٹی قیادت بھی ملکوں کی تباہی کا باعث ہوسکتی ہے۔"

"لیکن کون سمجھائے، کس سے کہا جائے؟" سلمان غنی نے جواب دیا۔

"آج کے دور میں پروپیگنڈہ بھی بڑا ضروری ہے۔ اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اسرائیل کا الصلت پر حملہ حریت پسندوں کو کچلنے کے لئے ہی تھا تو یہ سمجھ نہیں آتی کہ پورٹ سعید کے قریب نئے سرے سے جنگ کی ابتدا کیوں کی گئی اور انہیں ان حریت پسندوں کا پتہ کیوں نہ چل سکا جنہوں نے غزہ اور القنطارہ کو ملانے والی ریلوے لائن بم مار کر اڑا دی تھی اور مقبوضہ علاقہ میں مسلح کارروائیاں کر رہے تھے۔ یہ شواہد غلط پروپیگنڈہ پر اثر انداز ہوں گے۔" سلمان غنی نے کہا،

"دوست صاف واضح ہوتا ہے کہ اسرائیلی افواج کے مقابلہ میں مقبوضہ فلسطین کے عوام الفتح کے رضاکاروں کے زیادہ دوست ہیں۔ اسی لئے تو وہ اسرائیل کی حکومت کو الفتح کے مجاہدین کے متعلق کچھ نہیں بتاتے اور خفیہ اطلاعات کا محکمہ حکومت کو غلط ملط رپورٹیں دے کر یہ باور کراتا ہے کہ اسرائیل کی حدود کے اندر ہونے والی کارروائیاں دریا کو پار کر کے کی جاتی ہیں کہ الفتح خود عرب حکومتوں کے لئے خطرہ ہے اور سربراہان مملکت عرب اس تنظیم سے

خائف ہیں۔ اور وہ سختی سے تنظیم کی کارروائیوں پر پابندی لگا رہے ہیں"۔

"نہیں نہیں"! اعرافی نے سلمان غنی کو خاموش پاکر کہا۔

"خفیہ سروس اطلاع دیتی ہے کہ فلاں فلاں مقام پر حملہ ناگزیر ہے۔ افواج اپنی کارکردگی دکھانے اور حکومت اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے ایسے اچانک حملے کر کے داد وصول کرتی ہے۔ سامان حرب خریدتی ہے۔ امداد کے طور پر قبول کرتی ہے۔ مجھے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ان حملوں سے یہ ہرگز مطلب نہیں ہوتا کہ واقعی الفتح کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا جائے۔ اگر یہ درست ہوتا تو اگلے ہی روز گولان کی پہاڑیوں پر اسرائیلی طیارے بم کیوں گراتے۔ وادیٔ اردن میں شہری آبادی پر زہریلی گیس کے بم کیوں پھینکے جاتے اور نیپام بموں سے آگ کیوں لگاتے"؟

اعرافی اپنے سر کو دائیں بائیں یوں ہلانے لگا جیسے وہ یہ صورت حال سمجھنے سے قاصر ہو۔ پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"دوسرا رخ دیکھئے، سلامتی کونسل اسرائیل کی مذمت کی قرارداد پاس کر رہی ہے۔ امریکہ کہہ رہا ہے کہ روسی اسلحہ اردن کو مل رہا ہے اب وہ اسرائیل کو فینٹم طیارے دے گا"۔

"امریکہ اور روس کی دکانداری بھی عجیب ہے۔ وہ فریقوں کو لڑاتے ہیں ان کا اسلحہ وغیرہ تباہ کراتے ہیں اور پھر اپنے معیار زندگی کو قائم رکھنے اور اپنی فیکٹریوں کو چلتا رکھنے کے لئے سامان حرب بیچنا تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن وہ اس ناز ونخرہ سے بیچتے ہیں جیسے وہ دنیا کے سب سے بڑے چور بازاری کرنے

والے ہوں"۔

اس قسم کی گفتگو میں دن ڈھل گیا۔ دور افق پر سرخی پھیل گئی۔ اور اعراقی نے اگلے روز عمان جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ اب کبھی بھی اسرائیل نہیں جائے گا۔ دو عملی کی زندگی ترک کر دے گا اور۔ اور ۔۔ اس نے سوچا۔

"سارہ باجی پوچھیں گی کیا تم نے مسلمان ہونے کے بارے میں سوچا؟"

اس نے اپنے دل میں جواب تلاش کیا۔ اس کے سامنے الفتح کے چند جانے پہچانے کارکنوں کی زندگی تھی۔ ان میں کتنی صداقت تھی۔ ایک دوسرے سے کتنے گہرے روابط تھے ۔۔ قول و فعل میں ایک تھے۔ ایک بامقصد زندگی گزار رہے تھے۔ بے شک اس زندگی میں تموج تھا۔ تلاطم تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں ایک طمانیت تھی۔ جس انسانیت کی اسے تلاش تھی وہ تو اس کے اردگرد ایسے ہی کرداروں سے بھری پڑی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتا سوچتا رہا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ سارہ کو مل کر کہے گا۔

"باجی نیرو کے صحرا میں میں تمہاری باتیں سنکر غلط راہ سے سیدھی راہ پر آیا اور اب تمہاری دعوت قبول کرتے ہوئے میں تثلیث سے منہ موڑ کر ایک خدا کو سجدہ کرتا ہوں اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلمہ پڑھتا ہوں"۔

ایسا سوچنے سے جیسے اسے سکون مل گیا اور وہ سو گیا۔

اگلی صبح جب اس نے عزم سفر کیا تو سلمان غنی بھی اس کے ساتھ ہی ذوالقرنین سے رخصت ہوئے۔ وہ یروشلم پہنچنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے کئی مقاصد

اور کئی حالات تھے۔ بیت المقدس میں عرب مظاہرین کے جلوس پر اسرائیلی پولیس نے لاٹھی چارج کیا تھا۔ کئی عربوں کو گرفتار کرنے کے بعد اسرائیلی ان پر طرح طرح کے ظلم ڈھا رہے تھے۔

غزہ میں غیر ملکی نامہ نگاروں کے داخلہ پر پابندی لگادی تھی۔ تل ابیب کے قریب تیل کا ایک بہت بڑا ذخیرہ عرب چھاپہ ماروں نے نذرِ آتش کر دیا تھا۔ لبنان کے ایک سرحدی گاؤں شال الخیل پر اسرائیل نے اچانک حملہ کر کے بہت سے دیہاتیوں کی جانوں سے ہاتھ رنگے تھے۔ جون میں اسرائیل نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ بیت المقدس کو اپنی حکومت کا صدر مقام بنائیں گے۔ العریش سے عربوں کو نکال کر یہودیوں کی آبادکاری شروع کر دی تھی۔ صحرائے سینا میں اسرائیلی فوجیں بڑے پیمانے پر وسیع مشقیں کر رہی تھیں۔ محفوظ فوجی دستوں کو اسرائیل نے طلب کر لیا تھا۔ جریکو کے علاقہ میں اسرائیلی فوجی کمان کا دفتر فدائیوں نے تباہ کر دیا تھا اور نتیجہ میں تمام مسلمان آبادی زیرِ عتاب تھی۔ عظیم تر اسرائیل کے منصوبے پر عمل ہو رہا تھا۔ آثار قدیمہ کی کھدائی کے نام پر بیت المقدس میں مسجد اقصیٰ کی بنیادیں کھوکھلی کی جا رہی تھیں۔ ایسی تصاویر اخبارات میں آ رہی تھیں کہ غیر ملکی سیاح جوتوں اور کتوں سمیت بیت المقدس کی سیاحت کر رہے ہیں۔ وہ مسجد کی تکریم بھی نہیں کرتے تھے۔ جب مسلمانوں نے احتجاج کیا تو نہ صرف انہیں سزاؤں کا مستوجب ٹھہرایا گیا۔ بلکہ دو ہزار مربع گز زمین کے اس علاقہ میں بھی قبضہ کر لیا جسے خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب نے تعمیر مسجد کے لئے منتخب فرمایا تھا۔

ان واقعات اور جارحیتوں کے علاوہ عراق میں انقلاب آ گیا تھا۔ مارشل عارف کی حکومت پر انقلابی کونسل نے قبضہ کر لیا تھا۔ مارشل عارف ملک سے باہر چلے گئے تھے۔ کرنل عبدالرزاق نئے وزیر اعظم کو جلاوطن کر دیا گیا تھا اور احمد حسن البکر نے عراقی فوجوں کی کمان خود سنبھال لی تھی۔ شام کے دو مگ طیارے اسرائیل نے زبردستی اپنے علاقہ میں اتار لئے تھے اور صورت حال مزید بگڑ گئی تھی۔ اگرچہ جملہ حالات کی تفصیلات الفتح کے مراکز کو مل رہی تھیں لیکن پھر بھی یہ ضروری سمجھا گیا تھا کہ سلمان غنی خود یروشلم جائیں اور ایسی رپورٹیں ارسال کریں جن کی روشنی میں مزید موثر کارروائیاں کی جا سکیں۔

اعرافی نے الصلت سے دس میل پرے ایک کیمپ میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ تاکہ وہ دہاب سے مل سکے۔ اس کی خیریت دریافت کر سکے۔ اس کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے سلمان غنی نے اسے جیپ سے اتار دیا۔ اور وہ کیمپ میں چلا گیا۔ وہ کیمپ کے ایک گوشہ میں بنائے گئے عارضی ہسپتال میں دہاب سے ملا۔ جو بڑی تیزی سے سنبھلتا جا رہا تھا۔ وہ بے حد خاموش تھا۔ اداس تھا۔

اعرافی نے اسے علیک سلیک کہی اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"کیا خیال ہے ڈاکٹر کب تک تمہیں یہاں سے فارغ کر دے گا؟"

"میں تو فارغ ہی فارغ ہوں۔ لیکن ابھی مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ العاصفہ کے کسی کام آ سکوں۔"

"میں عمان جا رہا ہوں۔ کیا تم کوئی پیغام دینا چاہتے ہو؟"

"کس کو؟"

"کسی دوست کو ___ مہربان کو ___ محسن کو ___ کیا عمان میں تمہارا کوئی نہیں؟"

"کیوں نہیں ___ وہاں سارہ باجی ہے ___ طلحہ باجی ہیں ___ صالحہ باجی ہیں ___ لیکن وہ تو میری حالت پوچھتے ہی رہتے ہیں۔ دوسرے تیسرے روز ان کے پیغامات آتے ہیں۔ میں ان کو جواب بھی دیتا ہوں ___ لیکن انہوں نے کبھی مجھے اس کے متعلق نہیں بتایا جس کے متعلق میں جاننا چاہتا ہوں" وہاب نے کہا۔

اعرانی سمجھ گیا کہ وہاب کا کیا مقصد ہے۔ تاہم اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"تم کس کے متعلق جاننا چاہتے ہو؟"

"اپنی بیوی کے متعلق"

"وہ کہاں ہے؟"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ میں بیماری کی اس حالت میں اس کی شدید ضرورت محسوس کر رہا ہوں"

"میں تمہیں اس کے متعلق کچھ بتا سکتا ہوں۔ میں اسے ایک نخلستان میں ملا تھا۔ وہ بے حد ذہین اور بہادر خاتون ہے اس نے ایک بھیڑیے کو مار گرایا تھا"

وہاب کے چہرہ پہ مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ فخر سے کہنے لگا۔

"وہ بھی العاصفہ کی مجاہد ہے۔ وہ بڑے بڑے حیرت انگیز کام کرچکی ہے کیونکہ اس نے شکست کھانا سیکھا ہی نہیں ہے" قدرے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔

"کیا وہ اب بھی نخلستان میں ہے؟"

"اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا" اعرابی نے کہا۔

وہاب پریشان ہوگیا اور اس نے پوچھا۔

"کیوں — کیا بات ہے؟"

"تمہیں سن کر دکھ ہوگا"

"تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ زندہ تو ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اور کسی خبر سے دکھ نہیں ہو سکتا کیونکہ مجھے ذکیہ پر پورا اعتماد ہے" وہاب نے اپنی نظریں اعرابی کے چہرہ پر جماتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے کیونکہ ابھی دو ہفتے پیشتر اس کا ایک خط سارہ باجی کو ملا تھا" اعرابی نے بتایا۔

"لیکن مجھے سارہ باجی نے کیوں نہیں بتایا۔ اس میں کیا مصلحت تھی ۔؟" وہ حیران سا رہ گیا۔

"کہاں سے آیا تھا وہ خط؟"

"شام سے۔ وہیں سے وہ تمہاری تلاش میں اسرائیل میں داخل ہو چکی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی روز تم انتہائی مخدوش حالت میں دریائے اردن کے دوسرے کنارہ سے ملے"

معلوم ہے۔ ذوالقرنین نے مجھے سب تفصیلات بتا رکھی ہیں۔"
وہاب نے کہا۔" مگر ذکیہ کا ذکر اس نے بھی نہیں کیا۔"

اعرافی سوچتا رہا۔ اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی جس کی وجہ سے باجی نے وہاب کو ذکیہ کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب اعرافی عمان کے لئے روانہ ہوا تو اس نے وہاب سے کہا کہ وہ جلد ہی اسے ذکیہ بہن کے متعلق لکھے گا۔"

راستہ میں ہی اسے بیروت کا اخبار "السید" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ اسرائیلی بوئنگ طیارہ کا قضیہ ابھی چل رہا تھا۔ اسرائیل سے ہمدردی رکھنے والی غیر ملکی کمپنیوں اور ہوا بازوں کی بین الاقوامی فیڈریشن نے الجزائر سے بائیکاٹ کا ایک پروگرام بنایا۔ انہیں ردعمل پر جس صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا انہیں اندازہ نہیں تھا کویت، عراق، اردن، لبنان، شام، مراکش اور متحدہ عرب جمہوریہ نے متفقہ طور پر ایسا فیصلہ کرنے والی تمام کمپنیوں اور ایسے تمام ہوا بازوں کو خبردار کیا کہ اگر انہوں نے الجزائر کا بائیکاٹ کیا تو وہ کسی بھی کمپنی کے جہاز کو اپنے ہوائی اڈوں پر نہیں اترنے دیں گے۔ اور مکمل بائیکاٹ کر دیں گے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ الجزائر کے خلاف کسی رسمی کارروائی کی بھی کوئی جرأت نہ کر سکا۔ الجزائر نے طیارہ اور ہوا بازوں کی رہائی کے بدلے الفتح کے رضا کاروں کی رہائی کا مطالبہ قائم رکھا۔

اعرافی نے سوچا۔ ان عرب ملکوں کے اس فیصلہ سے یہ تو ثابت ضرور ہوتا ہے کہ عربوں کے اندر ابھی تک مل بیٹھنے کی خواہش ضرور ہے۔ اگرچہ

وہ ابھی تک ایک محاذ پر اکٹھے نہیں ہو سکے۔ جانے عرب اتحاد کا خواب کب شرمندہ تعبیر ہو گا؟

عمان پہنچ کر اس نے سارہ کو اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا۔ سارہ کے چہرہ پر خوشی کا نور پھیل گیا۔ وہ بے حد خوشی کے عالم میں باتیں کرتی رہی۔ رات کو اس نے ایک مختصر سی دعوت کا انتظام کیا۔ اس دعوت میں طلحہ، صالح، احمد مجتبیٰ، ان کے لڑکوں کے علاوہ عبدی، امتہ الحبیب بھی تھے۔ امتہ الحبیب کو یہ جان کر کہ اعرانی عیسائی تھا حیرانی ہوئی۔ اس کے رنگ و روپ سے تو ایسا ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ تاہم وہ بھی دوسروں کی خوشی میں شریک تھی اور آج اس کا حجاب گزشتہ ملاقات کی نسبت کم تھا۔ عبدی تو اعرانی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اور بار بار اس سے پوچھ رہا تھا۔ کیا وہ لڑائی لڑ آیا ہے۔ اس نے جہازوں کو گرتے اور توپوں کو گولے اگلتے دیکھا ہے۔ اعرانی موقع بہ موقع اس کے سوالات کا جواب بھی دیتا تھا اور باقی احباب سے بھی گفتگو کر رہا تھا۔

رمیکا اور ابوالاسرار دیر سے آئے لیکن اس کے باوجود ان کی آمد پر اس سنجیدہ سی مجلس کا رنگ بدل گیا۔ سارہ نے رمیکا کو کہا کہ وہ کوئی عربی گیت سنائے تھوڑے اصرار کے بعد رمیکا نے ایک بڑا مشہور عربی نغمہ سنایا۔ آواز کے جادو کے علاوہ اس کے بول بھی بڑے دل نشیں تھے۔

یہودی یوم کفارہ منا رہے ہیں
کیا دین موسوی مردم آزاری کا نام ہے
یہ گھاس پھوس کی بجائے پتھروں کے شبستان

سکوت کا دن منانے کی خاطر تو نہیں
اب تو وہ ہنوکہ کا دن منا سکتے ہیں
ہیکل سلیمانی کی آبادی شروع ہے
کب کوئی صلاح الدین ایوبی اٹھے گا
تم جو میرے بھائی، تم جو الفتح کے جاں نثار ہو
تاریخ تمہیں زندہ رکھے گی
تمہارے خون سے صحراؤں میں پھول اگیں گے۔
یروشلم کے پہاڑوں کی چوٹیاں تمہارے پاؤں کو بوسہ
دینے کے لئے بے تاب ہیں
صیہون تمہارے قدموں کے نیچے ہوگا

کھانا کھایا گیا اور پھر سب لوگ چلے گئے۔ اعرابی، سارہ اور احمد ہی رہ گئے
اعرابی نے بستر پر جانے سے پیشتر سارہ سے پوچھا۔

"وہاب بڑا اداس ہے۔ آپ نے اسے ذکیہ کے متعلق کیوں نہیں بتایا؟"

"اس لئے کہ بیماری میں اگر وہ ذکیہ کے یوں گم ہو جانے کی سنتا تو بے چین ہو جاتا اور پھر اسرائیل کی مدد دیار کر جاتا۔" سارہ نے جواب دیا۔

"لیکن میں نے اسے بتا دیا ہے۔ اسے گلہ تھا کہ باجی نے ذکیہ کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتایا۔"

"میں اسے اچانک خوش خبری سنانے والی تھی۔ یاسر عرفات کو کسی داؤد نامی کارکن کا خط ملا ہے کہ ذکیہ حیفہ میں ہے۔ اور اسے یہ بتا دیا گیا ہے کہ وہاب اب

اسرائیل کی مدد میں نہیں ہے"۔

"داؤد"۔ اعرافی زیر لب بڑبڑایا۔

"کیا تم اسے جانتے ہو؟" سارہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ اس کا نام ڈیوڈ ہے۔ اس کی بہن بھی رمیکا کی طرح اسرائیلی فوج نے اغوا کر رکھی ہے اور اسے خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے تربیت دی جا رہی ہے"۔

سارہ پریشان ہو گئی۔ وہ ویسے بھی کسی کا دکھ سن کر پریشان ہو جایا کرتی تھی لیکن عورت ذات پر افتاد کا سن کر اسے کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا تھا تاہم اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا۔

"جانے یہ یہودی کیسے لوگ ہیں۔ کسی کا مستقبل تباہ کر کے انہیں تسکین کیوں ہوتی ہے۔ طلحہ باجی نے بتایا کہ قاہرہ میں مفتی اعظم نے ایک دفعہ ان کے لباس پر اعتراض کیا تھا۔ وہ اگرچہ مکمل پردہ اختیار نہیں کر سکیں لیکن انہوں نے اس دن سے آج تک سکرٹ نہیں پہنی۔ ہمارے قائدین کو تو ہمارے لباس تک کا خیال ہوتا ہے اور ان کے قائدین اسرائیلی خدا تو عریانیت کو ایک جنگی ہتھیار بنانے پر تلے ہوئے ہیں"۔

"یہ ہمارے بنیادی عقائد کی وجہ سے ہے۔ وہ اسے معیوب خیال نہیں کرتے۔ تشدد سے کام لینا بھی ان کے لئے معیوب نہیں۔ ہمارے پاس اس ہتھیار کا بھی کوئی جواب نہیں"۔ اعرافی نے کہا۔

میں نے اسے رمیکا کی کہانی سنائی تھی۔ میں نے اسے یہ بھی نہیں بتایا کہ میری

موجودہ حالت کیسی ہے وہ مجھے اسرائیلی فوج کا کمیشنڈ آفیسر ہی سمجھتا ہے۔ لیکن میں نے اسے کہا کہ اگر وہ شمامہ کی تلاش کرنا چاہتا ہے تو باقاعدہ طور پر الفتح کا کارکن بن جائے۔ ویسے وہ الفتح کا ہمدرد تو عرصہ سے ہے۔ میں خود شمامہ کو تلاش کرنا چاہتا ہوں، بڑی اچھی لڑکی تھی۔"

"خدا کرے وہ مل جائے اور ....." سارہ کہہ رہی تھی کہ اعرابی نے بات چھین لی۔

"مل تو وہ جائے گی۔ مجھے اس کا اتہ پتہ چلانے میں دشواری پیش نہیں آئے گی لیکن اسے اس کا ماضی یاد دلانا بڑا کام ہوگا۔ جس راہ پر وہ چل رہی ہوگی اسے اس راہ سے ہٹانا دشوار ہوگا۔"

"اسے بھی رمیکا کی طرح گرفتار کر کے لے آیا جائے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا علاج کیا جائے گا۔" سارہ نے تجویز پیش کی۔

"ہاں یہ ممکن ہے۔ میں سوچوں گا ـــــ مجھے ایک دفعہ اور اسرائیل جانا ہی ہوگا۔"

"جانا ہی ہوگا۔ ابھی رمیکا کی ماں کا بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ مجھے اس کی حزن آمیز آنکھیں بڑی ملتجی معلوم ہوتی ہیں۔"

"لیکن باجی۔ رمیکا کو تو اب صبر کر لینا چاہیئے۔"

"کیا مطلب؟" سارہ نے حیرانگی سے کہا۔

"مطلب یہ ہے۔ کہ اب اس کی ماں زندہ ہے اور نہ وہ گاؤں جس کی گلیوں سے رمیکا کی یادیں وابستہ ہیں۔ اسے ایک بار پھر اپنا ماضی بھول جانا چاہیئے ـــــ

تل ابیب نے اس کا نام و نشان مٹا دیا ہے۔ اور بوڑھی العریشن کو ملبہ کے ڈھیر تلے آتے سارے گاؤں نے دیکھا ہے۔"

اعرابی خود بھی اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے آزردہ ہو گیا۔ اور سارہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"بچاری رافعہ" سارہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اعرابی خاموشی سے ٹہلنے لگا۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ بالکونی کے اس حصہ میں آ گیا جہاں احمد بیٹھا لکھ رہا تھا۔ اس دفعہ شمارہ کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی تھی۔ الصلت کے حملہ سے معمولات میں فرق آ گیا تھا۔ احمد نے سر اٹھایا اور اعرابی کو دیکھ کر کہا۔

"بڑے اداس لگ رہے ہو، کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں"

ابھی وہ کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ سارہ بھی وہیں آ گئیں۔ اس کی سرخ آنکھیں اور بھیگے بھیگے رخسار دیکھ کر احمد نے لکھنا بند کر دیا۔ لیمپ بجھا دیا اور چاند کی چاندنی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ یوں سنجیدہ ہونا چھوڑ دو۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کا سامنا کرتے تمہارے دل یوں بھیج جاتے ہیں تو بڑے بڑے کام کیسے کرو گے؟"

"لیکن آپ نے تو پوچھا بھی نہیں کہ کیا ہوا ہے؟"

"کوئی اچھی بات تو نہیں ہو گی نا" احمد نے جواب دیا۔

"ہاں اچھی بات نہیں ہے۔ رمیکا کی ماں مر گئی ہے۔ زندہ ملبہ تلے دب گئی ہے۔ رمیکا سنے گی تو کیا کہے گی" سارہ نے پوچھا۔

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ احمد نے آہستہ سے سارہ کا ہاتھ تھاما اور سونے کے لئے چلے گئے۔ اعرافی نکھری ہوئی چاندنی میں کھلے آسمان تلے لیٹا شمامہ، امتہ الحبیب اور ذکیہ کے متعلق سوچتا رہا۔ اپنی اس اسکیم کے متعلق سوچتا رہا جو وہ ذہن میں مرتب کر رہا تھا اور جس میں ان تینوں لڑکیوں کے نام آتے تھے۔

اگلی صبح ہی اعرافی نے پھر اسرائیل جانے کا ارادہ کر لیا۔
سارہ نے ناشتہ پر کہا۔
"بہتر ہوتا آپ طلو باجی سے مل لیتے شاید ہائی کمان آپ کے ذمہ کوئی اور کام لگانا پسند کرتی۔"
"نہیں باجی۔ اب میرے ذمہ وہی کام رہنے دو جو پہلے ہی میرے ذمہ لگا ہوا ہے۔ ربیکا کی مایوسیوں نے میرے ارادہ میں اور راسخ کام پیدا کر دیا ہے اور پھر میں ابھی اسرائیل کی فوج کا ایک افسر ہوں۔"
"خدا کرے تم شمامہ کو یہاں لانے میں کامیاب ہو سکو۔"
"ذکیہ کے لئے بھی تو دعا کیجئے۔"
"میں تو اس کے لئے بھی دعا گو ہوں۔ لیکن شمامہ کا ذکر تو میں نے اس لئے خاص طور پر کیا ہے کہ میرا بھائی نوجوان ہے اور اب وہ ہمیشہ کے لئے اسرائیل کو خیر باد بھی کہہ رہا ہے۔ اکیلا یہاں اداس ہو گا۔" ساتھ ہی سارہ کے چہرہ پہ

مسکراہٹ پھیل گئی جو رشتہ ناطہ کی بات کرتے خواتین کے چہروں کا ایک لازمی جزو ہوتی ہے۔

"باجی آپ نے غلط اندازہ لگایا ہے۔ میں نے کبھی ایسا سوچا بھی نہیں۔"

"میرا تو سوچنا فرض ہے نا۔ تم میرے چھوٹے بھائی جو ہوئے۔"

اعرابی وہیمی ہنسی ہنسا اور کہنے لگا۔

"ہاں، ہاں سوچیئے۔ لیکن شمامہ کے متعلق نہیں۔" وہ رک گیا اور سارہ کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔

"تو پھر کس کے متعلق ـــ امتہ الحبیب کے متعلق؟"

یہ بات سنتے ہی اچانک اعرابی نے سارہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان آنکھوں میں شفقت اور محبت سے مملو روشنی تھی۔ ایک عزم تھا۔ ایک وفا تھا۔ ایک ایسا شعلہ تھا جو دلوں کو پگھلا دیتا ہے۔ لیکن اس میں آنچ نہیں ہوتی پھر اس نے کہا۔

"باجی! خدا کی قسم۔ آپ دلوں کے بھید جانتی ہیں۔"

"دلوں کا بھید تو صرف خدا جانتا ہے لیکن میں نے تمہاری نظروں میں امتہ الحبیب کے لئے اپنائیت محسوس کی تھی۔ لیکن جب تم نے داؤد اور شمامہ کا ذکر کیا تو میں سمجھی شاید پرانی جان پہچان میں کوئی ایسی بھی صورت ہو۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہ تھی۔"

"تو پھر، میں سمجھوں کہ میرے سر سے دونوں بوجھ بیک وقت اتر جائیں گے۔"

"وہ بوجھ کون کون سے؟"

"تمہاری طرح امتہ الحبیب بھی تو میری ذمہ داری ہے نا"

اعرابی کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی کے چوبیس برس کتنی غلطی پر رہا ہے اور وہ فلسطینی مجاہدوں کو اپنا دشمن خیال کرتا رہا ہے۔ اور اس کے سامنے بیٹھی ہوئی یہ عرب عورت کتنی عظیم تھی۔ اس کا اپنا کوئی بچہ نہیں لیکن اس کے اندر ممتا موجود ہے۔ اعرابی اس کی عظمت کے سامنے بچہ ہی نظر آتا تھا۔

جب اعرابی رخصت ہونے لگا تو سارہ نے کہا۔

"جلد ہی واپس لوٹنا۔ میں سارے انتظامات مکمل کر رکھوں گی"

احمد حبس نے ابھی تک ذاتی نوعیت کی باتوں میں کوئی دخل نہیں دیا تھا کہا۔

"میں ایک تجویز پیش کرتا ہوں"

سارہ نے شوہر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "کون سی تجویز؟"

"ہم اس شادی۔ اعرابی اور حبیبہ کی شادی کو کیوں نہ تاریخی بنا دیں۔"

"وہ کیسے؟"

"اس طرح کہ جس دن شہزادہ کی شادی شہزادی ثروت سے پاکستان میں ہو اسی تاریخ کو ہم اعرابی اور حبیبہ کی شادی یہاں کریں"

اعرابی تو اس تجویز پہ خاموش رہا لیکن سارہ نے اس خیال کو بہت پسند کیا۔ بلکہ اس نے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اعرابی کے پاس صرف آٹھ دن ہیں۔ اعرابی کو حیفہ پہنچ کر واپس لوٹنا ہوگا۔"

"آٹھ دن" اعرابی نے دوہرایا۔

"ہاں۔ آٹھ دن، آٹھ دن کے اندر اندر تمہیں واپس لوٹ آنا چاہیئے تمہارا کام بہت مشکل ہے لیکن مجھے امید ہے کہ تم شاہی برات کی روانگی سے پہلے یہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"یعنی ۲۷ اگست سے پہلے۔"

"ہاں۔ کوشش کرنا۔"

اعرابی نے اثبات میں سر ہلایا اور احمد اور سارہ نے دعائیں دے کر اسے الوداع کیا۔

اعرابی کے چلے جانے کے بعد احمد نے سارہ سے کہا۔

"کچھ ہمارا بھی خیال کیا کرو۔ دوسروں کے لئے تو ہر وقت پریشان رہتی ہو۔"

"آپ کو کیا چاہیئے۔ یہ بے خیالی کا الزام کیسے دے دیا" سارہ نے کہا۔

"دیکھو، ہمارے قریب بیٹھو۔ کوئی اپنی بات کرو۔ میری بات سنو۔"

"خیریت تو ہے بڑی سنجیدگی سے باتیں کر رہے ہیں۔" سارہ نے قریب ہوتے ہوئے کہا۔

"نہیں سارہ۔ میری آنکھوں پر کچھ بوجھ سا پڑتا ہے۔ میں زیادہ دیر تک بیٹھ کر لکھ نہیں سکتا۔" احمد نے کہا۔

"مجھے لکھوا دیا ہوتا. میں کس لئے ہوں۔" سارہ نے اور زیادہ قریب ہو کر کہا۔

"اسی لئے تو میں کہہ رہا ہوں کہ کچھ ہمارا بھی خیال کیا کرو۔"

سارہ نے احمد کا ہاتھ تھام لیا اور اسے صوفہ پر بٹھا دیا۔ خود اس کے قریب بیٹھ گئی۔ احمد نے اپنا سر سارہ کی گود میں گرا دیا۔ سارہ آہستہ آہستہ احمد کی پیشانی کو دبانے لگی۔

احمد نے کہا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ عدالت عالیہ سے اجازت لے کر وکالت بھی شروع کر دوں۔ الثورة الفلسطینیہ کا کام ے سپرد کر دوں۔ یا سرعرفات سے کہہ کر اعراقی کو تمہارا مددگار مقرر کروا دوں۔"

"کیوں۔ ایک رسالہ کی ادارت سے وکالت کیا آسان ہے؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ بعض اوقات اسرائیلی حکومت ہمارے کئی مجاہدین کے کارناموں کی غلط تشہیر کے لئے ان پر مقدمات بھی چلاتی ہے۔ انہیں صفائی کا موقع بھی دیتی ہے۔ لیکن حالات ایسے ہوتے ہیں کہ وہ صفائی پیش نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ عربوں کو غلط مقدمات میں الجھالیا جاتا ہے میں ایسے لوگوں کے لئے الفتح کا وکیل صفائی بننا چاہتا ہوں۔"

سارہ اس کا سر دباتی رہی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتی رہی اسے احمد کے خیال سے اتفاق تھا۔ لیکن اس نے احمد کے کان میں کچھ کہا۔

احمد نے اپنے بازو سارہ کی گردن کے گرد ڈال دیئے اور سرگوشی کے

انداز میں کہا۔

"سچ! ذرا سنوں تو!"

اس نے سارہ کے پیٹ سے اپنا کان لگا دیا۔

سارہ نے ہاں میں سر ہلایا اور ساتھ ہی شرما کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور پھر چند لمحے توقف کے بعد اس نے احمد کا سر اپنی گود سے سرکا کر صوفہ پر رکھ دیا۔ اور خود اٹھ کر باہر نکل گئی۔

احمد سوچنے لگا۔

باپ بننا۔ ماں بننا۔ کتنی بڑی سعادت ہوتی ہے۔ اپنا ہی گوشت پوست نئے رنگ و روپ میں چلتا پھرتا نظر آتا ہے۔ زندگی نئے انداز سے جھومنے لگتی ہے۔ وہ مستقبل کے تصورات میں کھو گیا۔

اس نے دیکھا کہ اس کا ننھا بچہ صحن میں کھیل رہا ہے۔ سارہ اسے پکڑ کر نہلاتی ہے۔ دھلاتی ہے۔ وہ شور مچاتا ہے۔ پھر ماں اسے چمکارتی ہے۔ اپنی انگلی سے شہد لگا لگا کر اس کے ننھے ننھے ہونٹوں پر رکھ دیتی ہے اور وہ چوس لیتا ہے۔ اچانک فضا میں طیاروں کی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ گولے پھٹنے لگتے ہیں۔ دھماکوں سے در و دیوار لرز اٹھتے ہیں۔ ایک کرچ سی اڑتی ہوئی آتی ہے اور ننھے کو آ لگتی ہے۔ خون کا فوارہ ابل پڑتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہر سمت تاریکی چھا گئی ہے۔

اپنے سر کو جھٹکتا ہوا احمد صوفہ سے اٹھ بیٹھا۔ اسے اونگھ آ گئی تھی اور اس اونگھ میں اس کا بچہ گم ہو گیا تھا۔ اپنے گرد و پیش کو سالم و ثابت پا کر اس نے

سوچا۔

ان بچوں کی کیا زندگی ہے جو کیمپوں میں پل رہے ہیں۔ جو دودھ اور شہد کی چند بوندوں کو ترس رہے ہیں۔ فاقہ کشی سے ان کی ماؤں کے سینے سوکھ گئے ہیں اور باپوں کی ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ فلسطین کی اولاد دربدر ہو رہی ہے اور پھر بھی ان کا مستقبل محفوظ نہیں۔ گولوں، دھماکوں کا شور ان کو چین نہیں لینے دیتا۔ اڑتی ہوئی کرچوں سے ان کے جسم زخمی ہو جاتے ہیں اور بہتا ہوا خون دیکھ کر کس کا دل ہو گا جو چھلنی نہ ہو جاتا ہو گا۔ ہمیں اس صورت حال کو ختم کرنا ہو گا۔ اسرائیل کی کارروائیوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے سے ہی ان بچوں کا آنے والا دور بہتر ہو سکتا ہے۔

دوسرے ہی دن اسے اپنے ان ارادوں کی تکمیل ہوتی نظر آئی۔ الفتح نے فیصلہ کیا کہ اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کو روکنے کا اب صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے کہ جس طرح الکرامہ اور السلت کی شہری آبادی پر اسرائیلی افواج نے حملہ کر کے قتل و غارت کا بازار گرم کیا ہے اسی طرح اب الفتح بھی افواج کے شہری اڈوں اور اسرائیلی خفیہ سروس کے شہروں کے اندر واقع مراکز پر حملے کرے گی اور یہ کارروائیاں اتنی شدت سے کی جائیں گی کہ اسرائیلیوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملے گا۔

احمد کی نظروں میں پھر وہ بچے گھوم گئے جو یافا کی ناکہ بندی میں بھوک کا شکار ہو رہے ہیں۔ اور اپنی ماؤں کے سامنے دم توڑ رہے ہیں۔ بھوکی ماں کی آنکھوں میں آنسو بھی نہیں کہ مرتے ہوئے بچے کی زبان پر نمکین آنسو ہی رکھ دے

ویٹ نام کے ان بچوں کی تصاویر گھوم گئیں جو دلدلوں اور سرکنڈوں کی جھاڑیوں میں امریکی جارحیت کا شکار ہوئے پڑے تھے۔ جن میں سے کئی دم توڑ گئے اور کچھ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے۔

عرب خاندانوں کے ان بچوں کی یاد آئی جن کی زندگیاں کیمپوں میں کٹ رہی تھیں اور متواتر حملوں سے ان کی زندگیوں میں خطرات ہی خطرات تھے۔ ہر وقت دہشت کا عالم طاری رہتا تھا۔ اسرائیلی بچوں کا اس میں کیا قصور تھا۔ الفتح کے اس فیصلہ میں اسے خامی نظر آنے لگی۔ اور اسے اطمینان ہوا جب اسے ٹیلیفون پر اطلاع دی گئی کہ الفتح کے اس فیصلہ کو کہ اسرائیلی شہروں پر چھاپے مارے جائیں گے ہائی کمان نے پسند نہیں کیا۔ مگر دوسرے ہی لمحہ اسے خیال گزرا کہ اصلاح و تادیب کا یہ نظریہ بہت پرانا ہے کہ جب کوئی آپ کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا پیش کر دیا جائے۔ اس سے تو حملہ آور کی نفسانیت کو تسکین ہو گی۔ ہونا یہ چاہیئے کہ اسے اس کی جارحیت کا مزا چکھانے کے لئے ایسی سزا دی جائے کہ دوبارہ اسے ایسے جرم کے ارتکاب کی جرأت نہ ہو سکے۔ اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں۔

ان یہودیوں کو جنگ کی ہولناکیوں، تباہیوں کا احساس صرف اسی وقت ہو گا جب ان کے گھروں کے اندر وہی سماں پیدا ہو جائے جو یروشلم کے مسلمان محلوں میں یہودی دہشت پسندوں نے کیا ہے۔ یا آگ لگانے والے بموں سے پر امن عرب شہریوں کے جل جانے والے بچوں کے زخم ان کے بچوں کے جسموں سے جا چپکیں گے۔ یہ سب کچھ گھناؤنا تھا۔ لیکن اس کے

گھر میں آنے والے بچے نے اس کی سوچ کا رخ بدل دیا تھا۔

اعراقی اسرائیلی سرحد پار کرنے کے لئے دریائے اردن کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اور الفتح کے فدائیوں کے مختصر دستہ کا مہمان تھا۔ اسے رات کے اس وقت کا انتظار تھا جب وہ خاموشی سے سرحد پار کر سکے اور دوسری طرف اسرائیلی فوجی دستوں کو وہ یہ باور کرا سکے کہ بڑی مشکل سے اردنی فوج کے گشتی دستوں اور الفتح کے رضاکاروں سے چھپ چھپا کر اس نے سرحد پار کی ہے اور اسرائیلی مملکت کی حمایت کے لئے اس نے جان ہتھیلی پر رکھی ہوئی ہے۔ جب سرحد پار کرنے کا وقت مناسب معلوم ہوا تو اعراقی اپنا شناختی کارڈ محفوظ کر کے دریا میں اتر گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو کہا کہ وہ ادھر ادھر گولیاں بھی چلائیں تاکہ یہ تاثر اور زیادہ واضح ہو جائے کہ وہ واقعی بھاگ کر ہی اسرائیلی علاقہ میں داخل ہوا ہے۔

گولیوں کی آواز سن کر دوسری طرف اسرائیلی سپاہی چوکنے ہو گئے۔ اس نے دریا میں سے ہی چلا کر عبرانی زبان میں کہا۔

"مدد۔ مدد۔ فدائی میرا تعاقب کر رہے ہیں"

اسرائیلی سپاہی اکٹھے ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور جب وہ کنارے پہ پہنچا تو انہوں نے اعراقی کو گھیر لیا۔ اعراقی نے تحکمانہ انداز میں ان کو پیچھے ہٹ جانے کو کہا اور بتایا کہ وہ کون ہے۔

سپاہیوں کے جلو میں جب وہ اسرائیلی دستہ کے کمانڈر کے خیمہ میں پہنچا تو اس نے ایک بار پھر کمانڈر کو اپنا نام عہدہ اور پتہ بتایا۔ لیکن کمانڈر

کی سرد مہری سے اسے اندازہ ہوا کہ کمانڈر اس کی باتوں پہ یقین نہیں کر رہا۔ اس نے اپنا شناختی کارڈ اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں سے نکال کمانڈر کو دکھایا۔ تو کمانڈر کا رویہ یکا یک بدل گیا۔ اس نے خشک پھلوں سے اعرابی کی تواضع کی اور منزل مقصود کے متعلق پوچھا۔

اعرابی نے بتایا کہ وہ جلد از جلد تل ابیب پہنچنا چاہتا ہے۔ اور اگر اسے کسی جیپ پر مقبوضہ علاقہ سے نکال کر تل ابیب کو ملانے والی کسی شاہراہ پر چھوڑ دیا جائے تو وہ کوئی سواری کا انتظام کرلے گا۔ کوئی فوجی ٹرک وغیرہ ہی مل جائے گا۔ کمانڈر نے فوراً جیپ کا انتظام کیا۔

اعرابی ان راستوں کو بخوبی جانتا تھا جن پر جیپ دوڑ رہی تھی۔ تاہم اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

"ہم کس علاقہ سے گزر رہے ہیں۔ اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آتا۔"

"یہ وہ علاقہ ہے جو ہم نے اردن سے چھینا ہے اور اس علاقہ میں عرب چھاپہ ماروں کی کارروائیاں تیز تر ہیں۔ آپ کو بڑا چوکنا رہنا چاہیئے۔"

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ وہ علاقہ ہے جو ہم نے فتح کیا ہے۔ لیکن اس علاقہ کا نام کیا ہے۔ اس کی خصوصیات کیا ہیں؟"

"علاقہ کا نام اردن ہے صاحب۔ اور یہ دیہات۔ ان کے مختلف نام ہیں۔ ابدالحمید، رافلہ، شعبہ، قنطور، وغیرہ وغیرہ ہیں۔ لیکن اب ان کے عربی ناموں کی بجائے عبرانی نام تجویز کئے جا رہے ہیں۔"

"یہ تو ناممکن ہے۔ جب تک حتمی طور پر اسرائیل کی حد بندی نہیں ہو جاتی

ان دیہات کی حالت وہی رہے گی جو ہمارے قبضہ سے پہلے تھی"۔

"لیکن صاحب۔ یہاں کی آبادی کو تو ادھر دھکیلا جا رہا ہے اور یہودی لوگوں کو ایشیا اور افریقہ سے بلا کر یہاں آباد کیا جا رہا ہے"۔

"تمہیں اس پر اعتراض ہے"؟ اعرافی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔ مجھے اعتراض ہے۔ میں بھی ان ہی گاؤں میں کھیلا ہوں۔۔ مجھے بھی فلسطینی لوگوں کی حالت زار پر ترس آتا ہے۔۔ مجھے اسرائیل سے کوئی ہمدردی نہیں"۔

"بکواس بند کرو۔ تم نہیں جانتے کہ تم ایک فوجی افسر سے بات کر رہے ہو"۔ اعرافی نے ڈرائیور کا ردعمل دیکھنے کے لئے کہا۔

"میں جانتا ہوں۔ آپ بھی اسرائیلیوں کے خلاف ہیں۔ الفتح کے لئے کام کر رہے ہیں۔ آپ کا نام اعرافی ہے"۔

ڈرائیور کی بات سننی تھی کہ اعرافی کا رنگ بدل گیا۔ اس نے چھوٹا سا جرمنی کا ساختہ پستول اپنی بغل میں لٹکتی ہوئی پیٹی سے نکالا اور ڈرائیور کو کہا۔

"گاڑی روکو"۔

ساتھ ہی اس نے پستول اس کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

"اعرافی صاحب! پستول سے دھمکانے کا یہ وقت نہیں ہے۔ اس کی آواز اور میری چیخ آپ کا سارا کام ادھورا کر دے گی۔ میں آپ کی جگہ پر بیٹھ جاتا ہوں۔ آپ خود گاڑی چلا لیں"۔ اتنا کہہ کر ڈرائیور نے گاڑی بند کر دی اور اندر فی

روشنی جلائی۔

حیرت سے اعرافی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

ڈرائیور کی نشست پر سلمان غنی کے سوا اور کوئی نہیں تھا اور سلمان غنی کے چہرہ پہ سکون ہی سکون تھا۔

"آپ ...... " اعرافی نے کہا۔

"ہاں، میں ابھی تک یہیں پہنچ سکا ہوں۔"

"یہ جیپ ــــ فوجی دستہ ــــ یہودی ــــ" اعرافی سے بات نہیں بن رہی تھی۔

"ہاں یہ جیپ میرے اس فوجی دوست کی ہے جو اسرائیلی فوج کے اس دستہ میں ہے جس نے تمہیں دریا کے کنارے سے کمانڈر کے روبرو پیش کیا تھا۔ اس نے جیپ مجھے دے دی ہے اور کل صبح تک وہ سرحد کے اس پار چلا جائے گا اور کل شام اس کیمپ کی جگہ خاک اڑتی ہوگی۔ ہم رات بھر اس جیپ پر جتنا سفر کر سکتے ہیں کریں گے اور صبح اسے سڑک کے کنارے چھوڑ کر ٹائم بم رکھ دیں گے۔ تم اپنی منزل کی طرف چل دینا اور میں یروشلم پہنچنے کی کوشش کروں گا۔"

اعرافی چلتی ہوئی جیپ کی روشنی میں کچے راستہ کو دیکھتا رہا اور سلمان غنی کی شخصیت کے متعلق سوچتا رہا۔ وہ ہر ایک موقع پر دوسری مخلوق معلوم ہوتا تھا لیکن وہ ہر رنگ و روپ میں الفتح کا کارکن تھا۔

اعرافی اور سلمان غنی باری باری گاڑی چلاتے رہے۔ وہ جرنیلی سڑک

پر آ گئے۔ پٹرول ختم ہو رہا تھا۔ ابھی رات کافی باقی تھی۔ انہیں کسی پٹرول پمپ کی تلاش تھی۔ لیکن کافی چلنے کے بعد بھی انہیں پٹرول پمپ نظر نہ آیا۔ ایک انجانے مقام پر اسرائیلی فوجی سپاہیوں نے گاڑی کو ہاتھ کے اشارہ سے روکا۔ سلمان غنی نے اعرافی سے کہا۔

"صورت حال سے تم نے نپٹنا ہوگا"

"فکر نہ کریں"

گاڑی رکتے ہی ایک سپاہی نے اندر جھانکا۔

"شناخت کرائیے"

سلمان غنی خاموش رہے۔ اعرافی نے انگریزی میں کہا۔

"دیکھتے نہیں۔ میں بیٹھا ہوں۔ ضروری مشن پر جا رہے ہیں"

ساتھ ہی اعرافی نے اپنا شناختی کارڈ سپاہی کو دکھایا۔ ٹارچ کی روشنی میں نظر ڈالتے ہوئے سپاہی نے کہا۔

"او۔ کے"

"لیکن ٹھہرو" اعرافی نے کہا۔

"کہیے جناب"

"ہمیں کوئی پٹرول پمپ نہیں ملا۔ ہمیں پٹرول چاہیئے۔ میرا کارڈ درج کرلو اور پٹرول مہیا کردو"

"بہت اچھا جناب"

سپاہی اپنے افسر کے پاس گیا۔ افسر سو رہا تھا۔ گھبرایا ہوا آیا اور سپاہی

سے گرجتے ہوئے کہا۔

"تم نے اتنی دیر کیوں لگائی ــــــ صاحب کو جلدی سے پٹرول لادو۔"

اعراقی نے تحکمانہ لہجہ میں سلمان غنی سے کہا۔

"ڈرائیور جاؤ سپاہی کے ساتھ تم بھی پٹرول اٹھالاؤ۔"

تھوڑی دیر بعد پٹرول کے ڈبے آگئے اور جیپ میں ڈال دیئے گئے۔ سپاہی اور اس کے افسر کو شاباش دیتے ہوئے اعراقی نے انہیں "گڈ لک" کہا۔

سلمان غنی ہنسے۔

"بیڈ لک کہو ــ پٹرول کے ذخیرہ میں ٹائم بم رکھ آیا ہوں جو تین گھنٹے بعد اس وقت پھٹے گا جب سپیدۂ سحر نمودار ہونے والا ہوگا۔"

"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ تین گھنٹے بعد ہم پکڑے جا سکتے ہیں۔ ہمارے سوا کسی اور پہ شک نہیں کیا جائے گا۔"

"تو کیا ہوگا۔ تمہارا یا میرا نام تو کسی نے لکھا نہیں۔ میں ایک اچھے موقع کو کھودینا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ہمارا مشن ہی یہی ہے۔"

جیپ دوڑتی رہی اور بالآخر بجلی کے ایک گرڈ اسٹیشن کے قریب انہوں نے زور سے بریکیں لگا کر گاڑی کو کھڑا کیا۔

ڈیوٹی پر موجود ایک چوکیدار دوڑتا ہوا آیا۔ گرڈ سٹیشن کے اردگرد دور تک روشنیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ موٹے موٹے تاروں اور ٹرانسفارمروں سے

ان منصوبوں کی بو آتی تھی جو عظیم تر اسرائیل سے متعلق تھے۔
سلمان غنی نے کہا۔
" دیکھو چوکیدار اپنے صاحب کو بلاؤ۔ ہماری گاڑی خراب ہو گئی ہے اور ہم نے سرکاری کام کے لئے ابھی یروشلم پہنچنا ہے۔ اور تمہارے صاحب سے خاص بات بھی کرنی ہے۔"
سپاہی اعرافی کی فوجی وردی دیکھ کر چپکے سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی گرڈ سٹیشن کا ریذیڈنٹ انجینئر آ گیا۔
رسمی علیک کے بعد اعرافی نے انجینئر کو کہا۔
" آپ یہ ساری روشنیاں گل کر دیجئے۔ اور خود محفوظ مقام پر چلے جائیے صبح تک یہاں عرب چھاپہ ماروں کے حملہ کا خطرہ ہے اور ہمیں ایک گاڑی دیجئے۔ جو ہمیں جلدی جلدی کسی قریبی فوجی ہیڈ کوارٹر تک پہنچا سکے تاکہ حملہ کا انسداد کیا جائے۔"
انجینئر کچھ تذبذب میں پڑ گیا۔ اعرافی نے جلدی سے اپنا شناختی کارڈ دکھایا۔ انجینئر کا کارڈ دیکھنا تھا کہ اس نے چوکیدار کو فوری طور پر تمام روشنیاں گل کرنے کو کہہ دیا۔ خود اس نے دیگر اہل کاروں کو نیند سے جگایا۔ اور چند ہی منٹ میں وہ گرڈ اسٹیشن سے دور چلے گئے۔ ان کے سفر کے لئے ایک پک اپ مہیا کر دی گئی۔
اعرافی اور سلمان غنی کے علاوہ پک اپ کے ڈرائیور نے جیپ کو دھکا لگا کر حفاظتی باڑ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق اعرافی اور

ڈرائیور پک اپ میں آکر بیٹھ گئے اور سلمان غنی جیپ سے ضروری کاغذات نکالنے کے لئے رک گیا۔ اس نے جلدی سے تاروں سے بندھے ہوئے بارودی گولے ٹرانسفارمروں اور تاروں پر پھینکے۔ جیپ کے اندر ہی ٹائم بم رکھ کر تاروں کا جوڑ ان سے ملا دیا۔ بم کے پھٹنے کے ساتھ ہی ایک چھوٹے سے میگنٹ نے ایک شعلہ پیدا کرنا تھا اور اس شعلہ کا ردعمل ان گولوں کے پھٹنے سے ظاہر ہونا تھا۔ جو تاروں کے سرے سے بندھے تھے۔ آدھ گھنٹہ کے وقفہ پر بم کو ٹک ٹک کرتے چھوڑ کر وہ پک اپ میں آبیٹھا اور دھیمی روشنی میں پک اپ سڑک پر دوڑنے لگی۔ اسی سڑک پر گرڈ سٹیشن کے ملازم تیز رفتاری سے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

پندرہ منٹ چلنے کے بعد سلمان غنی نے ڈرائیور کو گاڑی روکنے کو کو کہا۔ گاڑی رک گئی تو اعرابی نے پوچھا۔

"فوجی کیمپ کتنی دور ہوگا بھلا؟"

"کوئی زیادہ دور نہیں۔ چند ہی منٹوں میں ہم ریلوے لائن عبور کریں گے اور اس کے آگے کیمپ ہے۔ یہ ریلوے لائن یروشلم کو جاتی ہے۔"

"آتی کدھر سے ہے؟"

"حیفہ، شفاامر اور فراتہ کو ملانے والی ریل کو اب حکومت نے طوباس سے ملا دیا ہے۔ نبلیس، سلفیت، ایت طیبہ اور جرلیشو سے ہوتی ہوئی یہ یروشلم پہنچتی ہے۔"

"ہم کہاں ہیں؟" سلمان غنی نے پوچھا۔

"ہم طوباس کے قریب پہنچ رہے ہیں" اعرافی نے بتایا۔
"ڈرائیور" سلمان غنی نے کہا۔ "تم اب ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے"
"مگر گاڑی" ڈرائیور نے پوچھا۔
"گاڑی پہنچ جائے گی" اعرافی نے تحکمانہ انداز سے کہا۔
ڈرائیور خاموش ہو گیا۔ اسی لمحہ دور گرڈ سٹیشن پر روشنی پھیل گئی۔ دھماکے ہوئے اور ڈرائیور روشن افق کو دیکھنے لگا۔
اعرافی نے گاڑی سٹارٹ کر دی اور ڈرائیور کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ بغیر کسی رکاوٹ کے وہ طوباس کے قریب پہنچ گئے۔
سلمان غنی نے کہا۔
"اب ہمارے بچھڑنے کا مقام آ گیا ہے۔ میں طوباس سے ریل کے ذریعہ یروشلم جاؤں گا۔ تم چاہو تو گاڑی لے جا سکتے ہو یا پھر جس طرح تم مناسب خیال کرو"
"میں سید صاحیفہ جانے کی بجائے پہلے الفہم جاؤں گا۔ وہاں اپنے دوست داؤد کی بہن شمامہ کی تلاش کروں گا۔ وہاں بھی ایک ایسا کیمپ ہے۔ اگر وہاں کامیابی نہ ہوئی تو نبیامین سے مجھے صحیح اطلاع مل جائے گی۔ گاڑی کو اب چھوڑ دینا چاہیئے" اعرافی نے کہا۔
"یوں نہیں۔ اسے کسی ایسی جگہ کھڑا کیا جائے جہاں یہ دو چار اور گاڑیوں کو بھی لے ڈوبے"
اعرافی نے اثبات میں سر ہلایا۔

سحر قریب تھی۔ انہوں نے بسوں کا ایک اڈا تلاش کیا۔ وہاں دوسری گاڑیوں کے درمیان پک اپ کو کھڑا کر کے دو گھنٹے کے وقفہ پر ٹائم بم انجن کے اندر رکھا اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر الگ ہو گئے۔

تیسرے روز اعرابی نے الفہم میں اور سلمان غنی نے یروشلم میں اپنے جملہ منصوبوں کی کامیابی کی خبریں اسرائیلی اخبارات میں پڑھیں اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی پڑھا کہ اسرائیلی حکومت نے دہشت پسندوں کی گرفتاری کے لئے بہت سی جگہوں پر چھاپے مارے ہیں اور کئی عربوں کو شبہ میں گرفتار کر لیا ہے۔ مقبوضہ علاقوں میں عربوں کی نقل و حرکت پر پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔

اعرابی کو اچھی طرح یاد تھا کہ اسے جلدی واپس پہنچنا ہے۔ وہاں اس کی باجی نے اس کی تقدیر بنا رکھی ہوگی۔ لبنان اور اسرائیل کے اخبارات نے اردن کے ولیعہد شہزادہ حسن کی پاکستانی لڑکی سے شادی کو بہت اچھالا تھا۔ تبصروں میں اسے عرب نیشنلزم کے خلاف قرار دیا تھا۔ اعرابی خوش تھا کہ عرب نیشنلزم کے بندھن توڑ کر عرب اسلام کے رشتوں کو زیادہ استوار کر رہے ہیں۔

سارہ نے امتہ الحبیب کو بتا دیا تھا کہ اس کا ارادہ کیا ہے۔ امتہ الحبیب کے سر جھکانے کا انداز ایسا تھا کہ اس نے سارہ کے فیصلہ کو تسلیم کر لیا ہے۔ سارہ کو جب بھی موقع ملتا احمد سے اعرابی کی واپسی کے متعلق پوچھتی۔ لیکن ابھی تک اس کی طرف سے کسی قسم کی اطلاع نہیں ملی تھی۔

شاہی برات پاکستان روانہ ہو چکی تھی۔ اور اگلے ہی دن شادی ہونے والی تھی۔ اسی روز اسرائیلی افواج نے اردن کی سرحد کے اندر کئی سکولوں اور شفاخانوں پہ گولہ باری کی۔ اور پھر وسیع پیمانے پہ سرحد پہ اسرائیلی افواج کی نقل و حرکت شروع ہو گئی۔

احمد نے صاف صاف سارہ کو بتا دیا کہ حالات ایسے ہو گئے ہیں کہ اعراف کا لوٹنا مشکل ہے۔ شادی کی تقریب ملتوی کرنا ہو گی۔

ایسا ہی ہوا۔ شاہی برات واپس آ گئی۔ اردن کی سرحدوں پہ پڑی ہوئی بے پناہ فوج کے سبب حالات کا رخ بدلتا گیا۔

اعراف تو ویسے ہی الفہم رک گیا تھا۔

احمد اور سارہ کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ اس کی وجہ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات تھے۔ اطلاعات آرہی تھیں کہ اسرائیل وسیع پیمانے پر عرب ممالک پہ ایک اور حملے کا منصوبہ بنا رہا ہے، تاکہ وہ قاہرہ کو قبضہ میں لے کر متحدہ عرب جمہوریہ سے سویز کے بارے میں ہر بات منوا سکے۔ حریت پسندوں کی کارروائیوں کو روکنے کے لئے دیگر ممالک میں موثر اقدامات کر سکے۔ اردن کی سرحد کے علاوہ شام کی سرحد اور مصر کے مقبوضہ علاقوں میں بھی اسرائیلی فوجیں مورچہ سنبھال کر بیٹھ گئی تھیں۔

جنرل اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا۔ تمام ممالک کے مندوبین نے اعلان کیا کہ آزادئ فلسطین کی تحریک اور چھاپہ مار عرب جوانوں یعنی الفتح کو ان کا مکمل تعاون حاصل رہے گا۔ اس اجلاس میں متحدہ عرب جمہوریہ کے متعلق شکوک و شبہات کی فضا قائم رہی۔ صدر ناصر کی نیت پر شک کیا گیا کہ وہ دوسرے جملہ

عرب ممالک کے مفاد کا خیال کئے بغیر اپنے مفاد کی خاطر گہری چالیں چل رہے ہیں۔ اس کے باوجود اجلاس کی ہر قرارداد سے متحدہ عرب جمہوریہ نے اتفاق کیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ اردن براہ راست اسرائیل کی زد میں ہے۔ اس لئے جملہ عرب ممالک اردن کو فوج مہیا کریں گے۔

ان خبروں کے آنے سے پہلے ہی مجاہدین کے حملوں میں شدت آچکی تھی اور ان کی کارگزاریوں کو مرتب کرنا ایک دشوار مرحلہ بن گیا تھا۔ پھر بھی دونوں میاں بیوی کام میں مگن تھے۔

احمد نے ہائی کمان کو بھیجنے والی رپورٹ لکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارے لئے یہ مشکل ہو گیا ہے کہ ہم کسی خاص مجاہد کی خاص کارگزاری کی رپورٹ مرتب کریں۔ لیکن گزشتہ دو ہفتوں میں جو کچھ ہوا ہے اس سے اسرائیل کی حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا ہے اور وہ حیران ہیں کہ پولیس، افواج اور یہودی تنظیموں کی موجودگی میں عرب چھاپہ مار کیسے کارروائی کر جاتے ہیں۔

آج کے حالات لکھنے سے پیشتر گزشتہ دو ہفتوں کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

ان دو ہفتوں میں وادیٔ بیسان کی مضبوط اسرائیلی چوکی اشدوت یعقوب کو تباہ کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی وقفہ بعد مادزہیم کی چوکی کا بھی وہی حشر ہوا، ایک ٹینک، ایک فوجی گاڑی، اور بیس اسرائیلی سپاہی نیست و نابود ہو گئے۔ ان کامیاب حملوں کے اگلے روز ہی المنار، کوہ موسیٰ اور قم الوط کی مضبوط چوکیاں اور تازہ دم اسرائیلی فوج الفتح کے مجاہدین کا نشانہ بنیں۔ اسرائیلی بھاری نقصان

اٹھا کر بھاگ نکلے۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نتدہ کی چوکی، وادیٔ خالد اور مساوہ کی چوکیاں، راس الحمراء کو جانے والی تیل کی لائن، کرناب اور شیبا کے درمیان ریل اور پل غزہ اور خان یونس کی ریلوے لائن کے علاوہ مختلف فوجی ریسٹ ہاؤس، فوجی گاڑیوں کے ڈپو، پٹرول اسٹیشن تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ ایک ہیلی کوپٹر بھی گرایا گیا۔

ستمبر کے اولین ہفتہ میں مجاہدین نے تل ابیب کے ایک بس سٹیشن، سینما، اور ایک فیکٹری کو اڑا کر رکھ دیا ہے۔ چار ستمبر کو تو اسرائیلی دارالحکومت میں بموں کے تین زبردست دھماکے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ہوئے۔ شہر کے در و دیوار لرزا اٹھے۔ لوگ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کئی شخص ہلاک اور مجروح ہوئے۔ اسرائیلی حکام نے تل ابیب سے باہر جانے والی تمام سڑکوں پر پہرے لگا دیئے۔ ہر گاڑی کی تلاشی لی جانے لگی۔ یہودی حکام نے بھی تسلیم کیا کہ ان دھماکوں کا تعلق عرب حریت پسندوں سے ہے۔ کیونکہ ان دھماکوں کا انداز وہی ہے جو یروشلم میں چند روز پیشتر ہونے والے دھماکوں کا تھا۔ دھماکے اتنے شدید تھے کہ پورے شہر میں سنے گئے تھے۔

احمد لکھ رہا تھا اور سارہ تازہ آئی ہوئی ڈاک کھول رہی تھی۔ اچانک احمد کو سارہ کی دبی سی چیخ سنائی دی۔

احمد حیران رہ گیا۔

اس نے پلٹ کر دیکھا تو سارہ کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کے سامنے

ایک ایسا خط پڑا تھا جو شہادت کی انگلی سے، انگلی لہو میں ڈبو کر لکھا گیا تھا۔ اور یہ خط لبنان کی راہ آیا تھا۔

حیرانگی کی بات تھی کہ اس خط نے اپنا سفر بڑی عجلت سے طے کیا تھا یعنی صرف چھ دن میں وہ اسرائیل سے لبنان میں ایک شخص جعفر کو پہنچا۔ اور وہاں سے قاہرہ اور پھر وہاں سے اسی پر الثورۃ الفلسطینیہ کا درست پتہ لکھ گیا تھا۔ خیر یہ تو الفتح کے مراکز اور دیگر دفاتر کا طریق کار تھا۔ براہ راست ڈاک منگوانے میں تو ویسے ہی خطرات تھے۔

خط پہ کوئی القاب و آداب نہیں تھا۔ صرف لکھا تھا۔

" اعرابی کو بتا دیا جائے کہ ذکیہ ہرزیلیہ میں ہے۔ وہ گرفتار ہو چکی ہے۔ اور ڈاکٹر دون اس پہ ذہن کو پراگندہ کرنے کے تجربات کر رہا ہے۔ اگر یہ خط مل جائے تو یروشلم میں ادارۂ سیاحت کے ڈرائیور ڈیوڈ سے رابطہ قائم کیا جائے۔ میں اب اسی کی حفاظت میں ہوں۔ لیکن شاید میں رات کسی وقت اپنے خالق حقیقی سے جا ملوں۔ میں شدید زخمی ہوں "

فدائی ـــــ سلمان غنی

سلمان غنی کا نام پڑھتے ہی احمد کا رنگ بھی زرد ہو گیا۔ اس نے بھی اسے ایک روز ایک یہودی لڑکی کے کہنے پہ قتل کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اللہ نے اسے اس قبیح فعل سے بچا لیا اور اب سلیمان غنی جانے کیسے تھے۔ اس تحریر پہ کوئی تاریخ بھی نہیں تھی۔ البتہ لفافہ کی مہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ چھ یوم پہلے یہ یروشلم سے چلا تھا۔

احمد نے سارہ کو پانی کا گلاس پلایا اور تسلی دی کہ ہو سکتا ہے ان کے دشمنوں نے محض پریشان کرنے کے لئے ایسا کیا ہو۔

"نہیں۔ اگر کسی دشمن کی شرارت ہوتی تو اسے جعفر کا پتہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ ضرور کوئی بات ہے۔" وہ روتی اور سسکیاں بھرتی کہتی رہی۔

"شاید یہ تحریر بھی سلمان غنی کی نہ ہو۔"

سارہ بھی شک میں پڑ گئی۔

طلحہ اور مجتبیٰ حامد اس خط پر کچھ روشنی ڈال سکتے تھے۔ وہ دونوں جلدی میں وہاں پہنچے۔

مجتبیٰ حامد تو حسب معمول گھر پر نہیں تھے۔ طلحہ تو خط دیکھتے ہی سن سی ہو گئی۔ اس نے کہا۔

"احمد، شاید یہ دستخط اس کے نہ ہوں۔ وہ زندہ ہو۔ لیکن میرا دل جانے اس خبر کو پڑھ کر کیوں بیٹھ رہا ہے؟"

احمد بڑا حیران تھا۔ سارہ کی چیخ اور طلحہ باجی کے دل کا بیٹھنا کچھ ایسی باتیں نہیں جو بڑی منفی انداز کی تھیں۔

تاہم اس نے بڑے بھا بچے سے مل کر مجتبیٰ حامد کی الماری سے ایک ایسا خط تلاش کر لیا جو سلمان غنی نے دو سال قبل قاہرہ سے بھیجا تھا۔ دستخط ملتے تھے۔ صرف اتنا فرق تھا وہ سیاہی سے کئے گئے تھے اور قلم سے۔ یہ خون سے کئے گئے تھے۔ اور انگلی سے۔

ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ مگر اس کے باوجود جب وہ واپس گھر آیا تو سارہ کو کہہ رہا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آتا۔ داؤد اس کے پاس تھا۔ شاید وہ اسے اپنے ہاں لے گیا ہو، ڈاکٹر مل گیا ہو اور اللہ نے کرم کر دیا ہو۔"

واقعی ایسا ہو سکتا تھا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" سارہ نے کہا۔ "مجھے تو یہ ڈیوڈ جسے آپ داؤد کہہ رہے ہیں وہی لگتا ہے جس نے پہلے بھی ایک چٹھی لکھی تھی اور اعرانی نے اس کے متعلق بتایا بھی تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔ شمامہ کا بھائی۔ یقیناً وہی ہے۔ مگر اس نے لکھا تھا کہ ذکیہ حیفہ میں ہے۔ اور حیفہ کو ہی منزل بنا کر اعرانی یہاں سے گیا ہے۔" سارہ نے کہا۔

وہ سوچتے رہے۔ لیکن ان کے ذہن کوئی فیصلہ نہ کر سکے۔

کوہستان جولان میں اسرائیلی فوج شام کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرنے پہ مائل تھی۔ اردنی اور شامی فوجوں سے اسرائیلی جھڑپیں ہوتی ہی رہتی تھیں۔ لیکن اب خطرہ زیادہ تھا۔

سرحد بالکل رک گئی تھی۔ اعرانی کو اسرائیل میں کسی قسم کی اطلاع دینا ناممکن تھی خود بھی اعرانی اپنے متعلق کوئی اطلاع نہیں دے سکا تھا۔

احمد اور سارہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے تھے۔ کہ اب کیا کیا جائے۔ سارہ نے تجویز پیش کی۔

"کیوں نہ ابوالاسرار کو لبنان کی راہ اسرائیل بھیجا جائے"
"کیا ابوالاسرار ذکیہ کو پہچانتا ہے؟"
"میرا خیال ہے نہیں"
"تو پھر اس کی بجائے وہاب کو ہی بھیجا جائے اب تک وہ صحت یاب ہو چکا ہو گا۔ میں الصلت سے اطلاع منگواتا ہوں"
"اطلاع کی بجائے اسے ہی۔ یعنی وہاب کو ہی بلا لیجئے" سارہ نے تجویز پیش کی۔
"بہتر"
اگلے روز وہاب عمان پہنچ گیا۔
اس کی صحت اب بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن پھر بھی ڈاکٹر نے اسے آرام کرنے کی تاکید کی تھی۔
وہاب کو ابھی تک احمد یا سارہ کسی نے بھی نہیں بتایا تھا کہ اسے کس غرض سے بلایا گیا ہے۔ اب بھی دونوں میاں بیوی سوچ رہے تھے کہ آیا وہاب کو بتایا جائے یا ابوالاسرار سے ہی کام لیا جائے۔ تھوڑی بحث کے بعد انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہاب کو بتا ہی دیا جائے۔
چنانچہ وہاب نے احمد سے کہا۔
"ہمیں بڑی بری خبر ملی ہے کہ سلمان غنی شدید زخمی ہو گئے ہیں"
"کہاں؟"
"یروشلم میں۔ مگر وہ شہر میں نہیں تھے۔ کسی اور جگہ تھے"

"انہوں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنے خون سے خط لکھا ہے۔ ذکیہ کا بھی ذکر کیا ہے" احمد نے کہا۔

"انہوں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ وہ شاید ہی لات پھر زندہ رہ سکیں" سارہ نے احمد کی بات کی وضاحت کی۔

وہاب کا چہرہ ملول ہو گیا۔ وہ بات سنتا رہا اور خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"ہم چاہتے ہیں کہ تم یروشلم پہنچو۔ اگر تم چاہو تو تمہارے سفر کی اجازت کے لئے ہائی کمان کو لکھا جائے" سارہ نے پوچھا۔

"راضی ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر جب سلمان غنی کی زندگی کا معاملہ ہو" وہاب نے کہا۔

"مگر ہم تمہیں سلمان غنی کے لئے نہیں ذکیہ کے لئے وہاں بھیج رہے ہیں۔ وہ ہرزیلیہ میں ہے اور کوئی دون نامی ڈاکٹر اس پر تجربات کرنا چاہتا ہے"

"دون۔ ہاں میں دون کو جانتا ہوں۔ وہ تو شیطان ہے۔ وہ جانوروں پرندوں اور انسانوں پر تشدد کا ردعمل دیکھنے کے تجربات کرتا رہتا ہے۔ ذہنی کیفیت کو بڑی بڑی مشینوں کے ذریعہ گراموں کی صورت میں ریکارڈ کرتا ہے اور مختلف نتائج مرتب کرتا رہتا ہے۔ تجربات میں جو جانور، پرندہ یا انسان مر جاتا ہے اسے خودکار نظام کے تحت بحیرہ روم کی تہہ میں پہنچا دیتا ہے۔ اور پھر اس کا نام و نشان مٹ جاتا ہے"

احمد کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں مجھے یاد آیا۔ اسی ڈاکٹر ودن کی ایک کتاب میں نے کسی زمانہ میں پڑھی تھی۔ اس کا نام بھی کچھ یہی تھا۔ 'تشدد کے نئے تجربات'، ہاں یہی نام تھا۔" سارہ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہودی خود ڈاکٹر ودن کو 'انسانی صورت میں ناگ' کہتے ہیں۔ اس کا ایک دفتر تل ابیب میں بھی ہے۔ جہاں وہ حکومت کو مفید مشوروں سے نوازتا ہے۔ ویسے اس کی تجربہ گاہ ہرزیلیہ میں ہی ہے۔"

احمد کے ذہن میں ایک دفعہ پھر وہ نازی فلنٹے ابھرے جن کی بنا پر ہٹلر کے کارندوں نے عمل کر کے جنگ ہار دی تھی۔

فرانس کا وہ قلعہ یاد آیا جہاں عورتوں کے جسموں سے آہستہ آہستہ کھال اتاری جاتی تھی۔ اور اس کے بعد جو کچھ نظر آتا تھا اسے دیواروں پر نقش کیا جاتا تھا۔ خوف و ہراس پھیلانے کے ان تجربات سے وہ نازی ذہن نشو و نما پاتا تھا جو دشمن سے جنون کی حد تک انتقام پر اتر آتا ہے۔ خالصتاً یہ لوگ ہندہ کی نسل سے تھے جس نے حضرت امیر حمزہ رضہ کا کلیجہ دانتوں تلے چبا ڈالا تھا۔

بڑی بے قراری کے انداز میں وہاب نے جانے کی اجازت چاہی۔ وہ پریشان ہو گیا تھا۔ اگر وہ وقت پر ہرزیلیہ نہ پہنچ سکا تو ذکیہ کا انجام خدا جانے کیا ہوگا۔؟

احمد اور سارہ نے اسے چند نصیحتیں کیں اور بتایا کہ وہ یروشلم میں داؤد کو کس پتہ پر مل سکتا ہے۔

جانے کو تو وہاب چلا گیا۔ لیکن جب گلی میں چلتے ہوئے سارہ نے اسے دیکھا

تو اس نے احمد سے کہا۔

- "ابھی اس کے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہاب میں ابھی وہ سکت نہیں۔" احمد نے سارہ کے خیال کی تائید کی۔

"میرا خیال ہے کہ اس کے ساتھ ابوالاسرار کو بھیج دینا چاہیئے۔ فی الحال وہ بھی کوئی کام نہیں کر رہا۔ رمیکا کو اپنے ہاں لے آتے ہیں۔

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی ابوالاسرار کے مکان پہ جاتا ہوں۔"

"میں بھی چلتی ہوں۔"

"نہیں۔ تم اب ایسا نہ کرو۔"

ساتھ ہی احمد نے سارہ کے پیٹ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ وہ مسکرائی اور خاموش ہو گئی ۔۔۔

اسرائیل پہنچنے کے اگرچہ کئی راستے تھے۔ لیکن محفوظ ترین راستہ یہی تھا کہ وہ عمان سے مفراق اور عربیہ ہوتے ہوئے دقاص کے قریب دریا کو عبور کرتے۔

ادھر اسرائیلی فوج کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ یا پھر عربیہ سے شام چلے جاتے۔ اور پھر لبنان کی راہ کنعان کی بندرگاہ سے اکری، حیفہ، ایت تیرہ، طنطورہ قیصریہ اور یدیرہ ہوتے ہوئے ہرزلیہ پہنچتے۔ لیکن یہ اتنا طویل راستہ تھا۔ کہ ہرزلیہ پہنچنے میں ایک ماہ لگ جاتا۔ نزدیک ترین اور قریب ترین راستہ یہی تھا کہ وہ الصلت کے قریب دریا عبور کرتے۔ جیریشو پہنچے۔ راملہ سے

ہوئے ہوئے ہرزیلیہ پہنچ جاتے۔ اگر کوئی رکاوٹ نہ ہوتی تو یہ راستہ دو دن سے زائد کا نہیں تھا۔

ابوالاسرار کا جوش ایمانی شامل تھا اور وہاب کے اندر ایک میٹھی آگ اس کے علاوہ تھی۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وہ الصلت کے قریب ہی سے دریا کو عبور کریں گے اور اس مقصد کے لئے ذوالقرنین سے اپنے عزم کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

" یہ بڑی معمولی بات ہے۔ ہم نے جو یہودی افسر گرفتار کر رکھے ہیں ان سے کام لیتے ہیں۔ ان میں سے ایک شن بٹ کا افسر بھی ہے۔"

وہاب کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ جس جاسوس افسر کو وہاب نے پہچان کر گرفتار کرایا تھا۔ وہ بڑا کام آسکتا تھا۔

ذوالقرنین انہیں پہاڑیوں کے درمیان ایک زیر زمین کیمپ میں لے گیا۔ وہاں وہ افسر موجود تھا۔ اس افسر نے ان کی کسی قسم کی مدد کرنے سے انکار کر دیا تو ذوالقرنین نے کہا۔

" سوچ لو۔ اگر تم ان دو آدمیوں کی ہرزیلیہ پہنچنے میں مدد کرو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں آزاد کر دیا جائے گا۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ہم جاسوسوں کو سزائے موت دینے میں بڑی عجلت بھی دکھا سکتے ہیں۔"

افسر خاموش رہا۔

جب وہ واپس لوٹنے لگے تو افسر نے کہا۔ " کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ مجھے

آزاد کر دیا جائے گا۔"

"ہاں، میں ذاتی طور پر تمہاری زندگی کا ذمہ لیتا ہوں۔"

"تم وہاں کیوں جانا چاہتے ہو۔ مجھے اپنے مشن کی تفصیل بتاؤ۔"

ذوالقرنین نے سب کچھ بتا دیا تو اس یہودی افسر نے کہا۔

"میں آپ لوگوں کو شناخت کے لئے اپنا کارڈ اور خفیہ الفاظ بتاتا ہوں۔ ان الفاظ سے تم ڈاکٹر ڈون کے تجربات کے نتائج بھی حاصل کر سکتے ہو۔ رہا لڑکی کا تلاش کرنا تو یہ تمہارے اپنے زور بازو کا کام ہے۔"

ذوالقرنین نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں وعدہ کرتا ہوں کہ جب یہ لوگ واپس پہنچ جائیں گے تو اسی روز تمہیں سرحد کے پار پہنچا دیا جائے گا۔"

اس افسر نے اپنا کارڈ دیا۔ ایک علیحدہ تحریر پہ لکھا کہ دوست لوگ ہیں انہیں کسی قسم کی روک ٹوک نہ کی جائے۔ یہ ہرزیلیہ تک یروشلم کے راستہ جائیں گے میرا خاص پیغام ان کے پاس ہے۔ مزید تسلی کے لئے ان سے خفیہ الفاظ پوچھے جائیں۔"

وہ خفیہ الفاظ تھے۔ "سویرا داس نہیں ہے۔"

جاتے جاتے ذوالقرنین نے کیمپ کے انچارج کو تاکید کی کہ وہ یہودی جاسوسوں پہ خاص نظر رکھے۔ اگر اس نے ہمارے ساتھ دھوکہ کیا تو ہم دھوکے باز کو دھوکہ دینے کی سزا ضرور دیں گے۔

واقعی جان بڑی عزیز شے ہوتی ہے۔ جو کچھ یہودی افسر نے بتایا تھا۔ وہ

ٹھیک تھا۔ جہاں بھی کسی مشکوک نظر کا ان سے سامنا ہوا تو انہوں نے کہا۔

"سویزا داس نہیں ہے"

توفوجی افسروں کی آنکھیں جھک گئیں۔ سب سے پہلے انہیں جریشو کی بیرونی حد بندی پہ ایک خاردار تاروں کے دروازہ کے اندر لے جایا گیا۔ ان کی تلاشی لینے پران سے ٹائم بم، بارودی سرنگیں اور دوسرا سامان نکلا تو کیمپ کمانڈر نے انہیں گولی سے اڑا دینے کی دھمکی دی۔ اس نے شناختی کارڈ اور تحریر کی بھی پرواہ نہ کی۔ لیکن جب انہوں نے کیمپ کمانڈر کو کہا۔

"سنیئے صاحب۔ ہم مشن بٹ کے آدمی ہیں اور ہم نے ہرزیلیہ ضرور پہنچنا ہے

تو کیمپ کمانڈر نے کان کھڑے کئے اور پھر پوچھا۔

"کیا کہا تھا تم نے؟"

"سویزا داس نہیں ہے۔ ہم نے یہی کہا تھا" ابوالاسرار نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ سویزا داس نہیں ہے" کمانڈر نے کہا۔

اور سپاہیوں سے کہا۔

"ان کا سامان واپس کر دو۔ یہ خاص صدارتی اور وزیر دفاع کے خفیہ دستہ کے آدمی ہیں"

ان کے پروانہ راہداری میں لکھا تھا کہ وہ یروشلم کی راہ ہرزیلیہ جا رہے ہیں لہذا انہیں جریشو سے بجائے راملہ کے یروشلم جانا پڑا۔

وہاب نے ابوالاسرار کو بتایا کہ یروشلم جانا بہتر ہی رہے گا۔ اگر داؤد مل گیا تو سلمان غنی کے متعلق بھی کچھ علم ہو سکے گا۔

لیکن ابوالاسرار بے تاب تھا کہ کب وہ ڈاکٹر ددن کا گلا اپنے چوڑے چوڑے ہاتھوں سے دبائے کہ اس کی آنکھیں ابل پڑیں اور ذکیہ کو آزادی مل جائے۔

انہیں داؤد کو تلاش کرنے میں دیر نہیں لگی۔ یروشلم کی سیر کے لئے انہوں نے وہ کار کرایہ پر لی جس کا ڈرائیور داؤد تھا۔

جب وہ انہیں شہر کے باہر کھنڈروں میں لے آیا تو وہاب نے " انعارف کراتے ہوئے اس خط کا حوالہ دیا جو شام کی راہ عمان پہنچا تھا۔ وہاب نے اسے اعرابی کے متعلق بھی بتایا۔

جب داؤد کو یقین ہو گیا کہ وہ دشمنوں کی بجائے دوستوں کے درمیان ہے تو اس نے بتایا۔

"سلمان غنی جب یروشلم پہنچے تو انہیں برج داؤد کے قریب یاشن بٹ کے ایک اعلیٰ افسر نے دیکھ لیا۔ یہ افسر انہیں کسی وقت قاہرہ میں دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ بھیس بدلے ہوئے تھے لیکن شن بٹ کے ایک دستہ نے انہیں گھیر لیا۔ وہ شدید زخمی ہو گئے۔ میں اس وقت تو ان کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ البتہ تدبیرے پہر میں پھر واپس آیا اور انہوں نے مجھے خط دیا۔ ساتھ ہی مجھے کہا۔"

"خفیہ اطلاعات کے محکمہ کے افسر مجھے مردہ سمجھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ لیکن اگر تم برج داؤد میں راملہ کے ایک سوداگر عغفور ثابت کو میرے متعلق اطلاع دے دو تو میری لاش گدھوں کا نوالہ بننے سے بچ جائے گی۔"

میں نے فوراً ایسا کیا۔ لیکن جب رات کی تاریکی میں میں اور عغفور ثابت

یہاں پہنچے تو اسرائیلی فوج کا ایک سپاہی ان کے مردہ جسم پر پہرہ دے رہا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اپنے ان ناچیز ہاتھوں سے سپاہی کا ایسا گلا دبایا کہ اس کی جان نکل گئی۔

پھر غفور ثابت اور میں سلمان غنی کے جسد خاکی کو اٹھا کر برج داؤد لے گئے۔ اس کے بعد مجھے کچھ علم نہیں کہ کیا ہوا؟"

وہاب اور ابوالاسرار خاموشی سے سنتے رہے۔ ان کے سر جھک گئے۔ ان کا ایک عظیم دوست ان سے بچھڑ گیا تھا۔ الفتح کا سچا خادم شہادت کا جام نوش کر چکا تھا۔

تیز رفتار بس پر یروشلم سے روانہ ہو کر وہ تل ابیب پہنچے۔ کیونکہ براہ راست یروشلم سے کوئی سروس ہرزیلیہ کے لئے نہیں ملتی تھی۔ تل ابیب سے وہ بحری جہاز کے ذریعہ ہرزیلیہ پہنچے۔

ہرزیلیہ بحیرہ روم کے کنارے ایک چھوٹی سی بندرگاہ بھی ہے۔ شہر بھر کی ساری رونق شام کے وقت بندرگاہ کے قرب وجوار میں سمٹ آتی ہے۔

وہاب ہرزیلیہ کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا اور اسے بڑی بڑی شاہراہوں کے علاوہ ڈاکٹر دون کی تجربہ گاہ کا بھی علم تھا۔ لیکن رات کے وقت ڈاکٹر دون کو ملنا بہت مشکل تھا اور وہ اسے اس کے گھر پر ملنا چاہتے تھے۔ تجربہ گاہ سے ہی اس کے گھر کا پتہ مل سکتا تھا۔ وہ دونوں پیدل چلتے ہی تجربہ گاہ تک پہنچے۔

دہاب حیران رہ گیا۔

- ڈاکٹر دون رات کے آخری حصہ میں بھی تجربہ گاہ میں تھا۔ باوردی ملازم نے انہیں صدر دروازہ پر روکتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب تحقیقات کے کمرہ میں ہیں اور کام کے دوران ہم انہیں پریشان نہیں کر سکتے"۔

"لیکن ہم انہیں ضرور ملنا چاہتے ہیں۔ جاؤ ان سے کہدو کہ سویزرا داس نہیں ہے"۔

ملازم چلا گیا۔ چند منٹ بعد پھر ظاہر ہوا تو اس نے بات کرنے کی بجائے دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں اندر چلے گئے۔ رات کے پچھلے پہر کا عمل ہو گا۔ جب ڈاکٹر دون اپنی تجربہ گاہ سے نکل کر ملاقات کے کمرہ میں آیا۔ اس نے اجنبیوں کو گھور کر دیکھا اور کہا۔

"سویزرا داس نہیں ہے"۔

"سویزرا داس نہیں ہے"۔ دہاب نے کہا۔

"آپ لوگ آرام کریں۔ میں تھک چکا ہوں۔ صبح آپ سے بات کروں گا مجھے تمہارے مشن کا احساس ہے"۔

اتنا کہہ کر ڈاکٹر اٹھ کر چلا گیا۔

دہاب اور ابوالاسرار دونوں بڑے حیران ہوئے۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

لیکن دہاب نے اشارہ سے ابوالاسرار کو منع کر دیا کہ وہ ڈاکٹر کی کسی بات پر

تبصرہ نہ کرے ہو سکتا ہے ان کی گفتگو کہیں سنی جا رہی ہو۔"

تھوڑی ہی دیر بعد ایک خادم آیا۔ وہ ان کو ایک ایسے کمرہ میں لے گیا جو بہترین طور پر آراستہ تھا اور اسے موسم کے مطابق ٹھنڈا کیا گیا تھا۔ میز پر بہترین قسم کی شراب کی بوتل اور چمکتے ہوئے ساغر موجود تھے۔ پھل اور گوشت کے ٹکڑے تھے۔

وہ ابھی ماحول کا جائزہ لے ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر ڈون پھران کے پاس آیا۔
"اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس بٹن کو دبا کر خادم کو بلا لینا۔" ڈاکٹر نے ایک بٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن ڈاکٹر۔ ہم....."

"مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ جب تم نے کہہ دیا ہے کہ "موبز اداس نہیں ہے" تو میں سمجھ گیا ہوں کہ تم شن بٹ کے آدمی ہو۔ میں بھی شن بٹ کا ایک افسر ہوں۔ میں بھ دوں گا کہ میں نے تمہیں ضرورت سے زیادہ دیر ٹھہرا لیا تھا۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ آج مجھے تجربات میں بڑی مایوسی ہوئی ہے۔ اور میں تھکا ہوا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔

دونوں دوست ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

وہاب نے گھنٹی بجائی۔ آہستہ سے دروازہ کھلا اور بجائے کسی مرد خادم کے ایک نازک اندام دوشیزہ اندر آ گئی۔

باریک سی سفید سکرٹ سے اس کا گورا گورا بدن چھلکا پڑتا تھا۔

کافی تیز آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ کالے بال اس کے چہرہ کے گرد چھاؤں کئے ہوئے تھے۔ اور ننگے بازوؤں کی گولائیاں بے حد حسین تھیں۔ اس نے زیر جامہ کے طور پر بھی کچھ نہیں پہن رکھا تھا۔ اس وجہ سے اس کے جسم کے خطوط بے حد نمایاں تھے۔

ابوالاسرار نے تو اسے دیکھ کر منہ ہی پھیر لیا تھا۔ لیکن وہاب یوں ننگا پن دکھا کر اپنے آپ کو شکوک و شبہات میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟"

"شمامہ۔"

"خوب بہت اچھا نام ہے۔"

"شکریہ۔ کیا میں آپ کی خدمت میں جام پیش کروں۔"

"نہیں ابھی نہیں۔ شکریہ۔"

"تو رقص پیش کروں؟"

"نہیں ابھی نہیں۔"

"اگر کچھ بھی نہیں تو پھر مجھے طلب کیوں کیا تھا۔؟ کیا آپ تنہائی تو محسوس نہیں کر رہے ہے۔ اگر ایسا ہے تو میں زینو، کافورہ، رامسہ کو بھی بلا لیتی ہوں۔"

"نہیں، نہیں۔ یہ بات نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک ضروری بات ڈاکٹر کو کہنا بھول گیا ہوں۔ اسی بات کا جواب صبح لے کر ہم نے تل ابیب جانا ہے۔ وہاں بہت سے عرب قیدیوں کا انجام ان کا

منتظر ہے۔"

وہاب نے یوں ہی کہا۔

"سچ ۔ سچ ۔ اگرچہ مجھے عربوں سے بالکل ہمدردی نہیں۔ لیکن مجھے ان کا یوں مارے جانا بے مذبحہ لگتا ہے۔ ڈاکٹر دون کے طریقوں کی بجائے انہیں گولی سے اڑایا جا سکتا ہے یا سوراخ والی کشتیوں میں بھر کر ساحل سے دور چھوڑ کر ڈبویا جا سکتا ہے ——— خیر حکومت کی مرضی۔" شمامہ نے کہا۔

"ڈاکٹر دون یہاں تو نہیں رہتے۔" وہاب نے استفسارانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں وہ دون دلا میں ساحل سمندر پر رہتے ہیں۔"

"کیا ہم وہاں جا سکتے ہیں۔؟"

"ہرگز نہیں۔ یہاں سے ڈاکٹر دون کی آمد سے پہلے کسی کو نکلنے کی اجازت نہیں، صدر دروازہ خودکار نظام سے کھلتا ہے اور وہاں ایٹمی رائفلوں والے پہرہ دار پہرہ دیتے ہیں۔"

وہاب سوچنے لگا۔

باوجودیکہ وہ محکمہ شن بٹ کے آدمی تھے ان پہ بھروسہ نہیں کیا گیا تھا۔ پھر بھی وہاب نے دون دلا پہنچنے کے متعلق سوچنا شروع کر دیا۔

"شمامہ۔" وہاب نے کہا۔

شمامہ نے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تم نے ڈوول ڈولا دیکھا ہے؟"

شمامہ نے ہاں میں سر ہلایا۔

"یہاں کتنی لڑکیاں اور کتنے مرد ہیں؟"

شمامہ شک بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

"یوں نہ دیکھو رانی ۔۔ اس میں تمہارا اور ہمارا سب کا فائدہ ہے، عرب چھاپہ مار ڈاکٹر ڈوول کی رہائش گاہ اور تجربہ گاہ دونوں کو تباہ کرنے کے لئے ہرزیلیہ پہنچ چکے ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر ڈوول کو بتانا تھا لیکن انہوں نے ہماری بات ہی نہیں سنی۔ اگر ہم سب یہاں اور وہاں مارے گئے تو فائدہ؟"

شمامہ کی آنکھوں کی چمک ڈوب گئی اور وہ باہر نکل گئی۔ چند لمحوں بعد تین اور لڑکیاں اور دونوں پہرہ دار رائفلوں سمیت اس کمرہ میں پہنچ گئے وہ سب دہشت زدہ تھے۔

"کیا الفتح ہرزیلیہ پہنچ گئی ہے؟ ایک پہرہ دار نے پوچھا۔

"ہاں، یہی تو ڈاکٹر کو بتانا تھا۔"

"تم نے بتایا کیوں نہیں۔ الفتح کا نام سنکر تو اس کی روح کانپ جاتی ہے۔"

"لیکن ہم یہاں سے بھاگ بھی تو نہیں سکتے۔ آہنی دروازہ کا کھلنا بڑا مشکل ہے۔"

"خودکار نظام کو تباہ کر دو۔" دوسرے پہرہ دار نے کہا۔

وہ جلدی میں باہر آئے۔

گیلریوں اور بڑے بڑے کمروں سے ہوتے وہ ایک ایسے کمرا میں آئے جہاں بے شمار سوئچ لگے ہوئے تھے۔ بلب جل اور بجھ رہے تھے تاروں کا جال بچھا ہوا تھا اور درمیان میں ایک اب گول آئینہ گھوم رہا تھا جس سے سنہری شعاعیں پھوٹ رہی تھیں ٹک ٹک اور گرر گرر کی پراسرار آوازیں آرہی تھیں۔ اس کے سامنے ہی بیٹھنے کا میز تھا۔

زینو جلدی سے میز کی طرف بڑھی تاکہ کرسی پر بیٹھ کر وہ بٹن دبائے جو کبھی کبھی ڈاکٹر دبایا کرتا تھا۔

لیکن ابھی وہ کرسی سے ایک قدم کے فاصلہ پر ہی تھی کہ ایک شعلہ لپکا اور آن واحد میں وہ جل کر راکھ ہو گئی۔

سب گھبرا کر پیچھے ہٹ گئے۔ خوف سے ان کے رنگ اڑ گئے۔ دونوں پہرے داروں کے ہاتھوں سے رائفلیں چھوٹ گئیں۔ لپک کر ایک رائفل وہاب نے اور دوسری ابوالاسرار نے اٹھالی۔

وہاب نے ایک سوئچ بورڈ کی طرف رائفل کر کے اس کا بٹن دبا دیا بجائے گولی کے اس میں سے ایسی تیز شعاع نکلی کہ سوئچ بورڈ آگ میں جلنے لگا۔ بڑی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔

دروازے از خود کھلنے لگے۔ لڑکیاں سہم گئیں۔ ان کے پیچھے بھاگتی ہوئی وہ صدر دروازہ تک پہنچیں۔

لیکن وہ ابھی تک بند تھا۔

وہ پھر اسی کمرہ میں آگئے۔ اور تمام نظام کو جلا دیا۔

اب کے دروازہ کھل گیا۔

وہاب اور ابوالاسرار نے دونوں سپاہیوں کو تو دو بارہ آہنی دروازہ کے پیچھے رسیوں سے باندھ کر ڈال دیا اور لڑکیوں کو لے کر ایک فوجی جیپ میں بیٹھ گئے۔

جیپ کا ڈرائیور اونگھ رہا تھا۔ اس کے افسر بازار حسن میں تھے۔ رائفل کی ٹھوکر سے ڈرائیور دون دلا کی طرف چلنے لگا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ سارہ نے چونگا اٹھایا اور کان سے لگالیا۔
اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی اور وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور کہا۔

"میں ابھی بلاتی ہوں!"

تیز تیز قدموں سے چلتی وہ احمد کے پاس پہنچی۔ وہ بالکونی میں بیٹھا اخبارات پڑھ رہا تھا اور ذاتی یا تنظیمی دلچسپی کی خبروں پر نشانات لگا رہا تھا۔

"یاسر عرفات ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتے ہیں!"

احمد جلدی سے ٹیلیفون تک پہنچا۔

وہ مفراق سے بول رہے تھے۔ انہوں نے آج بڑے دنوں بعد احمد سے بات کی تھی۔

احمد ٹیلیفون سنتا ہوا کبھی اداس ہو جاتا۔ کبھی مغموم۔ کبھی حیرانگی سے منہ کھول لیتا۔

سارہ احمد کے تغیرات دیکھتی رہی۔ جب ٹیلیفون بند ہوا تو سارہ نے احمد کے چہرہ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"آج اس خبر کی تصدیق ہو گئی ہے کہ سلمان غنی شہادت پا چکے ہیں۔ مجھے حکم ہوا ہے کہ میں ان کے فرائض سنبھالنے کے لئے قاہرہ پہنچوں۔"

"قاہرہ" سارہ نے دہرایا۔

"میں تو یروشلم ۔۔۔ پیارے دارالامان میں جانا چاہتا تھا لیکن قسمت کو یہ سب کچھ منظور نہیں۔"

سارہ بھی افسردہ ہو گئی۔ کچھ سلمان غنی کے یوں ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کا غم اور کچھ اردن چھوڑ کر پھر متحدہ عرب جمہوریہ جانے کا خیال۔ وہ گم سم کھڑی تھی کہ احمد نے پیچھے سے آکر اسے سینہ سے لگا لیا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

"امتہ الحبیب کا کیا بنے گا۔ اعرافی نہیں لوٹتا۔ ریکا اکیلی ہے۔ عبدی ۔۔۔ عبدی کی نگاہیں بے چین رہا کریں گی۔"

"زندگی بھر کون کسی کے ساتھ رہا ہے جانم ۔۔۔ یہ سلسلے یوں ہی چلتے رہتے ہیں۔ یہ تو وہ قیمت ہے جو ہم فلسطین کی آزادی کے لئے ادا کر رہے ہیں ۔۔۔ محض باتوں میں نمائش زیادہ ہوتی ہے، جذبوں کا اظہار کم ہوتا ہے۔

"انسان کا مسئلہ جذبہ کا مسئلہ ہے۔ نظری اور فکری ہو تو بھی اس کی بنیاد جذبے پر ہو گی۔ اگر ایسا نہ ہو تو محض مابعد الطبیعاتی سوال بن کر رہ جائے گا۔"

"لیکن مت رو سارہ۔ تین چار افراد کی زندگی اس اجتماعی زندگی سے زیادہ قیمتی نہیں ہے جس میں اکری سے لے کر ادجہ تک اور وقاص سے لے کر حمامہ تک کے انسان گھر چکے ہیں۔ ہم کسی کے ملازم نہیں۔ ہم تو ایک رضا کارانہ خدمت سر انجام دے رہے ہیں۔ اتنی بالغ نظر عورت ہو کر بھی اداس ہو گئی ہو۔"

سارہ نے پہلو بدلا اور احمد کی طرف منہ کر کے مسکرا پڑی۔

"سرتاج! میں اس خواب کی باتیں ہی کر رہی تھی جو یروشلم میں گھر بسانے کے متعلق اکثر آپ نے دیکھا ہے۔"

"وہ گھر بھی ضرور بسے گا۔ اگر میں نہ بسا سکا۔ تم نہ بسا سکیں۔ تو آنے والے دور کا بچہ جو تمہاری کوکھ میں پل رہا ہے ضرور بسائے گا۔"

سارہ خاموش ہو گئی۔ ایک موہوم مستقبل اس کے تصورات میں ابھرنے لگا۔

تیسرے روز ہی وہ قاہرہ میں تھے۔ یہاں ان کی مصروفیات کچھ بین الاقوامی نوعیت کی تھیں۔

یہاں آکر سارہ نے محسوس کیا کہ جہاں عوام الفتح کے مجاہدین کے کارناموں کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں وہاں حکومت کچھ خاموشی

سے کام لیتی ہے۔

لیکن تین روز بعد مصر کے تمام اخبارات نے دو ایسی لڑکیوں کی تصاویر شائع کیں جن میں سے ایک کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔ یہ ذکیہ کی تصویر تھی۔ دوسری کے نیچے لکھا ہوا نام سارہ کا جانا پہچانا تھا۔ ثمامہ۔

دونوں لڑکیاں انتہائی مخدوش حالات میں ایک جہاز کے ذریعہ کنعا پہنچی تھیں۔ اور انہوں نے اپنی کہانی اخبارات کو سنائی تھیں۔ لیکن دونوں کی کہانی مختلف تھی۔

ذکیہ نے بتایا۔

"میں ہرزیلیہ میں ڈاکٹر ددن کے ساحلی مکان پر دیگر گرفتار شدہ عرب لڑکیوں کے ساتھ تھی۔ ہم پر مختلف طریقوں سے تشدد کیا جا رہا تھا۔ پڑھی لکھی ہونے کی وجہ سے میں آسانی سے ان کے حسب دلخواہ باتیں نہیں کر رہی تھی۔ مجھ پر جاسوس ہونے کا الزام تھا۔

اگلے روز مجھے ڈاکٹر ددن نے اپنی تجربہ گاہ لے جانا تھا کہ اچانک دھماکوں سے ڈاکٹر ددن کا مکان لرز اٹھا۔ میری کوٹھڑی کا آہنی دروازہ آپ سے آپ کھل گیا۔ ڈاکٹر ایک موٹر لانچ میں بھاگ رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ اسی کے مکان کی ایک کھڑکی سے شعلہ لپکا اور موٹر لانچ سمیت ڈاکٹر شعلوں کی نذر ہو گیا۔

میں نے مردانہ کپڑے پہنے اور بھاگم دوڑ میں بندرگاہ تک جا پہنچی جہاں سے ایک جہاز لبنان جانے کو تیار کھڑا تھا۔ اس میں بیٹھ گئی اور ایک

ادھیڑ عمر کے ملاح نے مجھے گودام میں چھپا دیا۔ یقیناً وہ ملاح الفتح کا حامی ہوگا۔"

شمامہ نے کہا تھا۔

"مجھے جب ہوش آیا تو میں ایک پتھر کے اوپر گری ہوئی تھی۔ میری کنپٹی سے خون بہہ رہا تھا اور میرے جسم پر باریک سا لباس تھا۔

لیکن جب مجھے حیفہ سے ایک فوجی افسر اٹھا کر لے گیا تھا تو میرے جسم پر بڑا اچھا لباس تھا۔ فوجی افسروں نے مجھے الفہم میں رکھا۔ پھر وہ مجھے ہرزیلیہ لے گئے۔ اس کے بعد مجھے ایک بوڑھے شیطان ڈاکٹر نے کچھ پلایا۔ اس کے آگے مجھے کچھ یاد نہیں۔ میں حیفہ میں اپنے بھائی کے پاس جانا چاہتی ہوں۔"

نمائندہ اخبار نے لکھا تھا اس کے بعد کلیسا کی گھنٹیاں بجنے لگیں اور شمامہ نے اپنے سر کو جھکا لیا۔

دونوں لڑکیاں اب بیروت میں تھیں اور انہوں نے متحدہ عرب جمہوریہ کے سفارت خانہ میں جانے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

جس نیک دل ملاح نے ذکیہ کو گودام میں چھپایا تھا اسی نے شمامہ کو بھی پناہ دی تھی۔ اسی نے دونوں کو بیروت تک پہنچایا اور ان کو اخبارات کا موضوع بنایا اور پھر وہ غائب ہوگیا۔

شمامہ اپنے محسن کو دیکھنے کی بڑی آرزومند تھی۔

اخبار پڑھنے کے بعد معاً سارہ کے ذہن میں خیال ابھرا۔ اعرابی کا کیا ہوا — دہاب اور ابوالاسرار کا کیا بنا — ؟ فی الحال اس سوال کا جواب

کوئی نہیں تھا۔

اب احمد کا کام تھا کہ وہ دونوں لڑکیوں کو بیروت سے اردن پہنچاتا ۔۔۔ سفارتی سطح پر گفتگو ہوئی اور دوسرے روز دونوں لڑکیوں کو عمان میں طلحہ کے پاس پہنچادیا گیا۔ اس نے دونوں کو رمیکا کے پاس "الثورۃ الفلسطینیہ" کے برانچ آفس میں ٹھہرایا۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس دوران میں عرب چھاپہ ماروں نے ہوائی اڈوں تک کو نشانہ بنایا۔ مقبوضہ عرب علاقوں سے بارہ ہزار یہودی فرار ہو کر تل ابیب پہنچ گئے۔ بروقت ان پر عربوں کا خوف چھایا تھا۔ خود اسرائیلی حکومت نے بیت المقدس کے چار سرکردہ فلسطینی عربوں کو ان کے خاندانوں سمیت زبردستی اردن میں دھکیل دیا۔ ان عربوں پر چھاپہ ماروں کی حمایت و امداد کا الزام تھا۔

ان میں سے ایک عرب اردنی حکومت کا جج، دوسرا عرب بیت المقدس کے مفتیٔ اعظم کا رشتہ دار اور تیسرا خواتین کی تنظیم کا سرکردہ لیڈر تھا۔

ڈاکٹر دون کی موت کے بعد ہرزیلیہ میں ہونے والے ہنگاموں میں کمی ہوئی تو ابوالاسرار اور وہاب نے واپسی کا عزم کیا۔

ان کے پاس راہداری کا پروانہ تو تھا ہی۔ بلا روک ٹوک وہ واپس جیرلیشو پہنچے۔ اور خود اسرائیلی حکام نے انہیں الصلت پہنچنے کے لئے دریا عبور کرنے میں مدد دی۔

وہاب کو سو فیصدی یقین تھا کہ ذکیہ ان کے حملہ کے دوران شہید

ہو چکی ہے۔ پھر بھی وہ مطمئن تھا کہ ددن کا ناپاک وجود تو ختم ہوا ہے۔

وہ تھوڑی دیر آرام کے بعد پھر مقبوضہ علاقہ میں جانا چاہتا تھا لیکن قدرت اس کی مایوسیوں کو خوشیوں سے بدلنے کا فیصلہ اس کی آمد سے پہلے ہی کر چکی تھی۔

ذوالقرنین دونوں کو واپس پا کر بہت خوش ہوا۔ اس نے شن بٹ کے افسر سے رابطہ قائم کیا اور کہا۔

"میں اپنا وعدہ پورا کرنے آیا ہوں۔ میں آج ہی ہائی کمان سے بات کروں گا اور کل اپنا وعدہ نبھاؤں گا۔"

افسر خاموش رہا۔

جب وہ واپس لوٹنے لگا تو افسر نے پوچھا۔

"تمہارا مشن کیسا رہا؟"

"کامیاب۔"

"ڈاکٹر ددن کی جملہ کارگزاریوں کا پتہ چل گیا ہوگا۔" افسر نے پوچھا۔

"نہیں، جو جنس وہ بیچتا تھا ہمارے جوان اس کے خریدار نہیں تھے۔"

"پھر کیا کیا۔ لڑکی کو لے آئے؟"

"نہیں لڑکی نہیں مل سکی۔ لیکن ڈاکٹر ددن، اس کا گھر اور اس کی تجربہ گاہ سب اڑا دی گئی ہے۔"

افسر کے چہرہ پہ خوشی و مسرت کے جذبات پھیل گئے۔ اس نے مزید تسلی کی خاطر پوچھا۔

"ڈاکٹر ددن مارا گیا؟"

"ہاں۔ مارا گیا۔"

"اس ظالم نے میری ایک عزیز کو بھی اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھایا تھا میرا انتقام میرے دشمنوں نے ہی لے لیا۔"

پھر وہ قہقہہ لگا کر زور سے ہنسا۔

"آہا ہا۔ ددن مارا گیا۔ اب میں اس کی اس بیٹی کے ٹکڑے کر دوں گا۔ جو حیفہ کے پورٹ ٹرسٹ کے ڈائریکٹر کی بیوی ہے اور جس کے کہنے پر ہی میری عزیز کو ڈاکٹر نے مار ڈالا تھا۔"

ذوالقرنین خاموش اٹھ کر چلا آیا۔ افسر کے قہقہے اس کا تعاقب کرتے رہے۔

اگلے روز صبح ہی ذوالقرنین نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

رافعہ العریشی یعنی ریکا اب وہ کام کر رہی تھی جو دراصل سارہ کا تھا۔ اس نے اپنی تصنیف شمامہ کو پڑھائی۔ اور پھر روزمرہ کی گفتگو سے اسے سمجھایا کہ کس طرح اسے اسرائیلی افواج نے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے اور کس طرح وہ ایک انجانے تشدد کا شکار رہی ہے۔

اور یہ اس کی کنپٹی کی اتفاقی چوٹ تھی جو اسے ماضی میں لوٹا لے گئی۔ ورنہ وہ بھی وہی کرتی جو اس کی ساتھی دوسری دو لڑکیوں نے کیا۔

شمامہ کو یقین ہوتا گیا کہ جو وہ کہتی ہے وہ درست ہے۔ اس نے اکثر یوں محسوس کیا کہ وہ ایک طویل عرصہ محو خواب رہی ہے اور اس دوران آنے

والے خوابوں کا اکثر حصہ اسے یاد آ رہا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے آپ میں لوٹتا محسوس کر رہی تھی۔

طلحہ نے اپنے بڑے لڑکے کے ذمہ یہ فرض عائد کر رکھا تھا کہ وہ روزانہ یونیورسٹی سے آتے ہوئے رمیکا کو مل کر آئے اور انہیں ضروریات کی اشیاء مہیا کرتا رہے۔ وہ ایسا کر رہا تھا اور شمامہ کی سیاہ آنکھوں میں کھو یا جا رہا تھا۔

جب وہاب اور ابوالاسرار چند روز کے بعد عمان پہنچے تو سارہ کے گھر پہ ذکیہ کو موجود پا کر وہاب اپنے آپ پہ قابو نہ رکھ سکا۔ وہ ذکیہ کے بازوؤں میں گر گیا۔ اور ایسا گرا کہ ہفتوں پھر وہ اٹھ نہ سکا۔

ذکیہ سے ملنے کی خواہش میں جو بیماری دب گئی تھی۔ ایک دم عود کر آئی۔

ابوالاسرار حیران رہ گیا کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وہ تو بھلا چنگا اس کی رہنمائی کرتا رہا تھا۔ ایک عورت کو دیکھ کر یوں گر جانا اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

رمیکا اسے سمجھاتی رہی۔

سارہ کے مکان پہ اب وہاب، ذکیہ اور شمامہ کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ضرورت نہ ہونے کے باوجود حسن مجتبےٰ آتا رہا۔ وہ ذکیہ کے کہنے پر ادویات لینے چلا جاتا۔

کبھی کبھی وہ شمامہ سے اس کی دل چسپیوں کے بارے میں پوچھتا۔

یہ جان کر اسے بڑا دکھ ہوا کہ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے۔ وہ اسے یونیورسٹی سے اکثر کتابیں لاکر دیتا جو وہ پڑھتی اور واپس کر دیتی۔ جس روز وہ نہ آتا اس روز وہ بے چین رہتی۔

ایک روز طلحہ وہاب کی خیریت معلوم کرنے آئی تو حسن مجتبےٰ کو شمامہ سے گھل مل کر باتیں کرتے دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ دوسرے لمحہ اس کے چہرہ پہ ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیلی اور حسن مجتبےٰ کو کچھ کہے بغیر اندر چلی گئی۔

وہاں وہ تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھی رہی۔

جب واپس لوٹی تو حسن مجتبےٰ بھی وہیں موجود تھا۔ اور بڑے رسیلے قہقہوں میں کھویا ہوا تھا۔ طلحہ بڑے وقار سے چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچی اور کہا۔

"صاحبزادے کچھ علم بھی ہے۔ آج تمہارا باپ آرہا ہے۔"

"ہاں امی۔ مجھے یاد ہے۔"

"تو چلو پھر۔"

"امی شمامہ کو بھی لے چلیں۔ یہاں سے ایرپورٹ کون سا دور ہے۔ بیچاری سارا دن اداس رہتی ہے۔"

بیچاری کے لفظ پر طلحہ ایک بار پھر مسکرائی۔ لیکن دوسرے لمحہ وہ سوچ میں ڈوب گئی۔

حسن نے کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ یہ وہی شمامہ تھی جو اس شخص کی بہن تھی جس نے گراں قدر خدمات انجام دی تھیں۔ جس کی کہانی رافعہ العریشی سے

مختلف نہیں تھی۔

اس نے غور سے شمامہ کی طرف دیکھا تو وہ اسے بہت ہی پیاری سی مخلوق نظر آئی۔

"ہاں، ہاں، چلو بیٹی۔"

تھوڑی دیر بعد وہ ایرپورٹ پر جا پہنچے۔ ابھی طیارہ آنے میں کچھ وقت تھا۔ وہ ٹہلتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

طلحہ شمامہ سے اس کی ذاتی نوعیت کی معلومات حاصل کرتی رہی۔

فضا میں طیارہ کی گرج سنائی دی۔ تینوں کی نظریں طیارہ پر جم گئیں۔ تھوڑی دیر بعد طیارہ رن وے پر دوڑ رہا تھا۔

پھر وہ اہم شخصیتوں کی لاؤنج کے قریب ہو کر آہستہ آہستہ اڈہ پر آکر ٹھہر گیا۔ مجتبیٰ حامد کو دیکھ کر حسن نے بازو ہلائے۔ طلحہ نے بھی اپنا ہاتھ بلند کیا۔

مجتبیٰ حامد کو ہرگز یہ توقع نہیں تھی کہ اس کا استقبال یوں ہوائی مستقر پر کیا جائے گا۔ اس نے بھی ہاتھ ہلائے۔ اس کے ساتھ بھی دو آدمی تھے۔

ایک کو تو طلحہ نے جلد ہی پہچان لیا۔ یہ اعرافی تھا۔ اور دوسرا—— دوسرا کون تھا——؟

طلحہ ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ جنگلہ پھاند کر شمامہ بھیا کہتی ہوئی دوڑی اور جا کر اس آدمی سے لپٹ گئی جسے کسی نے نہیں پہچانا تھا۔ اب طلحہ زیرلب

بڑبڑائی۔ "داؤد"
وہ داؤد ہی تھا۔
مجتبےٰ حامد جب سب سے مل چکے تو شمامہ سے کہا۔
"سناؤ لڑکی۔ کیسا حال ہے؟"
شمامہ بالکل خاموش تھی۔
"یہ مجتبےٰ حامد۔ حسن کے والد۔ یہی تو وہ ملاح تھے جنہوں نے مجھے جہاز کے گودام میں چھپا دیا تھا" وہ سوچ رہی تھی۔
شمامہ، داؤد اور اعرافی کو ذکیہ کے پاس چھوڑ کر حسن، طلحہ اور مجتبےٰ حامد گھر چلے گئے۔
ذکیہ یہ سنکر کہ ان کو جہاز میں پناہ دینے والا ملاح دراصل مجتبےٰ حامد تھے حیران رہ گئی۔ وہ خود بھی ان کو نہیں پہچان سکی تھی۔ اس وقت حالات ہی کچھ ایسے تھے۔
جیسا کہ بعد میں باہم گفتگو سے معلوم ہوا۔ بیروت کے اخبارات میں ذکیہ اور شمامہ کی تصاویر دیکھ کر اعرافی نے بیروت کا رخ کیا۔ مجتبےٰ حامد پہلے ہی وہاں موجود تھے۔
اعرافی نے ایک دوست کے ذریعہ یروشلم میں داؤد کو بھی اطلاع دے دی تھی کہ شمامہ مل گئی ہے۔ اور وہ ادارہ سیاحت کی گاڑی میں ہی دن رات سفر کرنے کے بعد حیفہ پہنچ گیا اور وہاں سے متحدہ عرب جمہوریہ کے سفارت خانہ میں ان سے آملا۔ وہاں ایک دو دن میں سفر کے انتظامات

گئے اور بالآخر عمان پہنچ گئے۔

اسرائیل میں توڑ پھوڑ کا سلسلہ جاری تھا۔ اس کے حواری اسے اسلحہ کی سپلائی کر رہے تھے اور اسے برابر اس مقصد کے لئے تیار کر رہے تھے کہ وہ امن عالم تباہ کرنے کی کارروائیاں کرتا رہے۔

یہاں تک کہ امریکہ میں ہونے والے صدارتی انتخاب کے امیدوار کہہ رہے تھے کہ اسرائیل کو ہر قسم کا جنگی سامان دیا جائے تاکہ مشرق وسطیٰ میں طاقت کا توازن برقرار رہے۔

ائیرپورٹ سے واپسی پر اور اس کے بعد بھی شمامہ اپنے ماضی کے متعلق سوچتی رہی۔
کبھی کبھی اس کے خیالات ان ایام کی طرف لوٹ جاتے جو اگرچہ خواب کی کیفیت رکھتے تھے۔ لیکن ان کی ہولناکی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ وہ ایام تھے جو اس نے ڈاکٹر ددن کی قیام گاہ میں گزارے تھے۔ وہ سکول میں کیے جانے والے اسرائیلی پروپیگنڈہ سے بڑی متاثر تھی۔ وہ اس بات پر ایمان رکھتی تھی کہ یہودی دنیا کے نجات دہندہ ہیں۔ اسرائیل کا وجود اور عظیم تر اسرائیل ہی دنیا کو امن و آشتی کی ضمانت دے سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ یہودیت، صیہونیت، اسرائیل وغیرہ زندہ باد کے نعروں میں اونچی آواز لگاتی تھی اور جب کبھی اس کے سامنے دائود الفتح کی کارگزاریوں کا ذکر کرتا۔ آگ و خون سے کھیلنے والے نوجوانوں کو ان کے کارناموں پر داد دیتا تو

شمامہ اس سے ناراض ہو جاتی۔

سکول کی تعلیم نے اس کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح ڈال دی تھی کہ عرب من حیث القوم اسرائیل کے دشمن ہیں۔ اس لئے وہ اسرائیل کے اندر بسنے والے عربوں سے بڑی نفرت کرتی تھی۔

عربوں سے عموماً اس کی مراد وہ لوگ تھے جو مساجد میں جاتے، نمازیں پڑھتے اور اسرائیلی مظالم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے احتجاجی مظاہرے کرتے تھے۔ اسے یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ عرب ہی نہیں مسلمان بھی ہیں۔ اور یہودیوں کے لئے ایک عظیم خطرہ ہیں۔

جب اچانک اسے حیفہ کی بندرگاہ سے اغوا کر لیا گیا تو کچھ عرصہ کے لئے اس کا ذہن جھنجھنا اٹھا تھا۔ اسے اپنے راسخ عقیدے کھوکھلے معلوم ہوئے۔ اس نے سوچا۔

"اس کا بھائی سچ ہی کہتا رہا ہے"

لیکن جوں جوں اسے ذہنی طور پر ماؤف کیا گیا تو اسے صرف اتنا یاد رہ گیا کہ وہ ایک خوب صورت جسم والی جوان لڑکی ہے اور فطرت نے اسے محض اسرائیلی منصوبوں کی تکمیل کرنے والے جوانوں کے دل لبھانے اور داد عیش دینے کے لئے تخلیق کیا ہے۔ وہ ایک کٹھ پتلی کی طرح ڈاکٹر دون کے اشاروں پر ناچتی رہی۔ اور وہ رات کتنی خوبصورت اور رنگ ونغمے سے ہم آہنگ تھی جب ہرزیلیہ کے بنلا پہ کھڑے ہوئے ایک گنڈ ولے میں قمقمے جل رہے تھے۔ ریشمین پردے لہلہا رہے تھے اور باریک نائیلون معطر

لباس پہنے وہ ڈاکٹر دون کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اس گنڈولے میں شب باشی کے لئے بے شمار اسرائیلی لڑکیاں ڈاکٹر دون کی نگاہوں کا مرکز بننے کے لئے نئے نئے اہتمام کرتی تھیں اور وہ خوش قسمت تھی کہ اسے ڈاکٹر دون نے تین چار ماہ کی تربیت کے بعد ہی گنڈولا پہ رات گزارنے کے لئے انتخاب کر لیا تھا ۔ برا ہو عربوں کا ۔ کہ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ڈاکٹر تمام رات گنڈولا میں نہ آسکا اور اس نے رات آنکھوں میں کاٹ دی ۔

اس نے بڑی خواہش کی کہ ڈاکٹر دون کی نگاہ انتخاب ایک بار اور اس پہ پڑ جائے اور پھر وہ بندر گاہ سے ٹکرانے والی سمندر کی ہلکی ہلکی لہروں کے ہچکولوں سے لطف اندوز ہو سکے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

وہ کیوں سوچتی رہی ؟

اس نے ماضی کے اوراق پلٹے۔ واقعی اسے برے بھلے کی تمیز نہیں رہی تھی۔ کاش اسے اس زمانے کے یہ دھندلے خواب آلود واقعات بھی یاد نہ آئیں ۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں اس خواب آلود دور کی باتیں تازہ تر ہوتی جا رہی تھیں اور اس کا دماغ ایک ایسا میدان جنگ بن گیا تھا۔ جہاں سہ رخا حملہ ہو رہا ہو۔ ایک حملہ وہ تھا جس میں اسرائیل اور یہودی اسے عظیم نظر آتے تھے ۔ ایک حملہ وہ تھا جہاں اسرائیل انتہائی پستیوں میں ڈوب گیا تھا ۔ اور ایک حملہ اس اخلاقی اور عظیم ترین قوت کا تھا جس کا نام اسلام ہے اور جس کے نام لیوا اس کے قریب بیٹھے

تھے اور جن کی پناہ میں وہ اس وقت تھی۔

شام تک اسے ایسے ہی خیالات آتے رہے۔ ریکا نے اس کے ذہن کا جو تجزیہ کیا تھا وہ بے حد درست تھا۔ لیکن وہ سوچتی۔

"کیا کوئی ایسی صورت نہیں کہ یادوں کے سارے چراغ بجھ جائیں ——— حافظہ کو موت آجائے اور اس کے سامنے یہ دور رہ جائے جو اس وقت، اس لمحہ، اس آن گزر رہا تھا —— ماضی و مستقبل کے جھنجھٹوں سے آزاد صرف حال رہ جائے ——— جس میں حسن مجتبٰے کی مسکراہٹیں ہوں —— ریکا کا خلوص ہو —— اور بس —— ہاں، داؤد کا دست شفقت بھی ہو۔"

انہی سوچوں میں گم اس نے اپنے آپ کو مزید سمجھنے کے لئے رافعہ العرشی کی تصنیف کو غور سے پڑھنے کے لئے نئے الارادہ سے تھام لیا۔ وہ ایک آدھ جملہ پڑھتی اور اس کی جزئیات پر غور کرنے لگتی —— جس مقام پر اس کی اپنی ذات کے پرتو نظر آتے وہاں وہ آنکھیں بند کر کے ذہن کے دریچے واکرتی اور سوچوں میں گم ہو جاتی۔

جہاں اسے سارا اسرائیل، فلسطین کے مہاجر اوران پر بیتنے والے مظالم کی تفاصیل ملتیں تو اس کی روح کانپ جاتی —— لیکن اس مقام پر پہنچ کر اسے بڑی آسودگی ہوئی جہاں ریکا نے حالات کی روشنی میں مستقبل کا جائزہ لیا تھا۔ اس نے ایک بڑی پختہ بات کہی تھی۔

اس نے لکھا تھا۔

"اگر اسرائیل جارحیت کا مظاہرہ نہ کرتا۔ یہودی اپنے

عزائم کو عملی شکل دینے کے لئے طاغوتی طاقتوں کا سہارا نہ لیتے اور غلط راہ عمل اختیار نہ کرتے۔ تو ممکن تھا ان عزائم میں کامیاب ہو جاتے جو یہودی اکابرین نے اپنے پروٹوکولز میں اور اپنی تصنیفات میں بیان کئے ہیں جس میں ساری دنیا پر حکومت کرنے کا ایک منصوبہ موجود ہے ۔ ان کی قائم کردہ بالادست حکومت مسلسل ناکامیوں سے دوچار ہے امریکہ کے سیاہ فام، ویت نامی، افریقہ، آسام، رہوڈیشیا بیافرا اور خود فلسطین میں اس حکومت کے ستون اوندھے گر گئے ہیں ۔ فری میسنوں کی زیرزمین تحریک کے مقاصد اور صیہونیت کے عزائم کا پول کھل چکا ہے اور جوں جوں اسرائیلی ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں توں توں دنیا بھر کے انسان دوست مفکر، ادیب، شاعر اور مؤرخ یہودی کارکردگیوں اور منصوبوں سے مسلسل پردے اٹھا رہے ہیں۔ ان کی سازشوں کے بے نقاب ہو جانے سے خود ان کے اپنے عوام اسرائیلی حکمرانوں پر تین حرف بھیجنے لگے ہیں "

یہ سچ بھی تھا۔ یہودی سازشیں بے نقاب ہو جانے سے دنیا کا منہ بند رکھنے کی خاطر ان کے دوست بھی بعض اوقات ان کے خلاف بیان دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ تسکین کی لہر شمامہ کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ شمامہ نے کتاب بند کر کے رکھ دی اور یہودی سازشوں کی بے نقابی

سے حالات نے جو رخ پلٹا تھا اس کا جائزہ لینے لگی۔ اس نے میز پر سے اخبارات کے تراشے اٹھا کر پڑھنے شروع کئے۔

اسی روز کی خبر تھی کہ اسرائیل نے عالمی ریڈ کراس کو دھوکہ دیا ہے۔ یعنی اس نے الجزائر سے عالمی ریڈ کراس کے زیر اہتمام معاہدہ کیا تھا کہ اگر اس کا اغوا شدہ طیارہ واپس کر دیا جائے تو وہ اس کے بدلے ۱۶ حریت پسندوں کی رہائی کا وعدہ کرتا ہے۔ الجزائر نے طیارہ واپس کر دیا لیکن اسرائیل نے اپنے وعدہ کا پاس نہیں کیا۔

اس ایک وعدہ خلافی کا نتیجہ یہ ہنگامے نہیں تھے جو مقبوضہ علاقوں میں برپا تھے ایسی ہی خدا جانے کتنی وعدہ خلافیاں کی گئی ہوں گی۔ ایسے ہی کتنے فریب ہوں گے جو فلسطینی عوام نے کھائے ہوں گے۔

گزشتہ کئی روز سے حریت پسندوں کی کارروائیوں میں شدت آ چکی تھی۔ حریت پسندوں کے مختصر گروہ نے مقبوضہ علاقوں کے اندر کئی فوجی کیمپ اور پولیس اسٹیشن اڑا کر رکھ دیئے تھے۔ اسلحہ کے ذخیرے تباہ کر دیئے تھے۔ فلسطینی مجاہدین نے گزشتہ چھ ماہ میں اسرائیلیوں پر ایک سو سولہ حملے کئے۔ جن میں تیرہ سو اسرائیلی فوجی ہلاک یا زخمی ہوئے۔ ایک سو بیس فوجی گاڑیوں اور پانچ ٹینکوں کے پرخچے اڑا دیئے اور بہت سا جنگی سامان حریت پسندوں کے ہاتھ لگا۔ ان لڑائیوں میں چودہ مجاہدین شہید اور تین زخمی ہوئے۔

الفتح نے اپنا ایک سیاسی اعلان شائع کیا۔ جس میں اقوام متحدہ کی

تمام قرار دادوں کو یکسر مسترد کر دیا اور عرب ملکوں پر زور دیا کہ مشرق وسطیٰ کے بارے میں یارنگ مشن کو ختم کر دیا جائے۔

الفتح نے اعلان کیا۔

"ہم دنیا کے اس خطہ میں امن و آشتی کام کے خلاف نہیں ہم صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھنے اور ہتھیار ڈالنے کے خلاف ہیں۔ الفتح کا انقلاب نسلی و مذہبی بنیاد پر یہودیوں کے بنیاد پر یہودیوں کے خلاف نہیں۔ یہ صیہونیت کے خلاف ہے جو ایک سامراجی تحریک ہے۔ ہم سامراجیت کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ ہم صرف عرب علاقوں کو آزاد نہیں کرانا چاہتے بلکہ خود یہودیوں کو عالمی صیہونیت کی وجہ سے پیدا شدہ نسلی امتیاز اور تشدد سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔

اعلان کے آخر میں اپیل کی گئی۔

عرب ممالک اسرائیل میں رہنے والے تمام یہودی عربوں کو عام معافی دینے کا اعلان کریں تاکہ وہ اپنے آبائی ممالک میں واپس جا سکیں۔

ایک ایسا پروگرام وضع کیا جائے جس کے تحت یہودی عرب معاشرے میں بہتر اور باعزت طریق پر زندگی بسر کر سکیں۔ جس طرح کہ وہ پہلے عرب ملکوں میں رہتے تھے۔

مجاہدین کی کامیابیوں کی داستانوں کے ساتھ اسرائیل کے مظالم کی

بھی کئی خبریں اس کے سامنے بکھری پڑی تھیں۔ اس نے پڑھا کہ اسرائیل آئندہ سال اپنے فوجی بجٹ میں دس فیصد کے اضافے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ اس طرح اسرائیل کے فوجی اخراجات ۶۲ کروڑ ۸۰ لاکھ ڈالر سے بڑھ کر ۸۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ڈالر ہو جائیں گے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ جگہ اور آبادی کے لحاظ سے اسرائیل کے فوجی اخراجات امریکہ سے دوگنے ہیں اور اسرائیلی باشندے امریکیوں کے مقابلہ میں ۵ گنا زیادہ رقم جنگی اخراجات کی مد میں دیتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں اسرائیلی جنگی اخراجات کا تخمینہ ۱۲۸ ڈالر فی کس تھا۔ جبکہ فرانس میں یہ رقم ۱۰۶ ڈالر، برطانیہ میں ۹۷ ڈالر اور جرمنی میں ۹۳ ڈالر فی کس تھی۔

تازہ ترین تخمینے کے مطابق اس وقت اسرائیل کی کل آبادی ۴۰ لاکھ ہے اور اس کی باقاعدہ مسلح فوج کی تعداد ۴۰ ہزار ہے۔ اس کے علاوہ ۲ لاکھ ۲۵ ہزار کے لگ بھگ محفوظ فوج ہے جسے ہنگامی طور پر ۴۸ گھنٹے کے اندر طلب کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اسرائیل کی یہ فوج پونے تین لاکھ کے لگ بھگ پہنچ جاتی ہے۔ اسرائیلی فوج زیادہ تر جدید ترین سنچورین اور شرمن ٹینکوں سے لیس ہیں جس میں ۵ انفنٹری تین مکتر بند اور ایک چھاتہ بردار بریگیڈ شامل ہے۔ محفوظ فوج ۲۴ بریگیڈوں پر مشتمل ہے۔

اسرائیلی بحریہ کی مجموعی قوت تین ہزار باقاعدہ بحری فوج ہے جس کو ہنگامی طور پر ۶ ہزار تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ اسرائیلی بحریہ کے پاس اس وقت جو اسلحہ اور جنگی ساز و سامان ہے ان میں تین بحری آبدوزیں، ایک تباہ کن جہاز، ایک

طیارہ شکن جہاز، ایک ساحلی محافظ دستہ، چار پیٹرولنگ کرافٹ، نو موٹر تارپیڈو کشتیاں اور ۱۲ گن بوٹس شامل ہیں۔ جہاں تک اسرائیلی فضائیہ کی طاقت کا تعلق ہے اس وقت اسرائیلی فضائیہ میں ۸ ہزار باقاعدہ مسلح جوان ہیں اور محفوظ فضائی فوج کا تخمینہ ۱۴ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ اس کے علاوہ اسرائیل کے پاس ۲۷۰ فوجی لڑاکا طیارے ہیں۔ اس کے ساتھ زمین سے فضا میں مار کرنے والے میزائیل لانچر بھی ہیں۔

یہ تفاصیل پڑھ کر شمامہ کے ذہن میں کئی سوالات ابھرتے رہے اور ان سوالوں کی اوٹ میں اس کا تاریک ماضی گم ہوگیا۔ اس نے رملہ، نابلس اور حسنین کی ان طالبات کے لئے خلوص سے دعا کی جنہوں نے اسرائیلی ظلم و ستم کے خلاف ہڑتال کر رکھی تھی۔ اور جلوس نکال کر الفتح کی حمایت میں نعرے لگائے تھے۔ ان مظاہرین نے الخلیل میں مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر اسرائیلی قبضہ کی مذمت کی۔

اس نے تازہ اخبار دیکھا۔ اسرائیل مصر پر حملے کر رہا ہے اور اب باری مصر کی تھی کہ اسرائیلی طیارے آتے تھے اور گرا لئے جاتے تھے۔ ان حملوں کی کوئی جنگی حیثیت نہیں تھی۔ یوں ہی جب اسرائیل چاہتا پروازیں کی جاتیں اور بلا کسی الٹی میٹم کے حملہ کر دیا جاتا۔

ادھر تل ابیب کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر بموں کے خوفناک دھماکوں سے ہوائی اڈہ کا بڑا ٹرمینل تباہ ہوگیا۔ کنٹرول ٹاور بے کار ہوگیا اور ہوائی اڈے سے مواصلات کا تمام سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ہوائی اڈے کو ہر قسم کی پروازوں

کے لئے بند کر دیا گیا۔ ہوائی اڈے کی عمارت کو آگ لگی ہوئی تھی۔ خوفناک دھماکوں سے مسافروں اور عملے کے سینکڑوں افراد ہلاک و زخمی ہوئے۔ کنٹرول ٹاور میں پھنسے ہوئے لوگوں کو نکالنے کے لئے فضائیہ کے ہیلی کوپٹروں کی امداد طلب کی گئی۔

ٹرمینل کے قریب رن وے کو بھی نقصان پہنچا۔ ٹرمینل کے قریب کھڑے طیاروں کو دور ہٹا دیا گیا۔ دھماکوں سے پورا ہوائی اڈہ لرز اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی بڑے ٹرمینل کے کئی حصے اڑ گئے۔ دھماکوں سے ہوائی اڈے پر کام کرنے والے ورکروں، عملہ اور مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ہوائی اڈے پر اس قدر دھواں تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ کنٹرول ٹاور میں پھنسنے والے لوگوں اور زخمیوں کی چیخ و پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ مواصلات کا سلسلہ تباہ ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے امداد کرنا دشوار تھا۔ بعد ازاں وائرلیس کے ذریعے فضائیہ کے ہیلی کاپٹروں کی امداد طلب کر لی گئی۔ ہیلی کوپٹروں نے کنٹرول ٹاور اور ٹرمینل کے دوسرے حصوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کو نکالا اور فضائیہ کے عملے نے ٹرمینل کے قریب کھڑے جہازوں کو بڑی مشکل سے محفوظ جگہ پر پہنچایا۔ اس حادثے میں متعدد افراد زخمی ہو گئے۔ تل ابیب کے ہوائی اڈے کی تباہی کے بعد ایتھنز میں فوراً اطلاع دی گئی اور اسرائیلی حکام سے کہا گیا کہ ہوائی اڈہ بند کر دیا گیا ہے اور کوئی جہاز تل ابیب نہ بھیجا جائے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایسی کئی خبریں وہ ہر روز ہی پڑھا کرتی تھی۔ لیکن آج اس کے ذہن میں

جو نئے افق طلوع ہوئے تھے ان کا انداز جداگانہ تھا۔ آج ان خبروں سے اس کا رواں رواں مسرتوں سے جھوم اٹھا۔

اس نے اس لڑکی کی تصویر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا اور پھر رسالہ اٹھا کر اسے چوم لیا۔ جو عراق کی رہنے والی تھی اور جس نے الفتح کے مجاہدوں کی مدد کے لئے اپنے گھٹاؤں جیسے کالے، لمبے، ملائم اور چمکیلے بال نیلام کے لئے پیش کئے تھے اور عراق کے صدر البکر اس سے ہاتھ ملا رہے تھے۔

اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تیرنے لگے۔ سب کچھ دھندلا ہو گیا لیکن اب ان دھندلاہٹوں میں وہ تلخ درد نہیں تھا۔ جو بحیرۂ روم کی لہروں پر ہچکولے کھا رہا تھا۔

سارہ کئی بار احمد سے کہہ چکی تھی کہ اسے کچھ عرصہ کے لئے اردن بھیج دیا جائے۔ تاکہ وہ اپنے بچے کی شہریت وہی رکھ سکے جو ان کے عزائم کا ایک حصہ ہے۔ وہی یروشلم میں آباد ہونے کے عزائم۔

احمد ہوں ہاں سے ٹال رہا تھا۔ لیکن اب مزید ٹالنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ طلحہ اور مجتبےٰ حامد نے ان دونوں کو بلایا تھا۔ وہ حسن مجتبےٰ کی شادی کر رہے تھے۔ کس سے؟ یہ ان دونوں کو علم نہیں تھا۔ وہ دیر تک سوچتے رہے لیکن ان کے پلے کچھ نہ پڑا۔

سارہ کو تو یہ دھڑکا تھا کہ کہیں طلحہ امتہ الحبیب کا نکاح حسن سے نہ کر دے اعرابی کے اچانک لاپتہ ہو جانے سے وہ اپنا منصوبہ تکمیل تک نہ پہنچا سکی تھی۔ لیکن آتی دفعہ وہ امتہ الحبیب اور ربیکا کو طلحہ کے سپرد کر آئی تھی۔ وہ سوچتی کہ کہیں طلحہ نے یہ فیصلہ نہ کر لیا ہو کہ امتہ الحبیب اس کے گھر ہی آ جائے۔——

امتہ الحبیب بڑی خاموش لڑکی تھی۔ وہ اتنی جرأت ہی نہیں رکھتی تھی کہ طلحہ کی بات یا کسی اور کی بات ٹال دے لیکن اگر ایسا ہو جاتا تو شاید اس کے رخساروں کی شفق تاریک ہو جاتی اور اس کے خیالوں کے گھروندے ٹوٹ پھوٹ جاتے۔ ان میں تو اعرانی بس رہا تھا۔

اسے عمان پہنچنے کی بے حد جلدی تھی۔

بذریعہ طیارہ دونوں میاں بیوی عمان پہنچے۔ سارہ کی طبیعت کسل مند تھی لیکن جوں ہی اس نے ابو الاسرار اور اعرانی کو دیکھا تو اس کی تھکن دور ہو گئی۔ اسے ہر طرف ایک کیف کا سماں نظر آیا۔ ان سے مل کر وہ دونوں طلحہ کے گھر گئے۔ جہاں بھتیجے حامد انہیں بے حد تپاک سے ملے۔ احمد کے بھانجوں کی تو بس عید ہو گئی۔

حسن نے اپنے بازو بڑی بے تکلفی سے اپنی ممانی کے گلے میں ڈال دیئے اور کہا۔

"ہم تو اداس ہو گئے۔"

"اور اسی اداسی میں شادی کرنے کی ٹھان لی۔"

حسن مسکرایا۔

"مگر وہ کون ہے؟" سارہ نے پوچھا۔

"آپ الشورہ کے دفتر سے ہو کر نہیں آئیں۔"

"وہیں سے آ رہی ہوں۔ لیکن میں نے وہاں لمبی چوڑی بات چیت نہیں کی۔ ادھر ہی چلی آئی ہوں۔ تاکہ سب کچھ طلحہ باجی سے سنوں۔"

"تو پھر سن لیجیے۔ انہیں سے۔"

"نہیں تم ہی بتا دو۔"

"آپ نے وہاں دفتر میں۔ میرا مطلب ہے اپنے سابقہ مکان میں کس کس کو دیکھا؟"

"صرف اعرابی اور البوالا سرار کو۔"

"خواتین نہیں ملیں؟"

"نہیں۔ وہ ربیکا کے ہاں تھیں۔ اور میں ابھی ادھر جانا نہیں چاہتی تھی۔"

"تو اچھا، ہم آپ کو اس کا فوٹو دکھاتے ہیں۔"

حسن اٹھا اور اپنے کمرہ سے بیروت کا ایک پرانا اخبار اٹھا لایا۔ جس میں ذکیہ اور شمامہ کی تصاویر تھیں۔

حسن نے شمامہ کی تصویر کی جانب انگلی بڑھائی تو وہ سمجھ گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ حسن کو اپنی ممانی کا یوں سر ہلانا بے حد پسند آیا۔ اس کے ارادوں کی تکمیل ہونے میں کوئی امر مانع نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے ماں باپ احمد کی نسبت سارہ کی رائے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔

چائے پیتے ہوئے طلحہ نے اپنا سارا پروگرام سارہ کو سنایا۔ سارہ نے کہا۔

"لیکن باجی۔ شمامہ ابھی تک عیسائی ہے۔"

"اری چھوڑ — بیوی کا مذہب خاوند کا مذہب ہوتا ہے — وہ تو جو اسے کہا جائے گا کرے گی — لیکن اس کے باپ کی رضامندی میں ابھی تک حاصل نہیں کر سکی۔"

"وہ ہے کہاں نہ؟" احمد نے پوچھا۔

"وہ بھی یہیں ہے؟" مجتبٰے حامد نے کہا۔

"تو پھر کیا ہے۔ اس سے بات کر لیں گے؟" احمد نے کہا۔

"نہیں۔ اس سے باقاعدہ درخواست کرنی چاہیئے۔ اس طرح تو یوں سمجھے گا جیسے ہم اس کی بیٹی ہتھیا رہے ہیں؟" سارہ نے تجویز پیش کی۔

"بالکل میں بھی یہی خیال کرتی ہوں۔ ہمیں داؤد سے اس موضوع پر بات کرنی چاہیئے؟"

اسی شام رمیکا کے مکان پہ سب لوگ اکٹھے ہوئے۔ ابوالاسرار نے جملہ حالات سنائے۔ رمیکا نے شمامہ کی ذہنی الجھنوں پہ سیر حاصل تبصرہ کیا وہاب اب پھر صحت یاب ہو رہا تھا۔ وہ موجود ضرور تھا لیکن ان کی گفتگو میں کم حصہ لے رہا تھا۔ پھر بھی مناسب مواقع پر ہلا کر باتوں کی تائید یا نفی کرتا رہا۔ ذکیہ اس کے قریب ہی بیٹھی تھی اور بار بار اس کے ہاتھوں کو دبا رہی تھی۔ اعرافی بھی خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے متعلق ابھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ جب داؤد نے شمامہ کی حسن مجتبٰے سے شادی کی بخوشی منظوری دے دی۔ تو سارہ نے اعرافی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم خاموش کیوں ہو، جب حسن کی شادی ہوگی تو تمہاری پہلے ہوگی؟"

"میں اس خیال سے خاموش تھوڑا ہوں؟"

"تو اور کیا بات ہے؟"

"بات ہی کوئی نہیں؟ ہم اسرائیل سے اپنی باجی کی خاطر سب کچھ چھوڑ کر یہاں آئے اور باجی اب قاہرہ چلی گئی ہے؟"

"قاہرہ میں میرا جانا اتنا ضروری نہیں تھا جتنا احمد صاحب کا تھا۔ سلمان غنی کی بے وقت شہادت نے حالات کو الٹ پلٹ دیا۔ اور تم جانو مسلمان عورت شوہر کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔ آگے یا قدم ملا کر نہیں۔"

اعرافی نے پوچھا۔

"ٹھیک ہے باجی ۔ لیکن یہ تو بتائیے ۔ قاہرہ فراعنہ کی سرزمین ہے۔ وہاں کی موجودہ حکومت سے آپ کو اصولی اختلافات ہیں۔ آپ کا ذہن خلافِ مذاق حالات دیکھ کر کڑھتا رہتا ہوگا۔"

سارہ نے اعرافی کو سمجھایا۔

"یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ لیکن ہم وہاں مقاصد کے تحت ہیں۔ ان عظیم مقاصد کے تحت جن کی جڑیں پون صدی پیشتر کے فلسطین میں گڑی ہیں۔ ہم جہاں کہیں بھی ہیں فلسطینی ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں لیکن آپ کی شفقت سے محروم ہو کر کچھ عجیب سا لگے گا۔"

"جذباتی نہ بنو۔ حبیبہ کی رفاقت میں تم نئی زندگی کا آغاز کرو گے اور پھر بہنوں کے دلوں سے بھائی کبھی دور نہیں ہوتے۔"

اعرافی خاموش ہو گیا۔

اس بات کا فیصلہ کر لیا گیا کہ اسی شام سادہ سی تقریبات میں حسن مجتبیٰ اور شمامہ، اعرافی اور حبیبہ کی شادی کر دی جائے۔

تیسرے پہر مجتبیٰ حامد نے مفراق کے مرکز میں یاسر عرفات سے رابطہ

قائم کیا اور یاسر عرفات نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اپنا پیغام دیا۔ جسے نکاح کی تقریب کے بعد مجتبیٰ حامد نے پڑھ کر سنایا۔

"ساتھیو! دوستو!!

ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں۔ وہ ہم سب پر عیاں ہے ___ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہم قبیلہ قبیلہ اکٹھے ہوتے جائیں گے۔ کلمہ پڑھنے کے بعد کسی رنگ ونسل کا فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ مجھے خوشی ہے کہ اعرافی اور شمامہ اب ہماری صفوں میں آگئے ہیں ___

ہم سب مسلمان ہیں ___ عرب ہیں ___ فلسطینی ہیں۔ اور فلسطین کی آزادی کی ایک راہ ہے جو موت کی ٹھنڈی اور گہری وادیوں سے گزرتی ہے۔

ہم انشاء اللہ نئی زندگی کی ابتلاء کرتے ہوئے اپنے پرانے عہد کو نہیں بھولیں گے۔"

جب مجتبیٰ حامد پیغام پڑھ چکے تو عبدی نے اپنی مٹھی فضا میں اچھالتے ہوئے کہا۔

"سامراج ___ مردہ باد!! فلسطین زندہ باد"

یہ وہ نعرے تھے جو تمام عرب عوام لگا رہے تھے۔ سکول میں اسی روز اس نے اپنے مدرس سے دمشق میں ہونے والی عوامی فوج کے بیس ہزار جوانوں کی پریڈ کی تفصیل سنی تھی۔

اسرائیل کے متوقع حملے کے پیشِ نظر جمعہ کے روز عوامی فوج نے چار گھنٹے پریڈ کی تھی۔ وہ دمشق کی گلیوں میں گشت کرتے رہے۔ اس پریڈ کی قیادت شام کے وزیر اعظم مسٹر یوسف زعین نے اور عوامی فوج کے کمانڈر باع الناویل نے کی۔

مزراح کے کھیل کے میدان میں اس فوج نے جلسہ بھی کیا اور مختلف لیڈروں نے کہا کہ عرب عوام نے سامراج اور صیہونیت کے خلاف مسلح جدوجہد کو بنیادی اصول کی خاطر اختیار کیا ہے۔ عوامی جنگ ایک انقلابی جنگ کی حیثیت رکھتی ہے اور تمام منظم عرب عوام کو اس میں حصہ لینا چاہیئے جو بڑے بڑے کتبے انہوں نے اٹھا رکھے تھے ان پر لکھا تھا۔

سامراج مردہ باد۔
فلسطین کے سوال پر کوئی مصالحت نہیں کی جائے گی۔
مسلح جدوجہد فتح کے لئے ہمارا واحد راستہ ہے۔
یارنگ کی سرگرمیوں کے باوجود، ہم کوئی رعایت نہیں کریں گے۔

اس کے علاوہ قاہرہ میں ہونے والی افریشیائی کانفرنس نے اسرائیل کو امن کے لئے خطرہ قرار دیا۔

عرب ممالک کے دکلاء کی تنظیم نے تمام عرب ملکوں سے اپیل کی کہ اسرائیل کی بڑھتی ہوئی جنگی تیاریوں کو نظر انداز نہ کیا جائے اور عام لام بندی کی جائے۔

جب وہ سب علیحدہ علیحدہ ہونے لگے تو ٹیلیفون کی گھنٹی بجی ــــ

ذکیہ نے ٹیلیفون اٹھایا۔ الصلت سے ذوالقرنین بول رہا تھا۔
بات چیت ختم ہوئی تو ذکیہ نے بتایا کہ ذوالقرنین تھا اس نے پوچھا تھا۔

"دہاب کیا کر رہا ہے؟"

"نئے شادی شدہ جوڑوں کو دیکھ رہا ہے۔" میں نے جواب دیا

سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔

"اس نے ایک خبر تحفے کے طور پر دی ہے۔"

سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

ذکیہ نے سنایا۔

"اسرائیلی اخبار ہارتز آج ہاتھ لگا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ عرب چھاپہ ماروں کے جس دستے نے گزشتہ ہفتہ تل ابیب کے بسوں کے اڈہ پر تین بم رکھے تھے وہ جیرون کے رہنے والے عبدالرحیم جابر اور ان کے بھائی منیر تھے اور وہ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر فرار ہو گئے ہیں۔"

عبدی نے ایک بار پھر ہاتھ ہوا میں اچھالا اور کہا۔

"الفتح زندہ باد۔"

مجتبیٰ حامد اور طلحہ اپنی بہو کو اپنے گھر لے گئے۔ اعرافی اور امۃ الحبیب عبدی کے پیچھے پیچھے چلتے اسی کے گھر آ گئے۔ احمد، ابوالاسرار اور رمیکا ان کو گھر تک چھوڑنے آئے۔ سارہ سازئی طبع کے باعث ذکیہ کی مہمان ہی رہی۔

تھوڑی دیر بعد احمد واپس اس کے پاس پہنچ گیا۔

اسی رات اسرائیل نے اردن اور عرب جمہوریہ پر حملہ کر دیا۔ سابقہ حملوں کی طرح یہ حملہ بھی اچانک تھا۔ ریڈیو نے معمول کے پروگرام روک کر بتایا کہ اسرائیلی فوجوں نے شہر سویز پر گولہ باری شروع کر دی ہے۔ اور شہر کی گنجان ترین آبادی العزبین پر خاص طور پر گولہ باری کی ہے۔ اسرائیلی توپ خانے نے دوسرے شہری علاقوں کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ پورٹ توفیق سے لے کر قنطارہ تک ساٹھ میل لمبے محاذ پر گولہ باری ہو رہی ہے۔ وادیٔ اردن میں ایک گاؤں مانشیاہ کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

ان جارحیتوں کا انجام کیا ہوگا۔ اس ظلم و ستم کی رو کو کب بند لگے گا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔

سیکریٹری جنرل اقوامِ متحدہ مسٹر اوتھانٹ کو عیسائی رہنماؤں نے ایک یادداشت پیش کی۔ اسرائیل نے بیت المقدس کے قرب وجوار میں جوئے خانے، عریاں رقص کے شبینہ کلب اور دیگر فحش تفریح گاہیں قائم کر دی ہیں۔ اسی قسم کی ایک عرضداشت عرب عوام نے بھی کی تھی۔ جس میں کہا گیا تھا کہ بیت المقدس کی قدیم روحانی اور مذہبی قدریں قصۂ پارینہ بنتی جا رہی ہیں۔ عصمت فروشی کا بازار گرم ہے۔ شراب، چرس اور دیگر نشہ آور ادویہ کھلے بندوں فروخت ہو رہی ہیں۔ ترکی، برطانیہ اور اردن نے مختلف ادوار میں بیت المقدس پر حکومت کرنے کے باوجود اس کے مذہبی تقدس کو برقرار رکھا تھا اور اب تو وہ دور تھا کہ ہیکلِ سلیمانی

بھی عیاشی کے نئے نئے انداز دیکھ کر سر اوندھے پڑا تھا۔

یہ عریانیت کا سیلاب کب تھمے گا؟

مادہ پرست دنیا میں انسان انسان کا گلا گھونٹنا کب بند کرے گا؟

نفرت پر مبنی سرد جنگ کب ختم ہوگی؟

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

ویٹ نام کی دل دلوں میں افریقہ کے جنگلوں میں، امریکہ کے مغربی محاذ پر پھیلی ہوئی بے آب و گیاہ چٹانوں میں، آسام کی جھاڑیوں میں، اور فلسطین کے ریگ زاروں میں قوموں کے مستقبل کھو گئے تھے۔ وتکانگ، حبشی، امریکی کالے اور الفتح کے فدائی اس مستقبل کو تلاش کر رہے تھے۔ سچی لگن سے ـــ سچی محبت سے ـــ انہیں یقین تھا کہ وہ اسے ضرور تلاش کر لیں گے۔ خواہ ان کی راہ میں مشکلوں کے جال بچھائے جاتے۔

ہر مقام پر اور ہر وقت اسرائیلی حکام اپنے فوجیوں کو ایک جنگجو نسل بنانے میں کوشاں تھے۔

موشے دایان اپنی آنکھ ڈھانپے اسرائیل کے قومی تہوار پر عوام کو ریڈیو پر بتا رہا تھا۔

"عرب فدائی ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ انہیں دنیا بھر کے مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ اب ان کے پاس ہتھیاروں کی کمی نہیں رہی۔ مقبوضہ علاقے چھوڑ کر وہ اب اسرائیل کی بین الاقوامی طور پر قائم کردہ سرحدوں کے اندر بھی گھس کر حملے کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے لئے ایک چیلنج ہے۔ ہم نے

بطور ایک قوم کے زندہ رہنا ہے ۔ اور اس زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اسرائیل کو زندہ رکھنا ضروری ہے۔ عرب ممالک کے سربراہ اب اس امر کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ اسرائیل ایک زندہ حقیقت ہے اور اسے یکسر مٹا دینا ناممکن ہے۔ ہمیں اپنے دوستوں پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔ مفتی اعظم فلسطین اور عرب چھاپہ ماروں کی کسی بات پر ہمارے نوجوانوں کو توجہ نہیں دینی چاہیئے۔ ہم مستقبل قریب میں عرب ممالک پر ایک ایسی کاری ضرب لگائیں گے کہ وہ ہمارے ساتھ ایسا سمجھوتہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جس سے ہماری سرحدیں ــــــ اسرائیل کی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی۔"

تحسین و آفریں کے نعروں میں موشے دایان کے بعد وزیر اعظم ایشکول نے بھی صیہونی عزائم پر تقریر کی اور ان پر صاد کرنے کے لئے صدر مملکت نے چند جملے کہے۔

اعرابی نے ریڈیو بند کر دیا۔

صوت العرب سننے لگا۔ اس پر اسلامی کانفرنس کی تفاصیل بتائی جا رہی تھیں۔ جو عمان میں ہو رہی تھی۔ ایسی کانفرنس اگر حالات دگرگوں نہ ہوتے تو یروشلم میں منعقد ہوتی لیکن اب یہ عمان میں منعقد ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں مفتی اعظم فلسطین الحاج امین الحسینی شرکت کر رہے تھے اور وہ عمان پہنچ چکے تھے۔

اگلے چند دن مجتبیٰ، حامد، احمد، اور ابو الاسرار کانفرنس کے انتظامات

میں لگے رہے۔ متعدد اسلامی ملکوں کے نمائندوں نے شرکت کی۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ میں اسرائیل کے پیدا کردہ بحران پر اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ الفتح کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے تمام اسلامی ممالک کو بالعموم اور عرب ممالک کو بالخصوص توجہ دینی چاہیئے۔ اور ایسے بیانات کی تردید کرنی چاہیئے جو سربراہان مملکت کے ناموں سے صیہونی محض پروپیگنڈہ کی خاطر چھپواتے ہیں۔ مثال کے طور پر شاہ حسین سے منسوب اس بیان کو پیش کیا گیا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ اردن کو ایک چھپا منٹری ریاست نہیں بننے دیں گے۔ ظاہر ہے کہ کوئی فرمانروا بھی اپنی مملکت کو ایسا نہیں بننے دے گا۔ لیکن اگر اشارہ الفتح کی طرف ہو تو مجاہدین دل برداشتہ ہو سکتے ہیں۔

مفتیٔ اعظم نے اس موقع پر کہا۔

فلسطین کا معاملہ خالصتاً عربوں کے لئے ہو تو ہو لیکن بیت المقدس کا مسئلہ تمام مسلم ممالک کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے اور ہم سب کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے، ایک ہی رسول کی امت ہونے کی حیثیت سے اور ایک ہی نظام یعنی اسلام سے وابستہ ہونے کی صورت میں باہم مل کر اپنے قبلہ اول کی نگہبانی کرنی چاہیئے۔ جب ہم مسلمان ہیں اور اخوت کے باہم رشتہ میں منسلک ہیں تو فلسطین کے مہاجر بھی ہمارے بھائی ہیں اور ان کو ان کے گھروں میں واپس بھیجنے کے لئے ہمیں الفتح کی بھرپور مدد کرنی چاہیئے۔

مندوبین کے علاوہ مفتیٔ اعظم نے بھی اگلے مورچوں کا معائنہ کیا۔

جنگ بندی لائن کے بعض علاقے دیکھے جو ۱۹۶۷ء کی جنگ کے بعد اسرائیل کے قبضہ میں چلے گئے تھے۔ نمائندوں نے فوجی صورت حال کا جائزہ لیا اور اردن کے محاذ کو بھی باہم سمجھوتہ کے تحت مضبوط کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔

کانفرنس ختم ہو چکی تھی۔ مجتبیٰ حامد نے مفتی اعظم سے اپنے گھر آنے کا وعدہ لے رکھا تھا۔ وہ خود اور طلحہ ان کو لینے گئے تھے۔ اور اوپر کی منزل پر مکمل سناٹا تھا۔ احمد ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تھا اور ابوالاسرار اسے مسلسل گھورے جا رہا تھا۔ اچانک ریمیکا نیچے آئی۔ اس کے رخسار تمتما رہے تھے۔ احمد نے دیکھا کہ ریمیکا ابوالاسرار کے کان میں کچھ کہہ رہی ہے۔ آخر اس نے اعرافی کو کہا۔

"تھے کے ماموں۔ ریڈیو پر کوئی طربیہ نغمہ بجنے دو۔"

اعرافی نے ریڈیو کھول دیا۔ سب کے چہروں پر رونق پھیل گئی۔ تھے کی روں روں اوپر والی منزل سے نیچے تک سنائی دینے لگی۔

ایک گھنٹے بعد مفتی اعظم پہنچ گئے۔

شمامہ نے سب کی تواضع کے لئے کھجور اور دوسرے پھل پیش کئے۔ مفتی اعظم نے کھجور اٹھا کر منہ کی طرف بڑھایا تو ایک بار پھر دور دریائے اردن کے کنارے توپیں گرجنے لگیں۔ انہوں نے ہاتھ روک لیا اور صورت حال سے متعلق باتیں کرنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد طلحہ اپنے ننھے بھتیجے کو کپڑوں میں لپیٹتے ہوئے آہستہ

آہستہ سیڑھیاں اترتی نظر آئی۔ سب اشتیاق سے اس طرف دیکھنے لگے۔ لیکن طلحہ نے دور ہی سے کہہ دیا۔

"ننھا پہلے مفتی اعظم کو منہ دکھلائے گا۔"

مفتی اعظم اپنی جگہ سے اٹھے۔ احمد نے کہا۔

"آپ تشریف رکھیئے حضرت۔"

مفتی اعظم مسکرائے اور کہنے لگے۔

"یہ ہمارا ننھا مجاہد ہے۔ اس کی آمد سے الفتح کی عسکری طاقت میں اضافہ ہوا ہے۔ میں اسے خوش آمدید کہنے کے لئے کھڑا ہونا ہی پسند کروں گا۔"

ہاتھ بڑھا کر مفتی اعظم نے اس کے چہرہ سے کپڑا ہٹایا تو وہ آنکھیں موندے سو رہا تھا۔ مفتی اعظم تخت پوش پر بیٹھ گئے اور طلحہ نے ننھے کو ان کی گود میں ڈال دیا۔ وہ اس کے کانوں میں اذان کہنے لگیں۔

توپیں پھر گرجنے لگیں۔ ان کی یہ گرج سارے عرب ممالک میں سنی جا رہی تھی کیونکہ موشے دایان کے اگلے مورچوں پر پہنچنے کے ساتھ گزشتہ چند روز سے ہونے والی شدید جھڑپوں کا ایک باقاعدہ جنگ میں بدل جانا ضروری ہو گیا تھا۔ سویز نہر کے کنارے لاکھوں فوجی جمع ہو چکے تھے اور دشمن کی سپلائی لائن کاٹنے کے لئے حریت پسند اسرائیل میں داخل ہو چکے تھے۔ سراسیمگی کی لہر اسرائیل کے طول و عرض میں ایک نئے سرے سے اور نئے انداز سے پھیل چکی تھی۔

ننھا رونے لگا۔

مفتی اعظم نے کہا۔ "دیکھ میرے بیٹے! اپنے ان بزرگوں کے لئے، جو

کل سے مختلف محاذوں پر چلے جائیں گے مت رونا۔ ہاں اگر فلسطین کی حالت زار کے لئے تیری آنکھوں سے چند آنسو ٹپکیں گے تو میری یہ دو بچیاں ان کو اپنے دامن میں چھپا لیں گی۔" انہوں نے طلحہ اور رمیکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جا تو اب اپنی عظیم اور مجاہدہ ماں کے سینہ سے چمٹ کر سو جا۔ تو بہت دیر سے تجھے تھپکیاں دے رہی ہیں۔"

مفتی اعظم نے سب پر نظر ڈالی اور مجتبٰے حامد سے کہا۔

"اگرچہ میں نے محاذ دیکھا ہے لیکن مجھے نقشہ پہ وہ مقامات سمجھاؤ جہاں الفتح عنقریب کاری ضرب لگانے والی ہے۔"

ختم شد